مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

ستمبر 2012

توہین عدالت کا نیا قانون کالعدم

عدلیہ اور حکومت کی محاذ آرائی کیا رنگ لائے گی؟

PDFBOOKSFREE.PK

SWISS BANK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

ان سے کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔ کہو، اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سَوَاءُ السَّبِیل" سے بھٹک گئے۔

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بُرا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے یقیناً بہت بُرا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لیے کی ہے، اللہ ان پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے۔ مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

(آیات ۷۶ تا ۸۱) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دو مہینے ایسے ہیں کہ کم نہیں ہوتے دونوں مہینے عید کے ہیں (۱) رمضان اور (۲) ذی الحجہ۔

نوٹ: اسلاف سے اس کے دو مشہور مفہوم ہیں (۱) اگر ایک انتیس کا ہوگا تو دوسرا تیس کا یا دونوں تیس کے ہوں گے۔ دونوں انتیس کے نہیں ہوں گے۔ (۲) ثواب کے اعتبار سے ان میں کمی نہیں ہوگی۔ تعداد کے اعتبار سے کمی ہو سکتی ہے یعنی انتیس کے ہو سکتے ہیں۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس شمارے میں

2	القرآن	تفہیم القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے!
14	دستک	کامران امجد خان	دہشت گردی کی نئی لہر!
31	موج محیط آب میں	بانو قدسیہ	نرم و نازک، معصوم خواب کو دھڑکنوں میں بسا لینے والی لڑکی جان دے دیتی ہے مگر خواب کو ٹوٹتے پھوٹتے نہیں دیکھ سکتی!
43	سوال	ناجیہ ملک	ایک اجڑی بستی کے سفر کا احوال جو کبھی جنت نظیر کہلاتی تھی!
46	لوگ کیا کہیں گے؟	زاہدہ یوسفی	ایک باہمت خاندان کی کہانی جس نے عزم و حوصلے سے "طوفان" کا رخ موڑ دیا!
49	خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں	قلندر حسین سید	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
69	جوزف سٹالن	مائیکل ہارٹ	جدید دور کے سفاک ترین آمر کی داستان..... اس نے اپنی زندگی میں لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا!
74	بڑا اندھیرا ہے	ہارون اشرف	ضمیر کو جھنجھوڑتی علامتی تحریر جو ہمارے حالات کی ترجمان ہے!
85	گلگت کے شکاری	شمس الحسن فاروقی	بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان پیش آئے شکار کے حیرت انگیز واقعات!
97	چھٹی	نواز خان	ایک معصوم طالبہ کی لرزہ خیز داستان جو بدقسمتی سے چھٹی کے بعد اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی!
122	چنگاری اور شعلے	ظہور احمد اظہر	تقسیم ہند کے دنوں کی کہانی جب ہر طرف آگ اور شعلے پھیلے ہوئے تھے!
132	انوکھی مسرت کے لمحے	قیوم راہی	ایک شخص کا فسانہ، کسی کے میٹھے بول نے اسکی سوچ کا رُخ بدل دیا!
140	افسرِ اعلیٰ	عرفان جاوید	ایک افسر خاص کی کہانی جو خوشامد کو سچائی تصور کرتا تھا!
151	جدائی قسمت کردی	جاوید راہی	ایک منحنی پری کا المیہ، ہر کوئی اس کا گرویدہ تھا مگر.....!
163	بزم شاعری	ادارہ	باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
169	سیارہ کچن کارنر	جویریہ کامران	عیدالفطر اور گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بچوں کے لنچ بکس اور دیگر افراد خانہ کیلئے ذائقے دار اور منفرد ڈشز کی تراکیب!
173	ایک فیصد	ایس امتیاز احمد	ایک بہروپیے کا ڈرامہ جس میں ناکامی کا صرف ایک فیصد امکان تھا!
185	سیارہ مشورہ کلینک	ڈاکٹر ندیم	ڈاکٹر صاحب آپ کے طبی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا حل تجویز کرتے ہیں!
193	نقشِ فریادی	شمس باز غ شیروانی	مشاہدہ و ریاضت میں لپٹی باتیں جن میں سوچنے والوں کیلئے بہت کچھ ہے!
198	نوطی دیوی		قدیم مصر کی تاریخ سے کشید کردہ حیرت انگیز داستان
137	مصالحہ میں جوانی	حکیم محمد عثمان	یہ بڑھتی عمر کے اثرات کم کرنے کا مؤثر طریقہ ہے
81	دبئی ڈیزرٹ سفاری	عارف محمود اپل	ہر خاص و عام میں مقبول عرب دنیا کی یہ سیر گاہ قدیم و جدید دور کی تمام روایات سمیٹے ہوئے ہے!
147	قیانوس خان	زاہد آصف سلطان	کچرا چننے والا نوجوان..... جو آزاد کشمیر بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر گیا
159	بالوں کے امراض	حکیم راحت نسیم سوہدروی	بالوں سے متعلق مختلف مسائل کے بارے میں دلچسپ اور معلومات تحریر
17	• توہین عدالت کا نیا قانون کالعدم • عدلیہ اور حکومت کی محاذ آرائی کیا رنگ لائے گی؟ • فیصل رضا عابدی کی پریس کانفرنس اور بھونچال		ادارہ

محمد سلیم اختر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینئر لکھاریوں کا شکریہ

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔

سیارہ ڈائجسٹ اس دور ابتلا میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے اور ہمارے غفلت میں ڈوبے ہوئے حکمرانوں کو جگانے کی اپنی سی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ کاش وطن پاک کے حکمران کچھ ہوش کے ناخن لیں۔ میں اظہار خیال کی اس محفل کی وساطت سے سیارہ ڈائجسٹ کے تمام لکھنے والوں کو بہت مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں جو انتہائی معیاری تحریریں ہمیں مہیا کرتے ہیں۔ بالخصوص جناب قلندر حسین سید اور پروفیسر ظریف خان کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کی تحریروں سے قاری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ ماہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریر بھی بے حد لاجواب تھی۔ ان تینوں سینئر لکھاریوں کی تحریروں سے سیارہ ڈائجسٹ کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اظہار خیال کی اس محفل سے پتہ چلا کہ پروفیسر ظریف صاحب اب روبہ صحت ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد مکمل صحت یابی عطا فرمائے (آمین)۔ آخر میں، میں کامران امجد خان کی دستک کا ذکر کرنا چاہوں گا، ان کی تحریر حقیقتاً دلوں پر دستک ہوتی ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ اس نوجوان کے دل میں ایک وطن پرست اور محب وطن پاکستانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

(قاضی محمد یوسف، مسقط)

☆☆☆

باقاعدگی سے لکھنا چاہتا ہوں

جناب کامران امجد خان صاحب! سلام ممنون۔

روزانہ سینکڑوں یا شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں خط موصول ہوتے ہوں گے، خطوں کی خواب دہی کم، ایک رائٹر ہونے کی حیثیت سے ایک کہانی کی تکمیل اور نئی کہانی کی کھوج آپ کو زیادہ مصروف رکھتی ہوگی۔

پہلا خط ''اس ماہ کا شاعر'' کے حوالے سے تھا جو اب تک آپ پا چکے ہوں گے۔ اس دوسرے خط میں غزل خالصتاً آپ کے لیے ہے۔ میں ہر ماہ ہی اپنا کلام بھیجنا چاہتا ہوں مگر یہ اظہار خیال میں ہی آپ بتا سکتے ہیں کہ کیا یہ آپ کے معیار کے عین مطابق ہے، کیا کہیں ڈائجسٹ میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟ اظہار خیال میں ایک خیال میری غزلوں اور ردی کی ٹوکری میں فاصلے پر بھی کر دیجئے تاکہ پھر ہر ماہ بھیجنے کا وعدہ اٹھا سکوں۔ امید واثق ہے کہ میرے انتظار کو جان لیوا نہیں بنائیں گے اور پہلی فرصت میں میرا حوصلہ بڑھائیں گے۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

(نعمان اسحاق، دائرہ دین پناہ)

☆.....نعمان صاحب آپ اپنی تحریریں ارسال کیجئے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کریں تاہم گزارش ہے کہ آپ اپنی شاعری کی اصلاح خود کروالیا کریں۔!

☆☆☆

پہلی کاوش

محترم مدیران! السلام علیکم۔

خدا پاک سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ سب کو

اپنی امان میں رکھے۔ 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے کے بعد اردو ڈائجسٹ والوں کے بے تحاشا اصرار پر لکھنے کا آغاز کیا۔ زلزلے کے حوالے سے وہاں کہانی، مضامین شائع بھی ہوئے۔

چند دن بیشتر کتابوں کی صفائی کرتے ہوئے سیارہ ڈائجسٹ کا ایک شمارہ ملا۔ بے حد اچھا لگا تو سوچا اس کے لیے بھی کچھ لکھا جائے۔ اپنی اس کاوش کو ارسال کرتے ہوئے منتظر رہوں گی کہ آپ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں گے اور راہنمائی بھی کریں گے۔

اگر میرا افسانچہ قابل اشاعت نہیں تو اپنے شمارے کے سلسلے ''اظہار خیال'' کے ذریعے مطلع کریں۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں بھی اطلاع دیں کہ میرا افسانچہ کب تک شائع ہو سکے گا۔ اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ اسی کے ساتھ اجازت۔

(ناجیہ ملک، آزاد کشمیر)

☆آپ کی تحریر اس ماہ شامل اشاعت ہے۔

☆☆☆

لاقانونیت کا راج

مجی جناب کامران امجد خاں صاحب، مدیر منتظم ''سیارہ ڈائجسٹ''! السلام علیکم۔

سیارہ ڈائجسٹ کا اعزازی شمارہ ماہ اگست ملا، اس کے لیے شکریہ۔ صفحہ 13 پر ''مبارک رمضان'' لاہور سے دوسرے شہروں کا فرق میں بہاولپور کا نام نظر نہ آیا۔ کیا یہ سہواً ہوا ہے یا.....

عرض کرتا چلوں کہ تشکیل پاکستان سے قبل بھی (ریاست) بہاولپور کو پاکستان سے الحاق کرنے والی اولین اور بڑی ریاست کا اعزاز حاصل تھا۔ 3 جون 1947ء کو تقسیم کا منصوبہ پیش ہونے کے بعد کانگریسی قیادت کی طرف سے نواب سر صادق محمد خاں عباسی (خامس) کو اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ہر ممکن ترغیب و تحریص کی گئی مگر نواب نے اس کے برعکس 3 اکتوبر 1947ء کو اپنی ریاست کا الحاق مملکت پاکستان سے کیا۔ اس طرح اپنے دو سو بیس سالہ موروثی اقتدار سے دستبردار ہو کر موجودہ پاکستان میں شامل ہو کر اس کے چاروں صوبوں کے درمیان جغرافیائی اور مواصلاتی رابطہ کرنے میں معاونت فراہم کی۔ 14 اگست 1947ء کو قیام پاکستان کی تقریب شایان شان منانے کے لیے نصف درجن اپنی گاڑیاں کراچی روانہ کیں۔ اس موقع پر خود قائداعظم محمد علی جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ریاست بہاولپور کی رولز رائس میں سوار ہو کر آئے۔

قائداعظم کے بعد ہماری نااہل قیادت کی وجہ سے 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا تو اس وقت بھی پی پی پی کی حکومت تھی اور آج بھی پی پی پی کا دور اقتدار ہے۔ ملک میں لوڈشیڈنگ کا راج ہے۔ مہنگائی اور بیروزگاری نے مظلوم عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ لوگ خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ ملک میں لاقانونیت کا راج ہے۔ سرعام ڈکیتیاں ماری جا رہی ہیں، کرپشن ہے، ملک کی اعلیٰ عدالتوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اس حکومت کا ایک جیالا وزیراعظم، وزیراعظم ہاؤس سے اپنے ہاؤس جا چکا ہے۔ ایک نیا وزیراعظم آ چکا ہے لیکن حالات جوں کے توں ہیں۔ آخر کہاں تک لکھوں۔ لکھنے سے حالات سدھر نہ جائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلکہ یہ وقت کا اور اپنا ضیاع ہوگا۔ کسے دہائی دیں آخر کون ہمارا پرسان حال ہے۔ بقول غالب ۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ جگر کو پیٹوں میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(قلندر حسین سیّد، احمد پور شرقیہ)

☆☆☆

سرورق کا رنگ

محترم ایڈیٹر صاحب! سدا خوش رہیں۔ السلام علیکم۔

سیارہ ڈائجسٹ کا اگست کا سرورق ''کلام اللہ کی اعجاز آفرینیاں'' پسند آیا تاہم رنگوں کا انتخاب اتنا اچھا نہیں لگا۔ کالا، نیلا اور سفید..... یہ رنگ سرورق پر استعمال ہوئے حالانکہ اور بھی بڑے خوبصورت اور دلکش رنگ موجود ہیں۔ قرآن حکیم بھی اتنا واضح نہیں تھا۔ سیارہ کیلنڈر اچھا تھا اگر رنگین ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اسلامی تہواروں کے حوالے سے خصوصی تزک و احتمام ہونا چاہیے۔

اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ''بہکاوا'' شوکت افضل صاحبہ کی بہترین کاوشوں میں سے ایک ہے۔ رائٹر صاحبہ کو تاریخ و معاشرت پر مکمل عبور حاصل ہے۔ بہت ہی خوبصورت انداز میں اتنی بڑی حقیقت قارئین کو سمجھا گئیں کہ ذہن عش عش کر اٹھا۔ بہت مبارکباد قبول فرمائیں شوکت افضل صاحبہ اتنی اچھی، دلچسپ اور سبق آموز کہانی لکھنے پر۔

باقی پھول کی موت، ریالوں کی بارش، بلائے جاں اور ذرا سی بات بہترین تحریریں تھیں۔ قلندر حسین سیّد صاحب کا گلدستہ تحریر بہت اچھا لگا۔ ہر پھول کی اپنی مہک تھی۔ آخر میں ہمیشہ کی طرح بے حد شکریہ قبول فرمائیں۔ سیارہ میں جگہ عنایت کرنے پر بہت شکریہ!!

(یاسمین کنول راجپوت)

☆☆☆

دوہری خوشی

محترمی و مکرمی کامران امجد خان صاحب، مدیر منتظم! السلام علیکم۔

اگست کے شمارے میں آپ نے میری تحریر ''زبان کی چاشنی'' کو شائع کیا ہے اور بزمِ شاعری میں میری ایک غزل بھی شامل اشاعت ہے یہ دوہری خوشی آپ نے مجھے عنایت فرمائی ہے جس کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیں..... ساتھ ہی اظہار خیال میں میرے مراسلہ کا وہ حصہ بھی آپ نے شائع کیا ہے جس میں میں نے اپنی تحریروں کو آپ کی پالیسی سے مطابقت رکھنے کا عزم کیا ہے۔ اس کی اشاعت سے نئے لکھنے والوں کو بھی راہنمائی حاصل ہو گی۔ اس طرح میری پانچ تحریروں میں سے ایک نے تو جگہ پالی ہے دیگر چار تحریریں آپ کی توجہ کی منتظر ہیں۔

(رشید قادری)

☆☆☆

عیش مکدر ہو جاتا ہے

محترمی ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ طالب خیریت بخیریت۔

اگست کا شمارہ بوجوہ رمضان المبارک خصوصی ہے۔ سیارہ رپورٹ، کلام اللہ کی اعجاز آفرینیاں..... نے حق ادا کر دیا۔ خاصی معلومایت اور ایمان افروز تحریر ہے۔

اظہار خیال میں اپنا خط نہ پا کر مایوسی کے

اندھیرے چھانے کو تھے کہ محترمہ یاسمین کنول کا ہمارے افسانے کے بارے میں چھپا یہ فقرہ ''یہ قربتیں یہ فاصلے بہترین تحریر رہی'' پڑھ کر اک برق سی لہرا گئی اور مطلع چکا چوند ہو گیا۔ یاسمین صاحبہ تعریف کا بے حد شکریہ۔

گزشتہ جولائی کا شمارہ ہمارے لئے مسرت و انبساط کا پیغام لے کر آیا۔ آپ نے افسانہ اور غزل دونوں ہی شائع کر دیئے جس کی بے حد خوشی ہوئی۔ ایک اور تحریر اس آرزو کے ساتھ ارسال کر رہے ہیں کہ یہ بھی شرف اشاعت پائے گی۔ شمارے میں شامل اشاعت تمام تحریریں ہی ہمیشہ کی طرح معیاری تھیں البتہ ایک چیز نے نہایت ''آزردہ خاطر'' کیا۔ جناب قلندر حسین سیّد نے اس کی نشاندہی بھی فرمائی اور انہی کے خط میں پھر وہی غلطی دہرائی گئی۔ اپنی کمپوزنگ کی غلطی ان کے اس فقرے ''حکمران اقتدار کے نشے میں نیرو کی طرح سب اچھا ہے کا راگ الاپ رہے ہیں اور روم جل رہا ہے'' اس میں نیرو کے بجائے نہرو چھپا ہے۔

یقین جانیے کمپوزنگ کی غلطیوں کی وجہ سے مطالعہ کا سارا ''عیش مکدر'' ہو جاتا ہے۔ آئندہ خیال کیجئے گا۔

(زاہدہ یوسفی، لاہور کینٹ)

☆☆☆

طویل غیر حاضری

قابل احترام ایڈیٹر صاحب! آداب عرض۔

آپ کی خیریت خدا تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے۔ آج کافی عرصہ کے بعد آپ کی اس خوبصورت بزم میں بمعہ ایک غزل حاضری دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ پہلے کی طرح اس بار بھی تعاون کیا جائے گا۔ غزل معیاری ہونے کی صورت میں اگلی اشاعت میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ آخر میں ادارے کی ترقی کے لیے دن رات دعا گو ہوں۔

(قدیر رانا، راولپنڈی)

☆..... قدیر صاحب! طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آنے پر خوش آمدید۔ آپ کی شاعری شامل اشاعت ہے!

☆☆☆

پراسرار تحریر

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب! سلام مسنون۔ امید ہے مزاج شریف بخیر ہوگا۔

تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ساری تحریریں اچھی اور معیاری تھیں سوائے اپنی تحریر کے کیونکہ اس کے متعلق تو دوسرے قارئین اپنی آراء سے نوازیں گے تب معلوم ہوگا کہ یہ اچھی تھی یا نہیں۔ ویسے بہت بہت شکریہ۔

اس بار اپنی ایک دوست کی بالکل حرف بہ حرف سچی مگر پراسرار تحریر لے کر حاضر ہوں۔ مصروفیت اور جلد بازی کی وجہ سے دیکھیں کچھ خامی تو نہیں رہ گئی اگر کہیں کوئی خامی ہو تو ذرا درست کر لیجئے گا۔ بالکل تازہ ترین تحریر ہے۔ اس واقعہ کو بس دو سال ہوئے ہیں۔ بس ایک دو نام راز میں رکھے گئے ہیں باقی سب اسی طرح بیان کیا گیا ہے جیسا حقیقت میں پیش آیا۔

(ڈاکٹر طیبہ درخشاں انجم)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دہشت گردی کی نئی لہر

نیٹو سپلائی اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کی بحالی کے بعد وطن عزیز ایک بار پھر دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ پشاور اور کوئٹہ میں دہشت گردانہ وارداتوں کے بعد ملک دشمنوں نے ملک کے دیگر اہم مقامات کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ لاہور کی فروٹ منڈی اور سمن آباد میں پولیس اہلکاروں پر حملوں کے بعد اٹک میں پاکستان ایئر فورس کے اہم ترین مرکز کامرہ پر دہشت گردوں کا حملہ پوری قوم کے لیے لمحہ فکریہ بن کر سامنے آیا ہے۔ لاقانونیت اور فرقہ واریت کی ڈسی پاکستانی قوم ایک بار پھر دہشت گردوں کے رحم و کرم پر ہے۔ حکمرانوں کو عوام سے زیادہ اپنی سکیورٹی اور حفاظت کی فکر ہے حتیٰ کہ 14 اگست پر ہمیشہ سے ہونے والی قومی خودمختاری کی علامت سالانہ پریڈ کو بھی محض اس لیے منسوخ کر دیا جاتا ہے کہ کہیں کوئی دہشت گرد اس پریڈ پر حملہ کر کے وی وی آئی پیز میں سے کسی کو نشانہ نہ بنا ڈالے۔

سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ سے دوستی اور اس کی امداد کے بدلے میں ملک کو دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا دینا عقل مندی ہے؟ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی بننے کے بعد پاکستان قربانیاں ہی دیتا آیا ہے، ہزاروں شہری شہید کروانے، معشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے اور خود اپنے لوگوں کو دشمن بنا لینے کے باوجود ہم امریکہ بہادر کو خوش نہیں کر سکے۔ وہ اس سب کے باوجود ہم پر دوغلے پن، دہشت گردوں سے تعلقات، حقانی نیٹ ورک کی پشت پناہی اور افغانستان میں قیام امن کی راہ میں رکاوٹ بننے کے الزامات عائد کرتا ہے۔ ہماری سرحدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتا ہے۔ معصوم شہریوں پر ڈرون حملے کرواتا ہے۔ فوجی چھاؤنیوں پر بم برسا دیتا

ہے اور پھر ہمیں ہی دنیا میں ذلیل و رسواء بھی کرتا ہے..... پھر بھی ہم امریکہ کا اتحادی بننے اور اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں۔ محض امریکی امداد اور ڈالروں کی ہوس کے باعث ہم امریکہ کے ہر جرم سے بالآخر چشم پوشی کر لیتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل جب امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن پاکستان کے دورے پر تشریف لائیں تو میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران انہوں نے بڑے ہی تند و تیز لہجے میں شکایت کی کہ پاکستان کو ہم ہر سال اتنی امداد ڈالروں کی صورت میں دیتے ہیں، مختلف شعبوں میں ترقیاتی کاموں میں تعاون کرتے ہیں اور فوجی امداد کے ضمن میں بھی کثیر رقم فراہم کرتے ہیں..... اس کے باوجود پاکستانی ہمیں بُرا کہتے ہیں اور ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اس پر ایک سینئر صحافی نے ہیلری کلنٹن کو جواب دیا کہ امریکہ پاکستان میں ڈرون حملے کرواتا ہے، معصوم لوگوں کو نشانہ بناتا ہے، ہماری آزادی و خودمختاری کا احترام نہیں کرتا اور ہمیں زبردستی اپنے قبائل کے خلاف جنگ پر مجبور کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکیوں کے خلاف نفرت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مدلل جواب پر ہیلری کلنٹن نے خاموش ہونے کے بجائے ایسی بات کہی جو ہم سب پاکستانیوں کے لیے ایک طمانچہ سے کم نہ تھی۔ وہاں موجود تمام صحافی بھی ہیلری کی اس بات پر ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سچائی کا جواب دیتا جو ایک شرمناک سیاہی کی مانند ہیلری نے ہم پاکستانیوں کے منہ پر مل دی تھی۔

ہیلری کلنٹن نے کہا..... تو ٹھیک ہے اگر آپ کو امریکہ کے ساتھ چلنا منظور نہیں، ہماری پالیسیاں آپ کو غلط لگتی ہیں تو ہماری امداد لینے سے صاف انکار کر دیجئے، کہہ دیجئے کہ ہمیں امریکی امداد نہیں چاہیے اور امریکی اہداف حاصل کرنے میں ہمارا ساتھ نہ دیجئے لیکن یہ منافقت تو نہ کیجئے کہ ہماری امداد اور ہماری رقم تو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے جائیں اور جس مقصد کے لیے ہم یہ رقم فراہم کرتے ہیں اسے پورا کرنے سے انکار کر دیں۔ ہم یہ رقم اپنے اہداف کے حصول کی خاطر فراہم کرتے ہیں، اگر آپ امریکی امداد لینا چاہتے ہیں تو اس کے بدلے میں ہمارا کام تو کرنا ہوگا!

یہ ایک بالکل واضح اور سیدھا سادہ جواب تھا کہ بھئی فیصلہ کر لو، یا تو صاف کہہ دو کہ ہمیں امریکی غلامی قبول نہیں اور ہم حقیقتاً ایک آزاد اور خودمختار قوم کی طرح جینا چاہتے ہیں..... اور امریکی امداد سے ہاتھ دھو بیٹھو، اپنے قدموں پر خود کھڑے ہو جاؤ لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتے اور ہم سے امداد لئے بغیر تمہیں چین نہیں آتا تو بھئی خالی خولی امداد تو ہم نہیں دیتے اس کے بدلے میں ہمارا کام تو کرنا ہو گا پھر چاہے وہ کام آپ کو پسند ہو یا نہ ہو۔

ہم کچھ عرصہ اس کشمکش و پنج میں مبتلا رہے کہ کون سا راستہ اختیار کریں، امریکی غلامی کے راستے پر چل کر ہم دیکھ چکے تھے کہ اس میں سوائے امریکی امداد کے ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ امریکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈالروں کی صورت میں ہماری دم توڑتی معیشت کو مصنوعی بیساکھیاں تو فراہم کر دیتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں ہمیں ہر روز اس کی غلامی کی قیمت اپنے معصوم شہریوں کی ڈرون حملوں میں ہلاکت، دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں فوجی جوانوں کی قیمتی جانوں کے نذرانوں اور دہشت گردوں کے حملوں میں انسانی جانوں اور املاک کی تباہی نیز معیشت کی بربادی کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ ہم نے کچھ عرصہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کی سعی لاحاصل کی لیکن بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور ملک کو بغیر مصنوعی بیساکھیوں کے چلانے کا طریقہ نہیں آتا۔ وہ اس فن سے آشنا ہی نہیں۔ سو تھوڑے ہی عرصہ میں ہم نے امریکہ بہادر کے سامنے ایک بار پھر گھٹنے ٹیک دیئے۔ جھولی پھر سے پھیلالی اور اس کی غلامی کا طوق دوبارہ گردن میں ڈال لیا۔

نیٹو سپلائی بحال کر دی گئی اور ڈرون حملے ایک بار پھر شروع ہو گئے۔ امریکہ کی دہشت گردی کی جنگ میں اس کی مدد کرنے اور اس کے بدلے میں ملنے والی امداد کو باقاعدہ معاہدے کی صورت میں ازسرنو مرتب کیا گیا اور کابینہ نے اس کی فوراً منظوری دے دی۔ شمالی وزیرستان میں پاک امریکہ مشترکہ آپریشن کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ ادھر امریکہ نے بھی غلامی کا پہلا معاوضہ فوراً جاری کر دیا اور ایک بار پھر ہماری دم توڑتی معیشت کو کچھ عرصہ کے لیے توانائی فراہم ہو گئی لیکن اس سب کے نتیجے میں ملک ایک بار پھر دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا ہے جبکہ مہنگائی، لاقانونیت، لوڈشیڈنگ اور ان گنت دیگر مسائل میں جکڑی اس قوم کو دہشت گردوں کے حوالے کر کے حکمران امریکی امداد کے نشے میں مست ہیں۔

توہین عدالت کا نیا قانون کالعدم

عدلیہ اور حکومت کی محاذ آرائی کیا رنگ لائے گی؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

• سیارہ رپورٹ

توہین عدالت کا نیا قانون کالعدم

عدلیہ اور حکومت کی محاذ آرائی کیا رنگ لائے گی؟

فیصل رضا عابدی کی پریس کانفرنس اور بھونچال

توھین عدالت قانون: عدلیہ کا فیصلہ

سپریم کورٹ نے حکومت کی جانب سے پارلیمنٹ سے منظور کئے گئے توہین عدالت قانون 2012ء کو ماورائے آئین قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ قانون آئین سے متصادم، بدنیتی پر مبنی اور عدالت کے اختیارات کم کرنے کی کوشش ہے، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور کچھ لوگوں کو استثنیٰ دینا آئین پاکستان کے منافی ہے، صدر، وزیراعظم اور دیگر کو استثنیٰ دینا آئین سے متصادم ہے اور استثنیٰ دینا آئین میں ترمیم کے مترادف ہے، عدالت عظمیٰ نے قرار دیا کہ جس روز یہ نیا قانون منظور کیا گیا تھا اسی دن سے ہی توہین عدالت قانون 2003ء نافذ العمل ہے لہٰذا نئے قانون کی کوئی آئینی یا قانونی حیثیت نہیں ہے۔ عدالت نے توہین عدالت قانون کے خلاف دائر تمام درخواستیں قابل سماعت قرار دے دیں۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی سربراہی میں 5 رکنی بنچ نے جمعہ کے روز توہین عدالت قانون کے خلاف درخواستوں کی سماعت مکمل ہونے کے بعد مختصر فیصلہ جاری کیا۔ سپریم کورٹ نے نئے اور اب کالعدم توہین عدالت قانون کی کن شقوں کو خلاف آئین قرار دیا اس کی پوری تفصیل پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر آ چکی ہے، اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آئین کے مطابق اگر پارلیمنٹ کوئی قانون بنانے کی مجاز ہے تو اس کی توضیح و تشریح کا حق عدلیہ کے پاس ہے اور عدلیہ نے اس حوالے سے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ سپریم کورٹ نے سوئس حکام کو خط لکھنے کے سلسلہ میں بھی حکومت کو 18 اگست تک کا حتمی وقت دے رکھا ہے چنانچہ اس قانون کو کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد بھی حکومت اگر اس خط کے لکھے جانے کے حوالے سے کوئی اقدام نہیں کرتی تو اگلے ایک ہفتے میں وزیراعظم کی ایک بار پھر رخصتی جیسا کوئی فیصلہ سامنے آ سکتا ہے، اس حوالے سے کوئی درمیانی راستہ نکالنا وقت کی ضرورت ہے۔ حکومت کے لئے یہ وقت نہایت سوچ سمجھ کر آگے بڑھنے کا ہے کیونکہ کوئی بھی غلط فیصلہ یا اقدام موجودہ سیٹ اپ اور جمہوریت دونوں کے لئے خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ واضح ہے

کہ حکومت نے کالعدم قرار دیا گیا بل نہایت عجلت میں اور محض چند دنوں میں منظور کرایا تھا اور واضح طور پر اس قانون کی منظوری اور حوالے سے کی جانے والی عجلت کے پس منظر میں ایک ہی سوچ یا مقصد کارفرما تھا کہ جو کچھ سید یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ہوا وہ نئے وزیراعظم کے ساتھ نہ ہو سکے۔ اب سپریم کورٹ کا فیصلہ آ چکا ہے، حکومت نے اسے تسلیم بھی کر لیا ہے جو ایک اچھی پیشرفت ہے تاہم حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر ایک اور ردعمل بھی سامنے آیا ہے۔ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ اتحادی جماعتوں کا اہم اجلاس صدر آصف علی زرداری اور وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کی زیرصدارت ایوان صدر میں ہوا جس میں توہین عدالت کے قانون کو سپریم کورٹ کی جانب سے کالعدم قرار دینے کے فیصلے اور موجودہ سیاسی صورتحال پر غور کیا گیا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ حکومت نے وزارت قانون کو توہین عدالت قانون میں خامیوں کا ازسرنو جائزہ لے کر نیا مسودہ تیار کرنے کی ہدایت کی، اجلاس میں شریک تین سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے دعویٰ کیا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر نظرثانی کی اپیل دائر کی جائے گی جبکہ اتحادی جماعتوں نے صدر کو عدالتی فیصلے پر پارلیمنٹ میں بحث کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے۔ اتحادی جماعتوں اور پیپلز پارٹی نے اس بات کا اعادہ کیا کہ پارلیمنٹ کی بالادستی اور قانون سازی کے حق پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ ذرائع کے مطابق نیا قانون 8 اگست سے پہلے پارلیمنٹ سے منظور کرایا جائے گا۔ ہمارے خیال میں جس طرح عدلیہ کو آئین و قوانین کی تشریح کا اختیار حاصل ہے اسی طرح آئین پارلیمنٹ کو بھی یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اتفاق رائے کے ساتھ کوئی قانون بنانا چاہے تو بنائے چنانچہ اگر حکومت نے گزشتہ ماہ بنایا گیا توہین عدالت قانون کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد ایک اور نیا قانون لانے کی بات کی ہے یا اگر وہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر نظرثانی کی اپیل دائر کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو یہ اس کا حق ہے اور اس کی جانب سے ایسا کوئی اقدام کرنے پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عدلیہ اور انتظامیہ کے مابین پھر سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ جب بھی اور جدھر سے بھی ایسا کوئی تاثر دیا جائے گا وہ غلط ہوگا۔ پارلیمنٹ کا کام ہی قانون بنانا ہوتا ہے، اگر وہ کوئی قانون بناتی ہے اور پاکستان کا کوئی شہری سمجھتا ہے کہ یہ آئین سے متصادم ہے تو وہ عدالت عظمیٰ سے رجوع کر سکتا ہے اور عدالت آئین کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق فیصلہ دینے کا اختیار رکھتی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا وہ آئین اور قانون کے دائرے میں ہی ہوا ہے اور اداروں کے مابین تصادم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر حکومت اتحادی جماعتوں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے عدالتی فیصلے پر پارلیمنٹ میں بحث کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اسے اس سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ اس پر بحث کر سکتی ہے، یوں ارکان پارلیمنٹ کو اس قانون میں موجود خامیوں کا پتہ چل سکتا ہے اور وہ انہیں دور کر کے نیا قانون بنا سکتے ہیں۔ بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ آئین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور قانون کے ان معاملات کو آئینی اور قانونی پیرامیٹرز کے اندر رہتے ہوئے طے یا حل کیا جائے تاکہ موجودہ سیٹ اپ یا جمہوریت میں سے کسی کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

سازش تھیوری نہیں نتارا

(عباس اطہر)

چند روز قبل سینیٹر فیصل رضا عابدی نے ایک پریس کانفرنس بلوائی اور چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے صاحبزادے ارسلان افتخار پر متعدد الزامات لگائے اور عدالت عظمیٰ کے بارے میں بھی کچھ توہین آمیز کلمات کہے جس سے ملک میں پہلے سے موجود خطرناک ماحول پر نیا خوف طاری ہوگیا۔ چند ایک ٹی وی چینلز نے جزوی طور پر اس ''ایڈونچر'' کی فلیچ دکھائی۔ بعد میں فیصل عابدی ایک چینل کے ٹاک شو میں بھی شریک ہوئے۔ خوف اور سناٹے کی کیفیت یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں اور وکلاء کے لیڈروں نے روایت کے برعکس اعلان جنگ نہیں کیا۔ اگلی صبح کے کچھ اخبارات میں گول مول خبریں شائع ہوئیں لیکن اکثر اخباروں نے بالکل بلیک آؤٹ کر دیا۔ رات گئے تک لوگ ایک دوسرے سے فون پر پریس کانفرنس کی تفصیلات پوچھتے رہے جو ادھوری تھیں۔ اکثریت کو سب سے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ عابدی صاحب کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی ہے یا نہیں۔ فیصل رضا عابدی کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔ فیصل کے مخالف اور حامی پیر کی سہ پہر تک کسی نہ کسی دھماکے کے منتظر رہے۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ فیصل رضا عابدی نے کیا کہا ہے جو قابل مواخذہ ہے۔ صرف انگریزی اخبار ''ڈان'' نے پریس کانفرنس کی تفصیلی خبر شائع کی تھی۔ اس خبر کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

1- فیصل رضا عابدی نے ارسلان افتخار چودھری کی کمپنی ایف اینڈ اے کی بینک سٹیٹمنٹس کی نقول تقسیم کیں جن پر چیف جسٹس کی سرکاری قیام گاہ کا پتہ درج تھا۔

2- عابدی نے الزام لگایا کہ ارسلان افتخار کی ایک انفارمیشن ٹیکنالوجی کمپنی اور سلک بینک (اکاؤنٹ نمبر 01104739201) کے مابین دس ملین کا لین دین ہوا اور بینک سٹیٹمنٹ پر درج پتہ ایف اینڈ اے انٹرپرائز، چیف جسٹس ہاؤس اسلام آباد تھا۔ فیصل رضا عابدی نے یہ بھی کہا کہ سینیٹر اعتزاز احسن نے اس معاملے پر ملاقات کے دوران چیف جسٹس پاکستان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ارسلان کے بینک اکاؤنٹس پر چیف جسٹس کی رہائش گاہ کا پتہ درج ہے۔ عابدی نے الزام لگایا کہ ایک شخص جو 5 سال پہلے نوکری کرتا تھا، اب کروڑوں روپے کا مالک ہے۔ اس پریس کانفرنس کی مزید تفصیلات چھپی نہیں رہ سکتیں اور مقدمے کی سماعت کے دوران منظر عام پر آجائیں گی۔ ہمارے ملک میں میڈیا کی پرانی روایت ہے کہ ''خطرناک'' خبر کو پہلے دن بالکل مختصر یا گول مول کر کے چھاپ دو۔ اصل کہانی اگلے دن ''فالواپ'' ری ایکشن آئے گا اور اصل خبر بھی خود بہ خود شائع ہو جائے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیپلز پارٹی کی حکومت پہلے ہی ''بکروں کی ماں'' بنی ہوئی ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کب تک خیر منا سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے فیصل رضا عابدی کی پریس کانفرنس اس پارٹی کے لئے مزید پریشانیاں بلکہ تباہیاں پیدا کرنے کا باعث بن جائے۔ آج وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کے مقدمے کی سماعت ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے ان کے وکلاء کو فیصل رضا عابدی کے گناہ کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے۔

موجودہ حکومت اور سپریم کورٹ میں محاذ آرائی کا یہ عالم ہے کہ یہ بات دو تہائی والی آئینی ترمیم ہو یا پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت کوئی قانون بنائے، سپریم کورٹ اسے منسوخ یا تبدیل کرنے کی مجاز ہے۔ وہ صدر اور وزیراعظم سمیت تمام حکومتی عہدیداروں کے خلاف برطرفی جیسی کارروائی کے لئے بھی آئین میں درج طریقہ کار کی پیروی کرنے کی پابند نہیں۔ پارلیمنٹ بالادست اور آئین محترم ضرور ہے لیکن سپریم کورٹ کے پاس تشریح کا آئینی اختیار اتنا وسیع ہے کہ وہ مارشل لاؤں کو آئینی جواز مہیا کردیتی ہے اور جمہوریتوں کو بے دست و پا کر کے اپنا ماتحت ادارہ بنالیتی ہے۔ فوجی حکمرانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ جنرل ضیاء اور جنرل مشرف کے ادوار گڈ گورننس کے نمونے سمجھے جاتے تھے۔ عدلیہ ہو یا میڈیا، اسے فوجی حکومتوں کی کرپشن نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مشرف اپنی نسلیں سنوار کر رخصت ہوئے۔ ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں نے اپنے خزانے بھرے لیکن ان کی دیانتداری عسکری لاٹھی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی، اس لئے مضبوط رہی۔ 1988ء سے 1999ء بے نظیر اور نواز حکومتوں کے خلاف مسلسل بہتان تراشی جاری رہی۔ ن لیگ نے محترمہ اور آصف زرداری کو کرپشن کی علامت بنا دیا۔ میاں نواز شریف نے اپنے آپ کو دیانت کا نمونہ بنا کر پیش کیا لیکن ان کی حکومت کا تختہ الٹنے پر سپریم کورٹ نے انہیں بھی کرپٹ قرار دے دیا۔ گویا دونوں باہر ہوگئے۔ 2008ء میں میثاق جمہوریت والی حکومت بنی تھی لیکن ن لیگ نے پیپلز پارٹی سے 1988ء والا سلوک دہرایا اور اس کی کرپشن کا چرچا کرتی رہی۔ ہمارے سیاستدان ایک دوسرے کے لئے کرپشن کی کالک کے ڈرم خود تیار کرتے اور فوج یا سپریم کورٹ کو ذخیرہ کروا دیتے ہیں پھر مناسب وقت پر مذکورہ دونوں مل کر قومی مفاد میں سیاست پر کالک مل کر حکومتوں پر قبضہ کرلیتے ہیں۔

ارسلان افتخار پر الزامات سچے ہیں یا جھوٹے ہیں مقدمے کی سماعت کے بعد عدالتیں فیصلہ کریں گی۔ فی الحال وہ سیاستدانوں اور وکلاء میں ہر اس شخص کا ٹارگٹ ہیں جو چیف جسٹس صاحب کے خلاف ہو یا اپنی کسی حق تلفی پر ناراض ہو۔

یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ یا اتفاق ہے کہ قسم قسم کے معاملات میں ارسلان افتخار کا نام کہیں نہ کہیں سے ''گھس'' آتا ہے۔ گزشتہ روز مجھے ایک خط موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ پنجاب میں بارہ ایڈیشنل سیشن ججوں کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر ترقی دینے کے احکامات جاری ہوئے۔ یہ

ترقی سنیارٹی اور میرٹ کے مطابق ملنی تھی پھر ترقی پانے والوں کی لسٹ کو جھٹکا لگا اور ترتیب میں 24 نمبر والے ایک ایڈیشنل سیشن جج طاہر صابر کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر ترقی دے کر بہاول نگر میں تعینات کردیا گیا۔ 12 نمبر والا ترقی سے محروم رہ گیا اور باقی گیارہ ابھی تک تعیناتی کے احکامات کا انتظار کررہے ہیں۔

اس کیس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ طاہر صابر صاحب ارسلان افتخار کے وکیل سردار اسحاق کے داماد ہیں۔ تعیناتیوں میں اس نوعیت کے ردوبدل ہوتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کارروائی کسی روٹین یا میرٹ کے مطابق کی گئی اور پھر بیچ میں ارسلان افتخار کا نام بلاوجہ آگیا ہو۔

ہوسکتا ہے کہ ارسلان افتخار کے خلاف سچ مچ کوئی سازش ہورہی ہو اور اس کا ٹارگٹ چیف جسٹس صاحب ہی ہوں لیکن اگر کروڑوں روپے کے اخراجات کی رسیدیں اور بینکوں کے کاغذات اصلی ہیں تو ان معاملات کو توہین عدالت کے نئے یا پرانے قانون کا دباؤ ڈال کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس فیصلے میں قانونی اور ''عدالتی موشگافیاں'' بروئے کار لانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی سازشی تھیوری اس لئے نہیں مانی جاسکتی کہ بے اندازہ دولت کے مالک ہونے کے باوجود ملک ریاض کو کوئی ایسی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ ان کے زندگی بھر کے اثاثے داؤ پر لگ جاتے۔ فیصل رضا عابدی کو ذوالفقار مرزا جیسا کوئی دورہ پڑسکتا ہے۔

ارسلان افتخار پر الزامات کی بوچھاڑ کو چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف سازش کہہ کر آنکھیں بند کرلی جائیں یا پوری سپریم کورٹ کی توہین سمجھ کر سزائیں سنا دی جائیں، دونوں صورتوں میں یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ سب کو اصل سوالات کی طرف آنا چاہیے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ارسلان افتخار نے ملک ریاض سے کروڑوں روپے لئے یا نہیں۔ دوسرا یہ فیصل رضا عابدی نے بینک کی جو نقول پریس کانفرنس میں تقسیم کیں، وہ نقل بمطابق اصل ہیں یا کسی جعلی طریقے سے بنائی گئی ہیں۔ فیصلہ سچ اور جھوٹ کے درمیان ہے۔ ''نتارا'' کئے بغیر یہ جھگڑا حل نہیں ہوگا۔

انتہا کی طرف سفر

سپریم کورٹ آف پاکستان کے تقدس کے حوالے سے ابھی ملک ریاض حسین کے خلاف مقدمہ منطقی انجام تک نہیں پہنچا تھا کہ پیپلز پارٹی کے سینیٹر فیصل رضا عابدی نے ٹی وی چینلز پر آکر توہین عدالت کی انتہا کردی۔ فیصل رضا، پارٹی کے عہدے چھوڑ چکے ہیں لیکن سینٹ میں بدستور پارٹی کے رکن ہیں۔ وہ کبھی کبھی تھوڑا بہت ''کھسک'' جاتے ہیں لیکن کل تو یوں لگا جیسے عدلیہ اور حکومت کی محاذ آرائی مرنے مارنے کے کسی کھیل میں تبدیل ہورہی ہے۔ جاوید ہاشمی کا کہنا ہے کہ ملک کے ادارے عدلیہ کے سہارے کھڑے ہیں۔ حکومت نے سپریم کورٹ کو گرانے کا یک نکاتی پروگرام بنالیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ عدلیہ کو نقصان پہنچا تو ملک تباہ ہوجائے گا۔ اس حوالے سے یہ معاملہ بہت ہی سنگین ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک نجی ٹی وی کے پروگرام میں نامور اور غیر جانبدار تجزیہ نگار حسن عسکری کو یہ کہتے سنا ہے کہ دنیا میں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی ملک نے اپنے صدر کے خلاف کسی دوسرے ملک کو خط لکھا ہو۔ عسکری صاحب کو غالباً اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا کہ ہماری موجودہ آزاد عدلیہ ایک تاریخی عمل کے ذریعے وجود میں آئی تھی۔ عدلیہ بحالی کی تحریک کے دوران پیپلز پارٹی کے درجن سے بھی زیادہ کارکن اور دوسری جماعتوں کے نصف درجن کے قریب کارکن شہید ہوئے۔ عوام کی بہت بڑی تعداد اپنی سیاسی پارٹیوں کی ہدایت پر پوری پوری رات چیف جسٹس صاحب کے استقبال کے لیے سڑکوں پر کھڑی رہتی تھی۔ عام لوگوں اور صحافیوں نے پولیس سے ماریں کھائیں۔ تاہم عدلیہ تحریک کی کامیابی کا سہرا وکلاء صرف اپنی جدوجہد کے سر باندھتے ہیں۔ نومبر 2007ء میں جنرل مشرف نے ایمرجنسی پلس نافذ کرنے کے بعد بہت سے ججوں کو فارغ اور پھر گھروں میں نظر بند کر دیا تھا۔ وکلاء نے معتوب ججوں کی حمایت میں الیکشن کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی لیکن عوام نے اسے رد کر دیا اور ووٹروں کا ٹرن آؤٹ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا۔ جنرل مشرف نے اسلام آباد میں ججز کالونی کے گرد باڑ لگا کر چیف جسٹس اور ان کے ساتھیوں کو قید رکھا۔ سیاسی جماعتیں الیکشن کی وجہ سے دور بیٹھی تھیں۔ وکلاء غائب تھے۔ ان کی جدوجہد پر کامیابی کا سہرا اس طرح بندھا کہ یوسف رضا گیلانی نے وزیراعظم منتخب ہوتے ہی چارج سنبھالنے سے بھی پہلے حکم جاری کیا کہ ججز کالونی کے گرد باڑ ہٹا دی جائے۔ تھوڑی دیر بعد عام لوگوں کی بہت بڑی تعداد ججز کالونی میں پہنچی اور باڑ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بعد میں گیلانی صاحب آئے روز سینے پر ہاتھ مار کر کہتے رہے کہ عدلیہ کو میں نے بحال کیا، برطرفی کے بعد اب انہیں یہ یقین بھی آ گیا ہوگا کہ عدلیہ آزاد ہے، انصاف کرتی ہے اور کسی رو رعایت کی قائل نہیں۔ پہلے آزاد عدلیہ کی بحالی کا کریڈٹ وکلاء نے خود سمیٹ لیا پھر کالے کوٹوں والی فورس بنا کر عدلیہ کے محافظ بن بیٹھے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی لمٹ (LIMIT) میں اور بہت کچھ کے علاوہ یہ بھی شامل کروالیا کہ مجسٹریٹوں سے سول ججوں تک کی عدالتوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروائیں اور ماتحت ججوں کی اصلاح کے لیے مار پیٹ کرنے کے بھی مجاز ہوں۔

وکلاء سپریم کورٹ کے بازوئے شمشیر زن ہیں اور کسی خطرے کا شائبہ ہوتے ہی ایجی ٹیشن کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ تاہم سپریم کورٹ کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ گمراہ کن ہے کہ وہ حکومت کی اپوزیشن پارٹی ہے۔ اپوزیشن کے حوالے سے کسی کو کوئی شبہ نہیں۔ قومی اسمبلی میں چودھری نثار علی قائد حزب اختلاف ہیں اور پنجاب میں میاں شہباز شریف وزارت اعلیٰ کے معاملات سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپوزیشن کے بھی سربراہ ہیں۔

میں نے سینیٹر فیصل رضا عابدی کی پریس کانفرنس کے کچھ حصے ٹی وی سکرین پر دیکھے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ انہوں نے سچ مچ انتہا کر دی ہے اور امید ہے انہیں اس انتہاء کے جواب میں سزا بھی اتنی ہی انتہائی ملے گی کہ باقی لوگوں کو ہمیشہ کے لیے عبرت ہو جائے گی۔

کچھ روز قبل چودھری نثار اور عمران خان نے ایک دوسرے کی کرپشن گنوا کر اس سیاسی طبقے کو تشویش میں مبتلا کر دیا جس کی رائے ہے کہ تحریک انصاف اور مسلم لیگ (ن) کو مل کر پیپلز پارٹی کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ سپریم کورٹ پر آج کے حملے نے تشویش بڑھا دی ہے۔ پیپلز پارٹی اپنے خلاف مقدموں کے ڈھیر

کی وجہ سے بدنام ہے جبکہ ن اور تحریک انصاف اس لیے نیک نام ہیں کہ ان کے خلاف جھوٹے الزامات کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے سپریم کورٹ پر عابدی کے حملے سے دونوں پارٹیوں کے لیے لازمی ہو گیا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں اور ایک دوسرے کے خلاف اپنے اپنے الزامات اسی طرح واپس لے لیں جیسے غصے کی طلاق منسوخ ہو جاتی ہے۔ گالیوں اور بہتان تراشی کا موجودہ مقابلہ جاری رہا تو دونوں جماعتیں گھاٹے میں رہیں گی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ زیادہ نقصان تحریک انصاف کو ہوگا جو ''ن لیگ'' کے مقابلے میں اناڑی ہے۔

الزام سازی اور بہتان تراشی کا کلچر 1988ء میں (ن) لیگ کے ''جماعت اسلامی ونگ'' نے متعارف کرایا تھا۔ اب تحریک انصاف کا ''جماعت اسلامی ونگ'' کافی ٹرینڈ ہو چکا ہے۔ اس لیے خدشہ ہے کہ کچھ نئی ''روایات'' جنم لیں گی۔

میاں نواز شریف دو بار وزیراعظم رہ چکے ہیں جبکہ عمران خان نے 1996ء میں وزارت عظمیٰ کا شوق پالا تھا۔ مسلم لیگ (ن) کے ماہرین کردار کشی نے انہیں سیتا وائٹ اور ٹیریان خان کے گرد اتنا ناچ نچایا کہ عمران کے امیدواروں کی ہر حلقے میں ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

پھر جنرل پرویز مشرف نے ان کے شوق اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لالچ دیا کہ وہ ایک سیٹ جیت کر آئیں اور وزیراعظم بن جائیں۔ الیکشن کے بعد عمران کھل کر مشرف کے سامنے آ گئے۔ لندن کی اے پی سی میں خان صاحب مسلسل نواز شریف کے دائیں بائیں دیکھے گئے۔ ایم کیو ایم کے سیاسی بائیکاٹ کا فیصلہ کروایا۔ پیپلز پارٹی کے خلاف اے پی ڈی ایم نامی اتحاد بنوانے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ وطن واپس آنے کے بعد میاں نواز شریف نے پہلے محترمہ بینظیر بھٹو کے مشورے پر اور پھر سانحہ لیاقت باغ کے بعد آصف زرداری سے اپیل کروا کے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور اے پی ڈی ایم منہ دیکھتی رہ گئی۔

عمران خان غصے میں تھے لیکن وہ صرف نجی محفلوں میں اظہار کرتے تھے۔

لاہور کے قومی حلقہ 128 کی انتہائی مہم کے دوران عمران خان نے صدر زرداری پر ہاتھ ہلکا کر دیا اور شریف خاندان پر گولہ باری کر کے انہیں اتنا بھڑکایا کہ (ن) لیگ دیہی علاقوں کے پولنگ سٹیشنوں سے مثبت نتائج نہ منگواتی تو وہ ضمنی الیکشن ہار چکی ہوتی۔

پھر عمران خان کا اصل ٹارگٹ میاں نواز شریف بن گئے، اب عمران خان سنٹرل پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کے طاقتور حریف ہیں۔

آئندہ انتخابات میں دائیں بازو کا ووٹ (ن) لیگ اور تحریک انصاف میں تقسیم ہوگا اور پیپلز پارٹی کو جگہ جگہ ''جھونگا'' ضرور ملے گا جو کچھ حلقوں میں پیپلز پارٹی کو جتوا سکتا ہے۔ بجلی کے مسئلے کا کوئی حل نکل آیا تو ہو سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کو 2008ء کے الیکشن میں حاصل شدہ کے لگ بھگ نشستیں مل جائیں۔ دشنام طرازی اور بہتان تراشی کے مقابلے میں (ن) لیگ کا پرانا تجربہ بہت کام آئے گا لیکن تحریک انصاف کے پاس بھی دائیں بازو کے ''جنگجوؤں'' کی کوئی کمی نہیں۔ پہلے اکیلی پیپلز پارٹی کرپٹ کہلاتی تھی لیکن اب کرپشن کے وکٹری سٹینڈ پر پہلی دو پوزیشنوں کے لیے (ن) لیگ اور تحریک انصاف میں سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔

پچھلے دنوں میں نے سعادت حسن منٹو کے ایک مضمون کے حوالے سے پیش گوئی کی تھی کہ اب ایک اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال اٹھے گا۔ پچھلے چند دن میں صرف ایک نہیں کئی سوال اٹھ چکے ہیں اور مزید اٹھنے والے ہیں لیکن اپنی طرف سے بھی ایک سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔

سوال میاں نواز شریف اور عمران خان سے ہے جو پہلے صدر زرداری اور اب ایک دوسرے کی ''کرپشن'' کے سکینڈل منظرعام پر لاکر اپنی اپنی ''دیانتداری'' کا ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے اور وسائل ذخیرہ کرنے کے باوجود یوسف رضا گیلانی کے بیٹے عبدالقادر گیلانی سے ہارنے کے بعد بھی انہیں یہ بات کیوں سمجھ نہیں آئی کہ آئندہ الیکشن میں ہار یا جیت کرپشن کے ایشو پر نہیں ہوگی، ووٹر پارٹیوں اور امیدواروں کو اپنے فوری یا طویل المیعاد فائدوں کی بنیاد پر پرکھیں گے اور برادریاں ذاتی اور خاندانی تعلقات کو سامنے رکھ کر فیصلے کریں گی۔

آخر میں 88ء اور 99ء تک کے دور کا ایک قصہ سنیں۔ لاہور میں ملک معراج خالد مرحوم اور مخالف امیدوار کے درمیان ایک الیکشن ہو رہا تھا۔ مخالف امیدوار نے ان کی دیانتداری کا قصیدہ پڑھا اور پھر حاضرین سے پوچھا جس شخص (ملک معراج خالد) نے اپنا کچھ نہیں بنایا تمہارا کیا بنائے گا؟

اس الیکشن میں ملک معراج خالد ہار گئے۔

صدر، وزیراعظم سمیت کسی کو استثنیٰ دینا آئین سے متصادم ہے سپریم کورٹ نے توہین عدالت کا نیا قانون کالعدم قرار دے دیا

سپریم کورٹ نے حکومت کی جانب سے پارلیمنٹ سے منظور کئے گئے نئے توہین عدالت قانون 2012ء کو ماورائے آئین قرار دیتے ہوئے اس کے اجراء سے ہی کالعدم قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ قانون آئین سے متصادم، بدنیتی پر مبنی اور عدالت کے اختیارات کم کرنے کی کوشش ہے، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور کچھ لوگوں کو استثنیٰ دینا آئین پاکستان کے منافی ہے اس لیے عوامی عہدہ رکھنے والے کسی بھی شخص کو توہین عدالت سے استثنیٰ نہیں دیا جاسکتا، صدر، وزیراعظم اور دیگر کو استثنیٰ دینا آئین سے متصادم ہے اور استثنیٰ دینا آئین میں ترمیم کے مترادف ہے، جس روز سے یہ نیا قانون منظور کیا گیا تھا اس روز سے ہی توہین عدالت قانون 2003ء نافذ العمل ہے، عدالت نے توہین عدالت قانون کے خلاف دائر تمام درخواستیں قابل سماعت قرار دے دیں۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی سربراہی میں 5 رکنی بنچ نے جمعہ کو توہین عدالت قانون کے خلاف درخواستوں کی سماعت مکمل ہونے کے بعد مختصر فیصلہ جاری کیا۔ فیصلے کے وقت اٹارنی جنرل عرفان قادر کمرہ عدالت میں موجود نہیں تھے۔ عدالتی فیصلہ 21 صفحات پر مشتمل ہے جو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے تحریر کیا اور عدالت میں پڑھ کر سنایا۔ فیصلے پر سب سے آخر میں چیف جسٹس نے دستخط کئے۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا ہے کہ آئین میں عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کی نشاندہی کی گئی ہے، عدلیہ نے کبھی ریاست کے دوسرے اداروں پر اپنی بالادستی کا کوئی تاثر نہیں دیا تاہم عدلیہ کی یہ آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ آئین و قانون کی تشریح کرے، عدلیہ کی ذمہ داری ہے

کہ ملک میں کسی ایسے قانون کے نفاذ کو روکے جس سے شہریوں کے بنیادی حقوق متاثر ہوں، انصاف کے نظام کا تسلیم شدہ اصول ہے کہ مخصوص افراد کے مفاد کے لیے قانون نہ بنائے جائیں، اگر کوئی ایسی شق قانون میں شامل کی جائے تو یہ معاشرے میں شہریوں کے درمیان امتیازی سلوک روا رکھنے کی بنیاد رکھنے کی کوشش متصور ہوگی جو آئین کے منافی اقدام ہے۔ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ نئے قانون میں لفظ جج کا استعمال کر کے تمام عدالتی افسران کو توہین عدالت کا قانون استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا، نئے قانون کا سیکشن 3 مکمل طور پر آئین کے آرٹیکل 4,9,25 اور 204 کے خلاف ہے، توہین عدالت کی سزا آرٹیکل 204 کے تحت توہین عدالت کی تعریف سے نکال لی گئی، نئے قانون میں کسی جج کو اپنے دفتری امور کے حوالے سے سکینڈلائز کرنے کا تاثر دینے کے ذریعے عدالتوں کے اختیارات کم کر دیئے گئے ہیں، سیکشن 3 کے ذریعے توہین عدالت کی تصریح شدہ تعریف آرٹیکل 63 دن جی کے منافی ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں قرار دیا ہے کہ آئین کا آرٹیکل 248 کسی کو فوجداری استثنیٰ نہیں دیتا، نئے قانون کے سیکشن 3 کی دفعہ 1 تا 11 کے ذریعے توہین عدالت کا ارتکاب کرنے والے کو رعایت دینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ اقدام مساوات کے اصول کے منافی ہے، سیکشن 4 کے ذیلی شق (4) میں مقننہ کے فیصلہ کے تحت عدالتی فیصلے کے اثرات کو فیصلے کی وجہ بننے والی وجوہات کو ختم کئے بغیر مکمل طور پر ختم کیا گیا ہے جو بنیادی حقوق کے تحت انصاف تک رسائی کے اصولوں کے خلاف ہے، یہ شق آئین کے آرٹیکل 189 کے بھی خلاف ہے۔ نئے قانون کے سیکشن 6(3) سے توہین عدالت کی کارروائی کو مؤخر کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے حالانکہ عدالتی وقار اور احترام کو برقرار رکھنے کے لیے مرتکب شخص کو فوری طور پر سزا دینا لازمی ہوتا ہے، سیکشن 8 عدالتی اختیارات کو کم کرنے کی ایک کوشش ہے جس میں عدلیہ کی بجائے ججوں کو سکینڈلائز کرنے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، عدالتی کارروائی کو کسی جج یا بنچ کو منتقل کرنا چیف جسٹس کا اختیار ہے جس کو مقننہ کے کنٹرول میں نہیں دیا جاسکتا، یہ اقدام عدلیہ کی آزادی کے خلاف اور اسی حوالے سے چیف جسٹس کی اتھارٹی کو کم کرنے کی کوشش ہے، سیکشن 10 بی اظہار رائے کی آزادی کے بنیادی حق کے منافی ہے کیونکہ آرٹیکل 68 کے تحت سپریم کورٹ یا ہائیکورٹ کے کسی جج کے کنڈکٹ کو پارلیمنٹ میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا جبکہ سیکشن 11(3) جو انٹرا کورٹ اپیل سے متعلق ہے، مقدمات کو جلد نمٹانے کے اصول کے منافی ہے، سیکشن 11(3) جو ابتدائی مرحلے میں شوکاز نوٹس کے اجراء کے بعد فل کورٹ میں مرتکب شخص کی شکایت کا جائزہ لیتے وقت پوری کارروائی کو غیر موثر کرسکتا ہے حالانکہ سپریم کورٹ کے رولز 1980ء کے تحت دو رکنی بنچ انتہائی ہائی پروفائل کیس کا فیصلہ کرنے کا بھی مجاز ہوتا ہے، اس سیکشن کی دوسری کلاز جو خود بخود عدالتی حکم کو معطل کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے، اختیارات کی تقسیم اور عدلیہ کی آزادی کے اصول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے منافی ہے، نئے قانون کے سیکشن 11 کی ذیلی شق 4، 5 کے مطابق عدالتی فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ بنچ میں 30 دن سپریم کورٹ میں 60 دن اور انٹرا کورٹ اپیل کے لیے شوکاز کے نوٹس کے بعد 30 دن کی مدت فراہم کرتا ہے، کا مقصد توہین عدالت کے مقدمات کے فیصلوں کو تاخیر کا شکار کرنا ہے، نئے قانون کا سیکشن 12، آرٹیکل 204 سے متصادم ہے لہٰذا متعدد کلاز کے خلاف آئین ہونے کے بعد توہین عدالت ایکٹ 2012ء کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دیا جاتا ہے اور توہین عدالت آرڈیننس 2003ء 12 جولائی 2012ء سے نافذ العمل ہوگا۔ اس سے قبل توہین عدالت قانون کے خلاف درخواستوں کی سماعت چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی سربراہی میں 5 رکنی بنچ نے کی۔ اٹارنی جنرل عرفان قادر نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا کہ صدر اور گورنر کے علاوہ کسی کو ذاتی حیثیت میں استثنیٰ حاصل نہیں، نئے قانون کے ذریعے توہین عدالت کی تعریف کے دائرہ کار کو وسعت دی گئی ہے۔ جسٹس خلجی عارف حسین کا کہنا تھا کہ نئے قانون میں توہین عدالت سے متعلق کوئی لفظ موجود ہی نہیں اور آئین کا ہر لفظ بامقصد ہوتا ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے جبکہ آرٹیکل 204 میں عدلیہ کو بدنام کرنے، تضحیک اور نفرت کے الفاظ شامل ہیں۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ وہ آئین سے ایک انچ بھی نہیں ہٹ سکتے جس پر جسٹس جواد ایس خواجہ نے انہیں کہا کہ وہ آئین سے 2، 2 انچ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ اکیڈمک بحث میں نہیں پڑنا، نئے قانون کو ریاضی کے انداز میں دیکھیں گے تو مشکل ہو جائے گی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ نئے قانون کے تحت جوڈیشل پاور رکھنے والا ہر شخص یہ قانون استعمال کر سکتا ہے، نئے قانون میں توہین عدالت کے جرم کی تعریف کو تبدیل کر دیا گیا۔ جسٹس خلجی عارف حسین نے کہا کہ آرٹیکل 204 میں جج اور عدالت علیحدہ علیحدہ استعمال کیے جاتے ہیں، عدالت میں بیٹھا ہوا جج، جج بھی ہوتا ہے اور عدالت بھی لیکن جب جج موٹروے پر گاڑی چلا رہا ہو تو اس وقت صرف جج ہوتا ہے، عدالت نہیں۔ اٹارنی جنرل عرفان قادر نے کہا کہ جج موٹروے پر از خود نوٹس لے گا تو یہ عدالتی حکم ہی ہوگا، وقت آ گیا ہے کہ عدالتیں تحمل سے کام لیں تاکہ جمہوریت مضبوط ہو۔ عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ملک کی ترقی کے لیے چلیں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنا عدالتوں کا کام نہیں، عدالتیں غیر جانبدار ہوتی ہیں اور مک مکا نہیں کیا کرتیں۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ انہوں نے یہ بات مثبت انداز میں کی ہے، اسے منفی انداز میں نہ لیا جائے، سابق وزیراعظم کو ایسے ہی الزامات پر سزا سنائی گئی۔ جسٹس جواد ایس خواجہ نے کہا کہ وہ بار بار سابق وزیراعظم کا تذکرہ نہ کیا کریں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ انہوں نے تو اپنی سزا کے خلاف اپیل بھی نہیں کی۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ وزیراعظم نے اپیل نہ کر کے بالکل ٹھیک کام کیا۔ جسٹس جواد ایس خواجہ نے کہا کہ بلوچستان میں ایک چرسی کو سزا ہوئی، اس نے سزا کاٹنے کے بعد اپیل کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹارنی جنرل کے دلائل مکمل ہونے پر سپریم کورٹ نے فیصلہ محفوظ کر لیا۔ بعدازاں 21 صفحات پر مشتمل مختصر فیصلہ سناتے ہوئے عدالت نے توہین عدالت آئین کے خلاف دائر درخواستیں قابل سماعت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کی وجوہات بعد میں بتائی جائیں گی۔

فیصل رضا عابدی

فیصل رضا عابدی مارچ 2009ء سے سینٹ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کراچی ڈویژن کے پی پی پی کے صدر رہ چکے ہیں اور اس کے ساتھ پی پی پی کی سنٹرل کمٹی کے ممبر بھی رہے چکے ہیں۔ سید فیصل رضا عابدی الذوالفقار گروپ آف کمپنیز میں بطور چیف ایگزیکٹو 2008ء سے کام کر رہے ہیں۔ وہ سینیٹر کے طور پر کئی کمیٹیوں کے ممبر ہیں۔ فیصل رضا عابدی نے کراچی ڈویژن کی پی پی پی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کراچی کے حالات پر اختلافات کی وجہ سے استعفیٰ دیا ہے مگر ان کے ترجمان کا کہنا ہے کہ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہوئے ہیں۔

فیصل رضا عابدی پیپلز پارٹی کے میڈیا میں بہت ہی اہم ترجمان ہیں۔ وہ ٹی چینلز کے ٹاک شوز میں پیپلز پارٹی کے aggressive رکن گنے جاتے ہیں۔ وہ ٹی وی پر ہاتھوں میں بہت سے کاغذات لے کر آتے ہیں۔ ٹی وی پر بار بار ان کاغذوں کو لہراتے ہیں اور اپنے مخالفین پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہتے ہیں۔ اس کے دوران میں وہ کئی باتیں ایسی کر جاتے ہیں جو ان کے لیے اور ان کی پارٹی کے لیے بھی تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔

پچھلے دنوں انہوں نے ایسی ہی ایک پریس کانفرنس کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ چیف جسٹس آف پاکستان استعفیٰ دیں اور انہوں نے ارسلان افتخار پر بھی کئی الزامات لگائے۔ اس پریس کانفرنس پر ملک میں بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ میڈیا میں بڑا چرچا ہے۔ دیکھیں چیف جسٹس صاحب ان کے خلاف کیا ایکشن لیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی اپنی پارٹی نے اس پریس کانفرنس کا نوٹس لے لیا ہے اور ان کو سینٹرل کمٹی سے فارغ کر دیا ہے۔ تاہم فیصل رضا عابدی نہ صرف عدلیہ اور چیف جسٹس کے خلاف مسلسل محاذ آرائی پر تلے ہوئے ہیں بلکہ اپنی متنازعہ پریس کانفرنس کے بعد بھی مختلف ٹیلی ویژن چینلز پر آ کر چیف جسٹس اور اعلیٰ عدلیہ پر الزامات عائد کر رہے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کو چیلنج کر رہے ہیں کہ ان کے خلاف ایکشن لیا جائے تاہم اب تک سپریم کورٹ نے انتہائی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن سیاسی شہید بننے کے خواہش مند ہر حد تک جانے کو تیار بیٹھے ہیں خواہ اس کیلئے ملک کو بحرانوں کی دلدل میں دھنسا دیا جائے۔

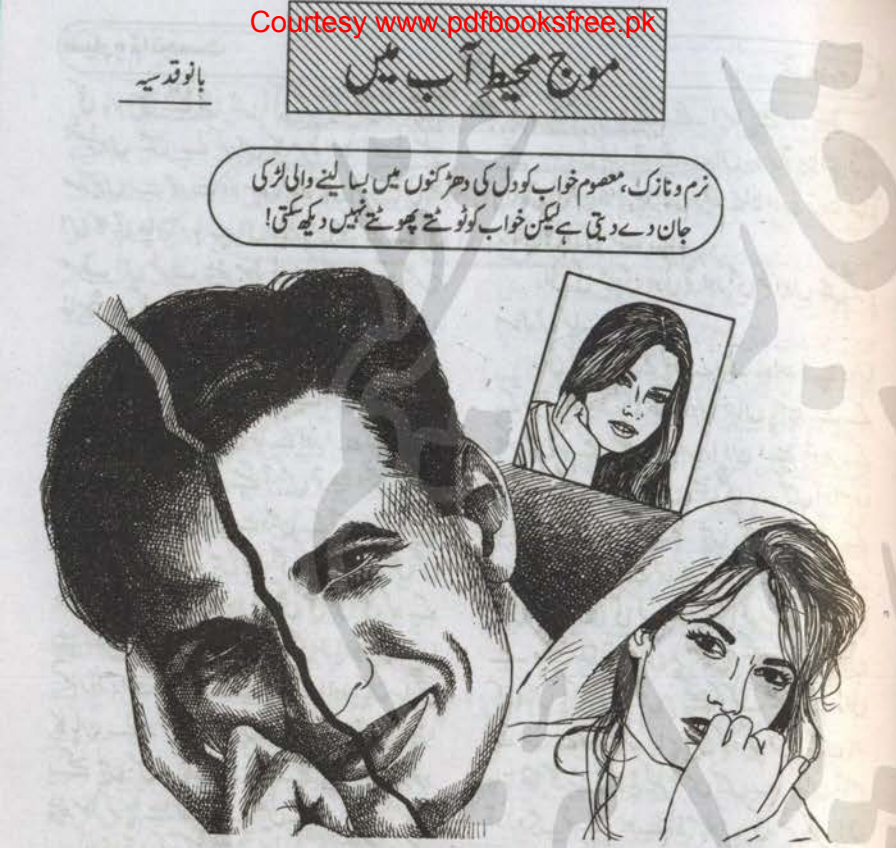

موج محیط آب میں

بانو قدسیہ

نرم و نازک، معصوم خواب کو دل کی دھڑکنوں میں بسا لینے والی لڑکی جان دے دیتی ہے لیکن خواب کو ٹوٹتے پھوٹتے نہیں دیکھ سکتی!

مینا صبح اٹھی تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے زبردستی اسے کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلا دی ہو۔ ساتھ والے بستر پر صرف سلوٹیں تھیں، ریحان صبح سویرے باہر نکل گیا تھا۔ اس نے گوٹے کے جال والے سرخ دوپٹے کے کونے سے دانت صاف کیے۔ پر دانت اسی طرح کرکرا رہے تھے۔ اس نے سرہانے پڑے ہوئے گلاس سے دو چار گھونٹ باسی پانی کے چڑھا لیے۔ اب بھی دانتوں میں سے ریت کرکرانے کی آواز سی آ رہی تھی۔ سارا جسم کسی ایسے پہلوان کے جسم کی طرح جھوٹا پڑ گیا تھا جو اوپر تلے ایک ہی دنگل میں تین چار بار پچھاڑیں کھا کر گرا ہو۔ ہاتھ بند کرتی تو پوریں دکھنے لگتیں۔ کھول کر ہتھیلی دیکھتی تو ہتھیلی اور کلائی میں چکمیں سی پھوٹنے لگتیں۔ گردن کی تو جیسے چوبندی کسی گئی تھی۔ جس رُخ بھی موڑتی کڑڑ کڑ سی آواز نکلتی.....

ساتھ والی تپائی پر جگ مگ کرتے گلوبند، کڑے، نیکلس، جھومر، رانی ہار پڑے تھے۔ اس سارے زیور کے لیے اسے گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں جیولرز کے کتنے چکر لگانے پڑے تھے۔ کندن کے سیٹ پر کیا کیا جھگڑا ہوا تھا؟ رانی ہار کی کڑھائی سے وہ کتنی نالاں ہوئی تھی۔ جھومر میں سفید صراحی دار موتی نہ لگ پائے تھے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھل چھلا اُٹھی تھیں..... اور اب سارا زیور تپائی پر خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے وقعت پڑا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ایک ایک زیور کو ہتھیلیوں میں لے کر ان کا مرنڈا بنا ڈالے لیکن صدیوں سے عورت وہ سب کچھ نہیں کرتی آئی جو اس کا جی چاہتا رہا ہے اسی لیے اس عورت نے بھی صرف اس طرف پیٹھ موڑ لی اور لمبی سی آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

سارا قصور اس کی بہنوں کا تھا جس گھر میں چار بڑی بہنیں ہوں اور ایک سے ایک منہ پھٹ، پیٹ کی ہلکی ہو وہاں مینا بیاہی جائے اور اسے کچھ بھی علم نہ ہو۔ جب بڑی آپا میکے آئیں تو مینا ابھی چھوٹی تھی۔ پر جیسا کہ رواج ہے دلہن کے آس پاس بچے بہت منڈلایا کرتے ہیں مینا بھی کہیں قریب ہی تھی جب بڑی آپا نے سہیلیوں کو کھی کھی کھی کھی کر کے بتایا..... ''شرماتے تو وہ مجھ سے بھی زیادہ ہیں۔ خدا قسم روز رات کو میرے لیے ایک گجرا اور ایک سانچی کا پان لے کر آتے ہیں پر کوئی میرے ہاتھ پر تھوڑا رکھتے ہیں بس سرہانے پر رکھ دیتے ہیں..... اور خود پیٹھ موڑ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔''

بڑی آپا کی سہیلی نے پسلیوں میں گدگدی کر کے پوچھا..... ''ہاں پیٹھ موڑ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں اتنے ہی بھولے بے چارے۔''

بڑی آپا نے بالوں کی پن سے ناخن کرید کر جواب دیا ''خدا قسم ذرا آنکھ مل جائے تو ان کا چہرہ شہابی ہو جاتا ہے۔ یہ تو ایسے ہی باتیں ہیں۔ مرد وہ کچھ نہیں ہوتے جو تم سمجھتی ہو۔ خدا قسم اتنی محبت دیتے ہیں، اتنی تعریف کرتے ہیں، اتنے بچے جاتے ہیں کہ سب کچھ ہو جاتا ہے اور علم ہی نہیں ہوتا!''

بیچاری مینا سمجھ نہ پائی کہ سب کچھ کیا ہو جاتا ہے جس کا علم نہیں ہو پاتا لیکن اتنا ضرور طے ہو گیا کہ شوہر ہمیشہ سانچی کے پان اور موتیا کے خوشبودار گجرے لاتے ہیں۔ ویسے بھی مینا کے گھر میں سب تن پیٹ کا مزا جانتے تھے۔ اچھا پہنتے اور سلیقے سے اعلیٰ..... بری کھاتے تھے۔ یہاں رہ کر تو مینا اسی قدر سمجھ پائی تھی کہ ہر گھر میں اچھا پہننا اور تر تراتا کھانا زندگی کی آدھی جنت ہے۔

رانی کی شادی ہوئی تو اور بھی خوابوں میں گرم مسالہ مل گیا۔

رانی کو شادی کے پورے ایک ماہ بعد اپنے دولہا کے ساتھ انگلینڈ جانا تھا۔ دولہا جہاں پاسپورٹ کے چکر میں رہتے تھے رانی سارا دن اپنے شوہر کے ساتھ شاپنگ کرنے بھاگی رہتی تھی..... کہیں آرام دہ جوتے خریدے جا رہے ہیں کہیں انگلینڈ کے دوستوں کے لیے تحفے تحائف کا انتخاب ہو رہا ہے۔ کبھی گھر والوں کی فرمائشوں کی فہرست بن رہی ہے۔ وقت ملتا تو فلموں پر فلمیں دیکھی جا رہی ہیں کہ وہاں پاکستانی فلمیں دیکھنے کو کب ملیں گی۔ رانی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا پر اس کو دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا تھا کہ شادی ڈیڈ لیٹر آفس نہیں ہے جہاں تمام آرزوئیں ٹوٹے ہوئے ڈھیلوں کی طرح پڑی ہوں۔

آسیہ باجی کے ویسے پر وہ پہنچی تو نظارہ ہی خیرہ کن تھا۔ آسیہ باجی میک اپ کر رہی تھیں اور دولہا بھائی ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے کبھی پنیں پکڑاتے تھے کبھی لپ سٹک کا ڈھکنا کھول کر دیتے تھے۔ باجی کی قمیص پر کبھی سی زپ تھی سو بھائی جان نے خود بند کی اور خدا جانے آسیہ باجی کے کان میں کیا کہا کہ وہ کان ناک آنکھیں سرخ کیے پتنگ کی طرح ڈولنے لگیں۔ آسیہ باجی کا دولہا ویسے بھی مینا کو بہت پسند آیا تھا۔ ایسی ہری بھری گفتگو کرتا کہ سارے گھر والے چرند پرندے بنے اس کی ہریالی میں چونچیں مارتے پھرتے تھے۔ کبھی دولہن والے کمرے کو چین نہیں لگی کبھی آسیہ باجی اور دولہا بھائی اکیلے نہیں

بیٹھے۔ ایک بار رات ایک جلوس ایک مشاعرہ ایک پلیٹ فارم کا سا منظر ہوتا تھا۔ دولہا بھائی کے آنے پر سب بیٹھے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے سامنے پروگرام پر تبصرہ جاری ہے۔ دولہا بھائی اور آسیہ باجی کی نظریں بار بار ایک دوسرے کی طرف ہرکارے دوڑا رہی ہیں۔ جو بات باجی کو پسند آتی ہے وہ کھٹ سے دولہا بھائی کو دیکھتی ہیں۔ وہاں سے جوابی مہر لگ کر ایک رائے ہو جاتی ہے۔ جلوت میں خلوت کے مزے ہیں۔ بھری محفل میں معاشقہ جاری ہے۔ آم کھائے جا رہے ہیں۔ ہر میٹھا آم جو باجی کو ملتا ہے وہ دولہا بھائی تک پہنچ جاتا ہے جو میٹھا آم بھائی جان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے باجی چوستی نظر آتی ہیں۔ ہر طرف بغیر چومے بوسے ہی بوسے ہیں۔ ہر طرف عشق ہی عشق ہے اور ایک لمس بھی نظر نہیں آتا۔

جو رہی سہی کسر تھی وہ گلابی کی شادی نے پوری کر دی۔

گلابی تو شادی کے بعد اور بھی گلاب جیسی ہو گئی۔ شوہر اس کا فوٹو گرافر تھا۔ پہلی رات اس نے سارا وقت فلیش سے دلہن کی تصویریں کھینچنے میں بسر کی۔ کبھی جھومر اُتار کر کبھی ٹیکہ پہنا کر۔ کبھی دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے کبھی کھڑکی میں بٹھا کر تصویریں کھینچی گئیں۔ شادی کو ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ گلابی کی ایک بڑی سی تصویر ملک کے مشہور رسالے کا سرورق بن کر بھی آ گئی۔ دونوں اوپر تلے کے بچوں کی طرح خوب خوب ایسی تیسی قسم کی لڑائی لڑتے پھر ڈارک روم میں اکٹھے گھس جاتے تھے۔ باہر نکلتے تو کبھی بھیا جی کے ماتھے پر لپ سٹک کا نشان ہوتا کبھی باجی گریبان کے بٹن بند کرتی باہر نکلتیں۔

کچھ تو ماحول کا فرق کہیے کہ مینا کے سسرال میں ڈھائی ٹوٹرو تھے سو بھی کدورتوں سے دل میلے کیے رہیں میں یوں باتیں کرتے جیسے دشمن ملکوں کے ایمبیسیڈر ہوں۔ چہرے پر دل نوازی رہتی اور دل سوکھے متے کی طرح چرمر رہتا۔ ویسے بھی مینا ایسے گھر سے گئی تھی جہاں باتوں کے اکھاڑے میں لوگ ایک دوسرے کو پچھاڑتے تھے پر زندگی کے ہر مشکل مقام پر دانتوں کی طرح جڑ جاتے تھے۔ سارے گھر والے تن تازہ قلندر راجہ قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہندوؤں کی طرح کچھ تناسخ کے مسئلے پر ان کا اعتماد نہ تھا۔ کھری کھری اس زندگی کو بسر کیا کرتے تھے۔ کسی کا بُرا اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ بُرا کرنے یا سوچنے میں جو وقت، تندہی اور ذہنی کوفت اٹھانا پڑتی ہے اس کے نہ وہ لوگ اہل تھے نہ قائل۔ نہ گھر میں کبھی تن پھن دیکھی نہ ایسی باتوں کی سمجھ ہی آئی کہ دنیا میں ہر رنگ ہر قماش ہر ذہنیت کا آدمی موجود ہے، اور اصل میں ہر بھانت کے آدمی کے ساتھ گزارا کرنا اور اپنے سے مختلف سمت میں دیکھ سکنے ہی کا نام زندگی ہے۔ مینا کے میکے میں سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی مایوسیاں زندگی کے ایسے سمجھی جاتی تھیں۔ کسی فلم کا ہاؤس فل ہو جانے پر یہ لوگ پہنچے اور ٹکٹیں نہ ملیں یا درزی قمیص سی کر لایا تو کالر کی جگہ اس نے گول گلا بنا دیا۔ پھر جب ابا جان نے تین داڑھیں اکٹھی نکلوائی تھیں اور کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ برسوں نہ بھولنے والے دل شکن المیے تھے۔ عجیب اتفاق ہے لیکن بدنصیبی کا ہاتھ اس گھر پر بہت ہلکا پڑا تھا اسی لیے مینا سمجھ نہ سکتی تھی کہ قسمت کسی کسی گھرانے کے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک بھی کیا کرتی ہے۔ بدقسمتی کے واقعے سب اخبار کی باتیں تھیں جن کو پڑھ کر سب گھڑی دو گھڑی کو تت تت کر لیا کرتے تھے پھر اس کمبخت بسیرے کے بعد وہی دلائی کی سی گرم زندگی.....

قصور بہنوں کا تھا یا پچھلی زندگی کا۔ اس کی چھوٹی سی بیاض کا تھا یا سہیلیوں کا بہرکیف سارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنگن ٹیڑھا تھا جس میں اسے ناچنے کے لیے بغیر کسی تیاری کے بھیج دیا گیا تھا۔

رات جب اسے حجلۂ عروسی میں داخل کیا گیا تو پورے چھ گھنٹے کی تیاری سے اس کی کمر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ صبح ہیئر ڈریسر کے پاس جو دو گھنٹے کمر اکڑا کر بیٹھی رہی سو الگ۔ زیور پہننے کی عادی نہ تھی پر اس وقت جو چمکتا دمکتا زیور اس پر لدا تھا اس کے بوجھ سے اسے عجیب قسم کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس کے معطر وجود کے ساتھ ساتھ گلاب اور موتیے کے پھولوں نے روزمرہ سے ہٹ کر ایک فضا پیدا کر رکھی تھی۔ کئی دلہنیں اس کے سامنے یوں کمروں میں بند کی گئیں اور کئی دلہنوں کو اس نے صبح سویرے کسمساتے، لجاتے، گلابی گلابی آنکھوں سے نظریں چراتے دیکھا تھا پھر بھلا اردو لٹریچر کا اردو کی غزلیہ شاعری کا جس نے اس کے دماغ میں قند گھول رکھی تھی وہ اس وقت بالکل اس چڑیا کی طرح بیٹھی تھی جو ناشتہ کی میز سے کچھ فاصلے پر بیٹھی یہ سوچتی رہے کہ اُڑان کیسی ہو کہ چونچ بھر چینی بھی مل جائے اور میں پکڑی بھی نہ جاؤں۔ عجیب قسم کا خوف، پہلی علانیہ چوری کا احساس، میکے گھر کی کبھی بجھی یاد، سسرال والوں کا پرتپاک خیرمقدم، نئی زندگی سے ان گنت ذہنی وابستگیاں، گئے زمانے سے کئی طریقے کے الوداعی دست پنجے..... کیا کچھ تھا جو اس لمحے رینگ رینگ کر اس پر سوار نہ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ گھبرا کر غسلخانے کی جانب دیکھتی جس میں نیلے رنگ کا زیرو کا بلب روشن تھا اور کئی بار وہ بڑے دروازے کی طرف پرامید نظروں سے جھانکتی جدھر سے اس کے دولہا کو آنا تھا۔

جب دولہا حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو وہ اپنے خیالات کی رو میں دو ایک بار لمبا لمبا اونگھ بھی چکی تھی۔ ریحان اپنی فوٹو سے زیادہ خوش شکل اور وجیہہ تھا۔ اس وقت زری کی اچکن اور چست پاجامے میں وہ کچھ اچکا اچکا سا نظر آتا تھا لیکن ایک نظر میں مینا نے بھانپ لیا کہ دولہا اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔

یہ اس کی انا کے لیے پہلا دھکا تھا۔

مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جو پہن لگا کر، اوڑھ بنا کر، چھین جھپٹ سے خوبصورت عورتوں میں شامل ہو جایا کرتی ہیں۔ کپڑا زیور اور میک اپ اس کی ذات پر خوب کھلتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو سو کر اٹھیں تو بے اختیار پیار کرنے کو جی نہ چاہے۔

ریحان نے خاموشی سے گلے کے سارے ہار کرسی پر ڈال دیئے اور لمبی سی جمائی لے کر کہا ''یہ مشرقی شادیاں بڑی تھکا دینے والی..... اور احمقانہ ہوتی ہیں۔ سب کچھ اتنا Un-real اور Silly ہوتا ہے۔ آپ نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے.....؟''

ریحان جو کچھ کہہ رہا تھا درست تھا۔ جس طرح کہہ رہا تھا اس میں کوئی خرابی نہ تھی صرف اس کی آواز میں جو لاتعلقی، اکتاہٹ اور برتری تھی اس سے معاً مینا کو خوف آ گیا۔

ریحان نے کمرے کی بتی بند کر کے پھر اسی آواز میں کہا..... ''آپ یہ گھوڑے کا ساز سب اُتار دیں اور کوئی نائٹ سوٹ وغیرہ پہن لیں میں ابھی آتا ہوں۔''

غسلخانے کا دروازہ بند ہونے پر نیلے رنگ کے بلب کی روشنی بھی بند ہو گئی۔

گرم گرم آنسو خدا جانے کہاں کی قید سے نکل کر آنکھوں سے بھاگے.....

مینا نے کچھ غصے کچھ ناامیدی کچھ عجیب قسم کے رنج سے ایک ایک زیور تن سے اُتار کر اندھیرے میں تپائی پر ڈھیر کر دیا۔ سہیلیوں نے اس کا ٹیکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالوں کی پنوں سے اتنے احتیاط سے نکالا تھا کہ اسے نوچ کر علیحدہ کرنے میں اس کے ہیئر سٹائل کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ اندھیرے ہی میں اس نے اپنی نقلی پلکیں اور گردن پر بیٹھے ہوئے Bubbles کا جوڑا اُتار کر رکھ دیا۔ سوٹ کیس میں سے نائٹ سوٹ نکالا اور اسے یوں پہن لیا جیسے ابو کے کہنے پر وہ دوائی پی لیا کرتی تھی۔

جب غسلخانے کا دروازہ کھلا تو ریحان صرف پاجامے میں ملبوس تھا۔ چھاتی کے بال کندھے کے بالوں سے جا ملے تھے۔ سب کچھ خواب کی طرح بے حقیقت سا تو تھا لیکن اتنا خوبصورت نہ تھا۔

"THAT's BETTER" ریحان نے زیرو بلب کی نیلی روشنی میں اسے گیشا گرل کی طرح بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"خدا جانے دلہنوں کو اس قدر بیوقوفانہ طریقے پر سجانے کا کیا مطلب ہے؟..... آپ فین پسند کرتی ہیں کہ بند کر دوں....."

لیکن ابھی مینا جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ ریحان نے پنکھے کا سوئچ بند کر دیا۔

نیلے رنگ کی روشنی میں اسے اپنا کمرہ کسی UNDER WORLD کی طرح نظر آنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا اسے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگے۔

رات بھر وہ جاگتے سوتے میں عجیب عجیب جگہوں پر معلق رہی۔ کبھی وہ خواب میں سوچتی ابھی وہ اُٹھے گی اور امی اسے ناشتے کے لیے بلا رہی ہوں گی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ مر چکی ہے اور کسی ایسی جگہ، کسی ایسی غار میں محبوس ہے جس کے سامنے آہنی پھاٹک ہیں۔ ہیئر ڈریسر کا چٹخی چہرہ منہ میں لمبی لمبی جوڑے کی پنیں لیے اس پر جھکتا ہی چلا آتا۔

اب اسے گرم پانی میں باتھ سالٹ ملا کر نہلایا جا رہا ہے۔ اس کے بدن سے ابٹن کی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ تولیہ سارا کولون میں مہکا ہوا ہے۔ سہیلیاں مہندی لگا رہی ہیں۔ کیوٹکس ذرا سی ہل جائے تو REMOVER سے روئی سیلی کر کے کیوٹکس اُتارا جا رہا ہے۔ ذرا سا ٹیپ چھو جانے پر دو دو چار چار چہرے اس کا حسن آنکتے اور بینتے ہیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کتنی اہم محسوس کر رہی ہے۔ سب نظریں اس پر مرکوز ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں "کتنا روپ چڑھا ہے مینا کو سب بہنوں کو مات کر گئی مینا۔"

اس کے ساتھ والے پلنگ پر ریحان اوندھا سو رہا تھا۔ اس کی پشت پر بال اس طرح پھیلے تھے جیسے جغرافیے کے نقشوں میں پہاڑوں کے نشان ہوتے ہیں۔ چھدرے چھدرے کنگھجوروں کی طرح شمال سے جنوب پھیلے ہوئے۔

مینا کئی بار سوئی کئی بار جاگی۔ ہر بار جب اس کی آنکھ کھلتی ایک تمتماتا ہوا سرخ و سفید چہرہ اس پر جھکا ہوتا۔ زیرو کے نیلے بلب میں یہ خوبصورت شکل اسے ڈریکولا سی نظر آتی جو اس کی گردن سے لہو چوسنے جھکی چلی آتی، جھکی چلی آتی۔

وہ خوف سے آنکھیں بند کر کے اپنے ناخن سنبل کے تکیے میں سر کے نیچے گڑھ دیتی۔ اس خوف سے وہ تکیے کو زخمی کرتی رہتی کہ اگر اس کے ہاتھ آزاد ہوئے تو کہیں وہ اس تمتماتے چہرے کے کندن کو نہ کھرچ ڈالے۔ سارا کمرہ کسی ویٹنگ روم کی طرح بند بند تھا۔ اسی گھٹن میں صبح ہو گئی۔

مینا نے کئی بار پانی پیا لیکن بار بار اسے یونہی لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلا دی ہو، اور سارے دانت کرکرا رہے ہوں۔

اس رات کے بعد مینا جیسے گہنا سی گئی۔ کبھی سوچتی گھر جا کر سب کچھ بتاؤں گی۔ پھر سوچتی آخر

بتانے کو ہے کیا؟ کوئی کیا سمجھے گا؟ اتنی روٹی کو چوچی کہنے والی تو میں بھی نہ تھی۔ سب جانتی تھی کہ بالآخر یہی کچھ ماحصل ہے؟

لیکن..... پھر دل پوچھتا کہ بالآخر سے پہلے..... اور پہلے..... اور پہلے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی نظروں میں سانچی پان گھومتے کبھی گجرے مہکتے۔ پاسپورٹ کے ورق پر واکنگ شوز پہنے آسیہ باجی گھومنے لگتیں۔ رسالے پر چھپی ہوئی گلابی کی تصویر نظروں کے سامنے گھومتی اور گھومتی چلی جاتی۔ گھر جا کر کس چیز کا گلہ کرے؟

گھر جا کر ماں کے کندھے سے لگ کر کیا کہے؟ ماں کیسے سمجھے گی، بہنیں کب جان سکیں گی کہ مینا اس سوئی کی مانند ہے جسے بچے پٹڑی پر رکھ کر بھول جاتے ہیں اور جس پر سے منوں بوجھل ٹرین چھکا چھک کر کے میلوں دور نکل جاتی ہے۔

سسرال میں اسے کوئی ایسی تکلیف نہ تھی جسے وہ انگلیوں پر گن کر کہہ سکتی ایک دو..... تین..... اس کا سب کچھ سینما سکرین کی طرح تھا۔ ہر طرح کی خوبصورت خوش آئند دلچسپ تصویریں بن رہی تھیں مٹ رہی تھیں پر ایک بھی تصویر، ایک بھی ہیولا اس کورے لٹھے کی سکرین میں جذب ہو کر نہ رہتا تھا۔ سسرال تو اس گھٹی جوتی کی مانند تھی جسے پہنو تو پتہ نہ دے کہ وہ کہاں سے چبھتی ہے پر اُتار دو تو پاؤں من من کا ہو جائے۔ اس کے باوجود وہ میکے گھر جا کر واپس چلی آتی اس کا جی ڈرتا تھا کہ اگر اس نے کسی سے بات کی تو کوئی بھی اس کی پریشانی کو نہ سمجھ پائے گا۔

ان ہی دنوں مینا نے کپڑا زیور پہننا چھوڑ دیا۔ اس کے شوہر کو تو بہت خوشی ہوئی پر ساس بہت تلملائیں۔ مینا میکے سے اپنے کنوارپنے کے کپڑے اُٹھا لائی تھی۔ اب وہی لٹھے کی شلوار اور چنا ہوا چنچل کا دوپٹہ اوڑھے وہ بڑی بے ضرر سی، نامعلوم سی اچھی سی لڑکی نظر آتی۔ وہ دلی مارنے والیوں میں سے نہیں تھی۔ اونگی سی ہتھنی اور ٹنڈیوں کا کاٹا پیٹا دوپٹہ اوڑھے وہ گھر میں اونچے طبقے کی ملازمہ لگتی۔ ایسی ملازمہ جو زرخرید بھی ہو۔

یوں گرگٹ کی طرح بدرنگ ہو کر تو پڑی رہتی پر آنکھوں پر اس کا بس نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یہ بھاری پپوٹے والی ہلکی شربتی آنکھیں بڑی چمکیلی اور کٹاری سی تھیں۔ اب مینا کی زود حسی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ رو رو کر آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ کہاں تو وہ ایسے گھر سے آئی تھی جو ہر حال میں زندہ رہنے کا قائل تھا۔ کہاں اب وہ یہ سوچ سوچ کر نیم پاگل ہو گئی کہ صبر کر مینا اچھے دن آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ کبھی کبھی اللہ کے خوف سے سہم جاتی کہ کہیں یہ سب کچھ کفران نعمت ہی میں شامل نہ ہو جائے۔ پھر جب دل پر کوئی کوچا سا مارتا، راتوں کی تنہائیاں دن کو یاد آتیں تو دل پتی پتی ہو کر بکھر جاتا۔

پہلے پہل تو مینا اپنے شوہر کے سامنے دو چار مرتبہ یونہی بے ضبط سی رو دی۔ ریحان نے بڑی انجانی آواز میں ہمیشہ ایک ہی بات کہی "تم بہت TOUCHY ہو آخر ہوا کیا ہے؟"

ریحان ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو ناقص العقل سمجھتے ہیں اور اسی لیے جب کبھی عورت روتی ہے تو اسے اس کی کمزوری اور حماقت سمجھ کر تکلیف کی وجہ کبھی دریافت نہیں کرتے۔

ریحان کو منانے کا بس ایک ہی طریقہ آتا..... یعنی مینا کے کندھے پر ہاتھ رکھتا، اپنے کمرے میں لے جاتا اور اندر سے کنڈی چڑھا لیتا۔ اس کی مردانگی ایک ایسی فوج سے مشابہ تھی جو ہر شہر کی فصیل، ہر مندر کا دروازہ، ہر درے کا منہ، ہر ریاست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی شہر پناہ اپنے زور بازو سے کھولنے کی عادی ہو۔ ریحان کے نزدیک کوئی عورت اس کے ساتھ سونے کے بعد نہ اس سے نہ دنیا سے ناراض رہ سکتی تھی۔ اس کے جسمانی وجود پر عورت کی صحت، خوشی اور قناعت کا انحصار تھا۔ وہ جسمانی رابطے کے توسط سے مینا کو جان پایا تھا اور بس..... اس میل کے بعد وہ دونوں ایک ہی کمرے میں اجنبیوں کی طرح گھنٹوں بیٹھے رہ سکتے تھے۔ اس طرح کے منانے کے بعد وہ ہمیشہ یہی کہتا ''لے اب دو چار دن تو نہیں روئے گی۔'' یہ اور بات ہے کہ مینا کو اس کے بعد ہی اور طغیانی سے آنسو آتے۔

کچھ عرصہ تو مینا کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ تھا پر جب اسے ہر بار ایک ہی نتیجہ بھگتنا پڑتا تو وہ محتاط ہوگئی۔ اب ریحان کی موجودگی میں وہ سوجی سوجی آنکھیں تو لیے پھرتی پر ہمدردی سے کنی کترائے رہتی۔

مینا کی ساس کو ایسی گم سم کام کرنے والی سادہ صورت سادہ سیرت بہو پہلے نہ ملی تھی۔ اتنے ماڈرن زمانے میں ایسی پتی برتاتی ساوتری سے گھر کے تمام کام..... نکلتے تھے۔ اسی لیے اسے یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں جو ریحان سے مینا کی نہ بنی تو اچھا کام کرنے والا ایک فرد گھر سے کم ہو جائے گا۔ کچھ کچھ شک و شبہ تو اس کو پڑتا ہی رہتا تھا پر نہ بہو منہ کھولتی تھی نہ ساس اتنی دل والی تھی کہ بڑھ کر بہو کو گلے سے لگا لیتی۔ کبھی مینا کا اُترا سا چہرہ دیکھ کر وہ ریحان سے کہتی ''اسے کوئی فلم ہی دکھلا۔ سیر کرا لا اسے۔ سارا دن کاموں میں رجھی رہتی ہے۔''

ہر بار سیر سپاٹے کا بھی وہی نتیجہ نکلتا جو رونے دھونے کا نکلا کرتا تھا۔ اسی لیے مینا نے باہر جانا چھوڑ دیا۔

جب پہلی بار ریحان نے اس پر کیچڑ اچھالی تو وہ ایسے پکڑی گئی جیسے چھکا مارا ہو اور آگے سے کیچ ہو جائے۔ وہ خوب رو دھو کر غسلخانے سے نکلی تھی کہ ٹیلری میں ساس اور ریحان مل گئے۔ وہ دونوں ایک سپیڈ سے پان چبا رہے تھے۔

ساس پسیج کر بولی ''ریحان اسے کہیں لے جا۔ دیکھ تو کیسی اُداس ہو رہی ہے۔''

ریحان خدا جانے کیسا بھرا بیٹھا تھا، پھٹ پڑا..... ''اس کی اُداسی دُور کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ خدا جانے کن یاروں کو یاد کرتی رہتی ہے سارا دن۔ اس کا دل شروع دن سے مجھ سے نہیں ملا اماں جی۔ اسے تو وہ بدبخت اپنی بیاض مجھ سے پیاری ہے۔ اسے کبھی سوٹ کیس میں کبھی دراز میں سنبھالتی پھرتی ہے۔ میرا اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ..... زندہ ہوں یا مر گیا۔''

ریحان تو یہ کہہ کر چلا گیا لیکن دنیا اس کی نظر میں فیڈ آؤٹ ہوگئی۔ وہ جو زندگی اور موت کے درمیان ہونکتی رہتی تھی۔ اس کا صلہ یہ تھا جہاں بیٹھتی ریحان کی بات انی کی طرح کھچ دل میں اُتر جاتی۔ کالج کی سہیلیاں آنسوؤں کے ترمروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر بہتیں۔

''یہ تو بلبل ہزار داستان ہے۔ دیوانہ ہو جائے گا وہ..... دیوانہ۔''

''ہماری مینا تو شہزاد ہے۔ ایک سے ایک کہانی سنائے گی ریحان کو۔''

''اس کی باتیں تو مصری کی ڈلیاں ہیں۔ برفی کی ٹکڑی ہے ہماری مینا..... برفی کی ٹکڑی.....''

ریحان تک وہ جب بھی پہنچی، ''چھینا جھپٹی'' کے عالم میں پہنچی۔ ان کے درمیان آشنائی کا نظارہ ہوتا اور بعد میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ ریحان کے ذہن کے سامنے اتنے دبیز پردے اتنے سنگین پہرے اتنی رکاوٹیں تھیں کہ مینا آگے بڑھتی اور پھر منجمد ہو کر رہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتی جیسے دو آدمی جو ایک دوسرے کی بولی نہ جانتے ہوں اور ایک لمبے سفر پر ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیں۔ وہ بھی اسی لاتعلقی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد ساس صاحبہ نے اپنا بہشتی زیور کھولا۔

ساس کی باقی تمام بہوئیں انہیں کٹے ہوئے ناخن جیسا بے وقعت سمجھتی تھیں۔ مینا کو سمجھانے اور عقل سکھانے کے مواقع بہم آئے تو اپنی اہمیت سے ہی بوکھلا اٹھیں۔ مجازی خدا کے فلسفے سے لے کر جنازہ جائز ہونے تک، بہشت میں کریڈٹ کارڈ کے طور پر استعمال کرنے سے لے کر سوسائٹی میں ویزے کے طور پر دکھانے کے تمام فوائد تفصیلی اور اجمالی طور پر اسے سمجھائے۔ ہر بات کے انجام میں مینا یہی کہتی ''میں اماں جی کوئی شکایت کرتی ہوں کہ آپ مجھے سمجھا رہی ہیں۔''

''ناں بیٹی۔ تیرے چہرے سے لگتا ہے کہ تُو خوش نہیں۔ بیٹا شوہر کی ایک خوشی سے ستر ثواب ملتے ہیں۔''

اس حساب سے وہ بے حساب ثواب کما چکی تھی۔

''آپ کو وہم ہے جی میری طبیعت ہی ایسی ہے۔''

ساس اور بھی ملنسار، پیاری اور رواں ہو کر کہتی ''عورتوں کو ہزار شوق ہوتے ہیں۔ شوہر دفتر سے آنے والا ہو تو لاکھ بناؤ سنگھار ہوتا ہے۔ دل میں ایک ولولہ ہوتا ہے۔ ایک شوق۔''

''بس جی مجھے شروع ہی سے ایسی باتوں کا شوق نہیں تھا۔''

جب ساس کو یقین ہو گیا کہ بہو کو ایسی باتوں کا شوق نہیں ہے تو اب وہ سچے دل سے اپنے بیٹے پر ترس کھانے لگی۔ جب بہو ہی موئی برف کا تودہ ہو تو بے چارہ صحت مند لڑکا کیا کرے۔ اب وہ ہر آنے جانے والی سے یہی کہتیں ''ہمیں تو فرشتہ مل گیا ہے خدا قسم۔ نہ کسی کے تین میں نہ تیرہ میں۔ پر کیا کریں مرد تو فرشتوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے ناں۔ اس کے تو وچار ہی عورتوں جیسے نہیں ہیں۔ اسے کچھ خیال ہی نہیں مرد چاہے باہر کھے کھا آئے۔ چپکی بیٹھی رہے گی یہ تو۔''

کچھ سالوں بعد جب کوئی ننھا منا بھی گھر نہ آیا اور ریحان گھر کی بجائے مستقل طور پر باہر کھے کھانے لگا تو ساس نے ایک دن مینا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''خدا کی قسم اگر میری بات سے تیرا دل ٹوٹتا ہو تو صاف صاف مجھے بتا دینا تُو تو ولی ہے انسان نہیں ہے اور تیرا دل میں دکھانا نہیں چاہتی۔ بہت باتیں سنی ہیں میں نے ریحان کے متعلق۔ اگر تو اجازت دے تو اس کا بیاہ کر دیں کہیں کم از کم شام کو تو گھر واپس آ جایا کرے گا۔ تیری مہربانی سے ریحان بچ سکتا ہے۔''

مینا نے شور کیا نہ آنسو بہائے نہ گھر جانے کی دھمکی دی نہ اپنے پر ترس کھایا اور چپ چاپ دوسری شادی کی اجازت دے دی۔

شادی کی رات مینا پر عجیب گزری۔

وہ کبھی سوتیا ڈاہ میں جل کر سوچتی..... آبی بی تُو بھی اس آگ کا مزہ چکھ دیکھے تو اس بھٹی کی آگ کیسی ہے؟''

پھر نکھر جاتی اور سوچتی..... کل گھر چلی جاؤں گی۔ مہینہ مہینہ بھر بھی ایک بہن کے گھر رہوں تو چار مہینے تو یہ پار ہو گئے۔

پھر خیال آیا، صبح مجھے ریحان کو مبارکباد دینی چاہیے کہ نہیں۔

کبھی اپنی شادی کی رات ذہن میں گھومنے

لگتی۔ کتنا سرخ و سپید رنگ تھا ریحان کا کتنا اونچا قد۔ اس کی پیٹھ پر بال اس طرح بیٹھے تھے جیسے نقشے پر کوہ یورال کے نشان۔

کبھی کچھ یاد آتا کبھی کچھ۔ اسی سوچ کی سرحدیں جب آدھی رات سے جا ملیں تو وہ اپنے کمرے سے نکلی اور دولہن والے کمرے کے پچھواڑے چلی گئی۔

کھڑکی بند تھی لیکن لکڑی کی جھری میں سے اندر صاف نظر آ رہا تھا۔

بتی روشن تھی۔

نئی دولہن سارے گہنے پاتے پہنے پلنگ کی پشت سے جے ہوئے گاؤ تکیے پر کہنی جمائے راج ہنس کی طرح بیٹھی تھی اور ہولے ہولے ہنس رہی تھی۔

ریحان کا تین چوتھائی حصہ اس سے چھپا ہوا تھا لیکن چہرے کی ایک پھانک اور آواز صاف آ رہی تھی۔

''کتنے خوبصورت ہاتھ ہیں تمہارے۔ یہ مہندی کس نے لگائی ہے اتنی محبت سے؟ جی چاہتا ہے تمہارے ہاتھ کھا جاؤں کچے۔''

نئی دولہن اتراہٹ سے کہہ رہی تھی ''مجھے تو ایسی باتوں کا شوق ہی نہیں۔ بس سہیلیوں نے مجبور کر کے لگا دی۔ میں ذرا یہ ٹیکہ اُتار دوں۔''

ریحان نے جلدی سے نئی دولہن کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''لگا رہنے دو۔ کتنا اچھا لگتا ہے تمہارے ماتھے پر۔''

''خدا قسم گردن تھک گئی ہے میری۔ کم از کم یہ گلوبند تو اُتار دوں میں؟''

''میری خاطر مجھے آج کی رات اسی طرح نظر آؤ..... میں اپنی دولہن کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں تاکہ..... جب میں بوڑھا ہو جاؤں اور تمہارے بالوں میں سفیدی آ جائے تو..... میں آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اپنی دولہن دیکھ سکوں۔ ہمیشہ.....''

راج ہنس محبت، چاؤ اور تعریف کے پانیوں پر تیر رہا تھا..... اور ریحان اچکن اور چست پاجامہ پہنے اپنے گلے سے ہار اُتار کر اس کے زانو پر رکھ رہا تھا۔

مینا نے صبح ہونے تک کھڑکی کے کئی چکر لگائے۔

دولہن کے کمرے کی بتی ایک بار بھی گل نہ ہوئی اور زیرو بلب کی نیلی روشنی غسل خانے کی دہلیز چھوڑ کر ایک بار بھی اندر نہ آ سکی۔

صبح جب پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر آئی اور ایک مینا چپ چاپ پھاٹک پر بیٹھ کر کریز کرنے لگی تو مینا کی ساس برآمدے میں سینہ کوٹتے ہوئے آئی اور اونچے اونچے بین کرتی بولی ''ہائے میری بھولی بہو ہائے میری سادہ بہو..... میں تو سمجھتی تھی کہ اس کا دل ہی عورتوں جیسا نہیں ہے ہائے میری مینا مر گئی..... ہائے سوتیا ڈاہ میں جل گئی۔ میری مینا..... ہائے میری اُلٹی مت میں سمجھتی تھی اسے ایسی باتوں کا شوق ہی نہیں ہے۔ ہائے میری مینا..... ہائے میری سیدھی بہو..... ہائے میں تو سمجھتی تھی وہ مرد کے سائے سے بھاگتی ہے۔ صرف سلیپنگ پلز کھا کر سو رہنے والی مینا کی آنکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے وہ اب بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ گجرے، سانچی پان اور تصویروں سے لدا ہوا خواب۔ جس میں ایک بھی لمس نہ تھا اور چاروں طرف بوسے ہی بوسے بکھرے تھے۔ اس خواب کی خبر خدا جانے پھاٹک تک کیونکر پہنچی۔ کیونکہ پھاٹک کے پٹ پر بیٹھی مینا نے ایک بار سر اٹھایا۔ زور زور سے چیخی چلائی اور پھر زرد زرد پنجے جھاڑتی ہوا میں اُڑ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال

ناجیہ ملک

چند لمحے خامشی کی نظر ہو گئے پھر وہ خود ہی گویا ہوئی۔ ”میں اس علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں آسمانی بجلی گری ہے، میری نواسیاں میرے ساتھ رہتی تھیں..... وہ بھی پانی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے ددھیال اپنے ماں باپ کی قبر پر گئی تھیں..... پھر واپس نہیں آئیں.....

اک اُجڑی بستی کے سفر کا احوال جو کبھی جنت نظیر کہلاتی تھی

یہ 2007 کے اوائل اپریل کے دن تھے۔ مارچ میں ہونے والی بارشیں قیامت ڈھا کر تھم چکی تھیں۔ سورج کی نرم رو کرنیں آہستہ آہستہ پھیل رہی تھیں۔ وادی نے سبز پوشاک پہن لی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں سے درخت نہا رہے تھے۔ ہر طرف کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ زندگی کے رنگوں سے عاری تھا۔

کیونکہ ان بارشوں نے کشمیر کے ایک حصے میں قیامت ڈھا دی تھی۔ آسمانی بجلی گرنے سے مکین

ہنسی علاج غم ہے

شیر کا شکاری

ایک شکاری ایک خوبصورت عورت کے سامنے اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیروں کے نیچے بچھی ہوئی شیر کی کھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”جہاں تک اس شیر کے شکار کا تعلق ہے، میں نے اسے بنگال میں شکار کیا تھا۔ اس کے شکار میں زندگی کی بازی لگ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یا میں نہیں یا شیر نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ پھر کیا ہوا؟“

”ہاں مجھے کہنا ہی پڑے گا“ اس عورت نے کہا ”آپ جیت گئے کیونکہ قالین شیر کی کھال کا ہی اچھا لگتا ہے۔“

ہم کھانا کھائیں گے

ایک نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے گھر گیا تاکہ وہ اس کے گھرانے سے آگاہ ہو سکے۔ جب اس کے واپس جانے کا وقت آیا تو اس نے اپنی گرل فرینڈ سے سٹیشن تک ساتھ چلنے کی درخواست کی مگر لڑکی نے اپنے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

”نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی۔“

”آخر کیوں نہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”اس لئے کہ جونہی تم رخصت ہو جاؤ گے ہم سب کھانا کھائیں گے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

میں خوبصورت نہیں ہوں

لڑکا: کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟

لڑکی: میں کوئی زیادہ خوبصورت نہیں ہوں۔

لڑکا: مجھے اس کی پرواہ نہیں..... کیونکہ تم تمام دن کام پر رہو گی۔

منگنی

ڈیلا: کیا تم نے نہیں سنا! ایولین نے ابھی ابھی راجر سے شادی کر لی ہے۔ بیلا: نہیں یہ ناممکن ہے۔ راجر سے تو صرف اس کی منگنی ہوئی تھی۔

رائے

”یہ لیجئے اپنا ایک روپیہ جو میں نے پانچ برس قبل آپ سے قرض لیا تھا۔“

”اسے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ اب اتنے عرصے کے بعد ایک روپے کے بدلے مجھے تمہارے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنا اچھا محسوس نہیں ہوتا۔“

ہم پلہ

ایک دوست دوسرے سے: میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک کہ مجھے ایسی لڑکی نہ مل جائے جو ہر لحاظ سے میری ہم پلہ ہو۔

دوسرا دوست: یہ تو کوئی مشکل بات نہیں۔ دنیا میں بیوقوف اور بدصورت لڑکیوں کی کمی نہیں۔

تجویز

ہیری: میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی بھر کسی لڑکی کے سامنے شادی کی تجویز پیش نہیں کروں گا۔

لیری: وہ کیوں؟..... کیا کیری نے تمہاری تجویز رد کر دی؟

ہیری: نہیں..... اس نے تجویز مان لی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے مکانوں سمیت لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ فضا میں سوگواری رچی بسی تھی اور پرندوں کے گیت بھی درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مایوسیوں کی تاریک آندھی چاروں طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔

احتیاط سے قدم اٹھاتی میں پہاڑی سے نیچے اُتر رہی تھی۔ ہر طرف پتھر ہی پتھر تھے یا پھر ملبہ ہی ملبہ۔ لینڈ سلائیڈنگ نے اس علاقے میں بھی تباہی مچادی تھی۔ اس لینڈ سلائیڈنگ میں راستہ اپنے نشان تک کھو چکا تھا۔ ایک ارضیاتی سروے نے اس علاقے کو بھی ریڈ زون پر واقع قرار دیا تھا۔ اس لیے اس زمین پر قدم جما کر چلنا دوبھر تھا۔ یا تو پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنا شروع ہو جاتی یا پھر پاؤں زمین کے اندر دھنسنا شروع ہو جاتے اور دل خوف سے تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیتا۔ 18 اکتوبر 2005 کے زلزلے نے تباہی کے بہت سے دروازے کھول کر امید کی شمع گل کر دی تھی۔ بچپن کی یادوں کو ان بھاری پتھروں نے نگل لیا۔ اب احساسات میں وہ پختگی نہیں رہی تھی اور ہاتھوں میں زندگی سے بے یقینی کے کچھ مرجھائے پھول تھے۔

پہاڑی سے اُتر کر میں سٹاپ پر پہنچی۔ منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ تھکن اور خوف نے کپکپی طاری کر دی تھی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا، دل خوف سے لرز اُٹھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑوں کا دریا بہتے بہتے رُک گیا ہو۔

سلائیڈنگ کا سلسلہ جہاں ختم ہوتا وہیں سے آبادی شروع ہو جاتی۔ سڑک پر پہنچنے کے لیے اس سلائیڈ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

بارشوں کا سلسلہ ختم ہو کر جیسے ہی دھوپ نکلی تو سڑک کا بند راستہ کھول کر زندگی کے کچھ آثار پیدا کئے جانے لگے۔ چونکہ آج راستہ کھلا تھا تو چند لمحوں کے انتظار کے بعد گاڑی بھی مل گئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں باہر کے مناظر میں کھو گئی۔ اتنی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود کشمیر کی اس وادی کا حُسن ماند ضرور پڑا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ دریائے جہلم کی شوریدہ لہریں خوف میں اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔ گاڑی جھٹکے کھاتی تو زندگی ہاتھ سے سرکتی ہوئی محسوس ہوتی، نجانے کون سا موڑ موت کا موڑ ثابت ہو گا۔ لیکن آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اس خیال نے شانت کر دیا کہ زندگی موت کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے نہایت سکون سے گاڑی کی سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اس وقت گاڑی ایک خطرناک موڑ سے گزر رہی تھی۔ تمام افراد دم سادھے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے بائیں جانب بیٹھی بوڑھی عورت کے چہرے پر بکھرتے خوف کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور نظریں ہٹا لیں۔ آگے پھنکارتا ہوا دریائے جہلم آیا۔ بے اختیار میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ معاً اپنے ہاتھوں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میں چونک کر مڑی۔ ایک جھریوں بھرا ہاتھ بڑے پیار سے میرے ہاتھوں میں پکڑی کتابوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا، دکھوں بھری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو جھریوں سے راستہ بناتے نیچے گر رہے تھے۔ آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑتے ہوئے اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری گود میں رکھی کتابوں کو حسرت سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر دکھوں کی ایک گہری تہہ جمی صاف نظر آ رہی تھی۔

''پڑھتی ہو بیٹا.....؟''

''جی.....!'' مختصر جواب دیتے ہوئے حسرت و یاس کی تصویر بنے اس چہرے پر نظریں جمائے میں اپنے سارے لفظ نجانے کہاں کھو چکی تھی۔

بہت سے سوالوں نے لبوں پر آتے آتے ہی

دم توڑ دیا۔ زخم کو کریدنے کا خیال مجھے خود ہی زخم خوردہ کر گیا اور میرے سارے لفظ وہیں دب گئے۔

چند لمحے خامشی کی نظر ہو گئے پھر وہ خود ہی گویا ہوئی۔ ''میں اس علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں آسمانی بجلی گری ہے، میری نو اسیاں میرے ساتھ رہتی تھیں..... وہ بھی پانی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے ددھیال اپنے ماں باپ کی قبر پر گئی تھیں..... پھر واپس نہیں آئیں..... میرا بیٹا ان کے لیے کتابیں بھی لایا تھا..... اپنے سکول بیگ وہ میرے پاس چھوڑ کر گئی تھیں..... وہ بیگ آج بھی میرے پاس رکھے ہیں..... بیٹا! میں ان کتابوں کا کیا کروں؟''

کرب میں ڈوبے اس سوال نے میری زبان گنگ کر دی..... میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا..... ایک آنسو خاموشی سے میری آنکھ سے نکلا اور گود میں رکھی کتابوں پر جا گرا..... دل میں ڈھیروں درد لئے میں گاڑی سے اُترنے لگی۔ میرا سٹاپ آ گیا تھا..... اور اس نے کہیں آگے جانا تھا..... گاڑی سے قدم نیچے رکھنے سے لمحہ بھر پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا..... آنکھوں میں کرب کا جہاں بسائے دو بوڑھی آنکھیں..... میری کتابوں کو دیکھ رہی تھیں اور یہ کرب ناک منظر ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں میں ثبت ہو گیا۔

ایکشن

باہر سے آئے ہوئے ایک سیاح نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا:

''لندن میں کس جگہ اسے کوئی اچھا ایکشن دیکھنے کو مل سکتا ہے؟''

''دوست کنگ کراس جاؤ۔ وہاں چند منٹ ادھر ادھر گھومو۔ جلد ہی بھرپور ایکشن سے تمہارا واسطہ پڑ جائے گا۔''

سیاح شہر میں نووارد تھا اس لئے وہ کنگس کراس کی بجائے وائٹرلو جا پہنچا لیکن پانچ منٹ کے اندر ہی اس کا سامنا ایک عورت سے ہوا اور پھر چند منٹ بعد وہ سٹیشن کے عقب میں ایک آرام دہ فلیٹ میں تھا۔ اس نے ابھی اپنی جیکٹ اور ٹائی اُتاری ہی تھی کہ قدموں کی آہٹ اور سامنے کے دروازے کے تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔

''جلدی کرو'' عورت نے کہا ''فوراً کچن میں جاؤ اور نلکے کے پائپ کا معائنہ شروع کر دو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی کہ تم ایک مستری ہو اور نلکہ درست کرنے کے لئے آئے ہو۔''

وہ سیاح بھاگ کر کچن میں پہنچا۔ اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور شوہر اندر داخل ہوا۔

سیاح نے ابھی نلکا کھولا ہی تھا اور ایک مستری نظر آنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ راہداری سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''اچھا تو یہ تم ہو؟ میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کنگس کراس جانے کو کہا تھا۔''

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک باہمت خاندان کی کہانی جس نے عزم و حوصلہ سے ''طوفان'' کا رُخ موڑ دیا

زاہدہ یوسفی

لوگ کیا کہیں گے؟

رباحہ کی تجویز مسز درانی کو پسند تو بہت آئی لیکن اب ایک ہی ہچکچاہٹ مانع تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ درانی صاحب کی فیملی یہ کیا کر رہی ہے۔ ''امی جان اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم جائز طریقے سے رزق حلال کمائیں تو اللہ ہی ہم سے راضی ہوگا۔'' رباحہ نے بالآخر اپنی ماں کو قائل کر ہی لیا۔

رباحہ کافی دیر سے امی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن امی اس کی ہر بات کے آخر میں یہی کہتیں ''لوگ کیا کہیں گے؟'' اور رباحہ بُری طرح جھنجھلا جاتی۔ ''امی ہم کون سا کوئی غلط کام کرنے جا رہے ہیں کہ لوگوں کی پرواہ کریں اور پھر ہم لوگوں کی پرواہ کیوں کریں۔ کوئی آیا ہمارے آڑے وقت میں ہمارا ہمدرد بن کر، کسی نے ایک پیسے کی مدد بھی کی ہماری؟ مدد تو درکنار ہمدردی کے دو بول بھی نہیں کہے کسی نے۔'' رباحہ روہانسی ہو کر بولی تو مسز درانی کا کلیجہ کٹ ہی تو گیا۔

پچھلے ایک سال سے ان کا گھرانہ گردش حالات کا شکار تھا۔ زندگی کا سفر ہنسی خوشی رواں دواں تھا کہ اچانک رباحہ کے والد صاحب فراش ہو گئے۔ فالج کے حملے سے ان کا آدھا دھڑ بے حس ہو گیا۔ گھر بھر کے وہ واحد کفیل تھے۔ تین بچے تھے۔ تینوں پڑھنے والے۔ رباحہ سب سے بڑی تھی۔ بی اے فائنل ایئر کی طالبہ تھی۔ اس سے چھوٹا حازم ایف ایس سی سال دوئم کا طالبعلم تھا۔ سب سے چھوٹی فارحہ میٹرک میں پڑھتی تھی۔ درانی صاحب سترہویں گریڈ کے آفیسر تھے۔ مسز درانی خاصی سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ ان کا گھرانہ مثالی گھرانہ تھا۔ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی تھی۔ خاندان بھر میں ان دونوں میاں بیوی کے بیچ الفت و مودت کی اور باشعور اور سلیقہ مند اولاد کی مثالیں دی جاتی تھیں کہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ صاحب خانہ صاحب فراش ہو گئے تو سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ پس انداز کی ہوئی رقم کب تک ساتھ دیتی۔ درانی صاحب کا علاج، بچوں کے تعلیمی مصارف، گھر کے اخراجات، رفتہ رفتہ یہ محدود رقم ختم ہونے لگی تو مسز درانی ازحد پریشان ہوئیں۔ رباحہ چونکہ بڑی تھی اور خاصی سمجھدار بھی سو مسز درانی نے اپنی پریشانی بیٹی کے سامنے رکھی تو رباحہ نے امی کو بڑی اچھی تجویز پیش کی۔ ''امی آپ اتنا اچھا کھانا بناتی ہیں۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ ہمارے گھر کے آس پاس جو دفاتر ہیں ان میں اکثر لوگ باہر سے لنچ منگواتے ہیں جو کہ عموماً بدمزہ ہوتا ہے ہم اگر ان دفاتر سے لنچ کا آرڈر لیں اور پھر گھر کا پکا ہوا مزیدار اور ہائی جینک کھانا فراہم کریں تو اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ انشاء اللہ وہ ہمیں ہماری محنت کا ثمر دے گا اور ہمارے خانگی حالات میں بہتری آسکتی ہے۔ ہم ڈسپوزایبل پیکنگ میں کھانا سپلائی کریں گے۔'' رباحہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔

''لیکن بیٹا آرڈر اور سپلائی کا کام کیونکر ہو گا۔'' ''امی وہ آپ فکر نہ کریں میں نے حازم سے بات کر لی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر یہ کام کر لوں گا۔ کھانا بنانے میں فارحہ اور میں آپ کی مدد کریں گے۔ امی آپ اتنا اچھا کھانا بناتی ہیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔''

مسز درانی حیرت زدہ سی اسکی باتیں سنتی جا رہی تھیں اور اس کی سمجھداری پر حیران ہو رہی تھیں۔ وہ تو اسے ایک کھلنڈری سی لڑکی سمجھتی تھیں لیکن اندر سے وہ کتنی حساس اور سمجھدار ہے انہیں اب پتہ چلا تھا۔ مسز درانی نے اپنے گھر کے حالات پر نظر ڈالی تو انہیں رباحہ کی تجویز نہایت معقول لگی۔ درانی صاحب کی دوائیاں، بچوں کی فیسیں اور گھر کے دوسرے اخراجات سب مل ملا کر نہایت کفایت شعاری سے بھی خرچ کریں تو 20 سے 25 ہزار کا ماہانہ خرچ ہے، کہاں سے لاؤں گی میں اتنے پیسے، مسز درانی نے سوچا۔ یہ بھی میرے مولا کا کرم ہے کہ گھر اپنا ہے ورنہ کرائے کی مد میں بھی اچھی خاصی رقم چلی جاتی۔ رشتہ داروں نے تو پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ مسز درانی کے میکے کی طرف سے تو کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ والدین کے انتقال کے بعد والدین کا در ہی بند ہو گیا البتہ سسرال تو بھرا پڑا تھا۔ ان کے دو جیٹھ اور تین دیور تھے جو ماشاء اللہ آسودہ حال تھے۔ مہینے دو مہینے بعد رسمی سی عیادت کو آتے اور اپنے تئیں وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ کبھی جھوٹے منہ سے بھی نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھا کہ بھابھی کیسے گزارا ہوتا ہے۔ سچ کہا ہے بڑوں نے کہ بُرے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

رباحہ کی تجویز مسز درانی کو پسند تو بہت آئی لیکن اب ایک ہی ہچکچاہٹ مانع تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ درانی صاحب کی فیملی یہ کیا کر رہی ہے۔ ''امی جان اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم جائز طریقے سے رزق حلال کمائیں تو اللہ ہی ہم سے راضی ہوگا۔''

رباحہ نے بالآخر اپنی ماں کو قائل کر ہی لیا۔ پہلے پہل بریانی اور سینڈوچز سے کام شروع کیا گیا پھر آرڈر کے مطابق اشیاء بڑھاتے گئے۔ کھانے کا معیار سر چڑھ کر بولا اور آرڈر بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آرڈر پورا کرنا ان کے بس میں نہ رہا اور انہوں نے کام کے لئے ملازم رکھ لئے۔

اب دور و نزدیک ان کی شہرت پھیلنے لگی اور کئی دفاتر سے انہیں باقاعدہ سپلائی کے آرڈر مل گئے۔ ایک سلسلہ چل نکلا اور معقول آمدنی ہونے لگی۔ گھر کا نظام سلیقہ سے رواں دواں ہوگیا۔

درانی صاحب لیٹے لیٹے یہ سب دیکھا کرتے۔ اپنے اہل خانہ خصوصاً رباحہ کے لئے بے شمار دعائیں ان کے دل سے نکلتیں جس نے اپنے حوصلے اور سمجھداری سے بروقت فیصلہ کرکے ان کے گھر کا شیرازہ بکھرنے سے بچالیا تھا بلکہ کسمپرسی اور بے بسی کا نشان بننے کے بجائے ایک مثال بن گئی تھی۔ ذہنی آسودگی، اچھے علاج اور اچھی غذا سے درانی صاحب بھی آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ درانی صاحب بالکل تندرست ہو گئے۔ ملازمت سے طویل رخصت کی بنا پر نوٹس آرہے تھے۔ اب روبصحت ہوئے تو درانی صاحب نے ملازمت پر واپس جانے کی بجائے ایک اور ہی فیصلہ کیا۔ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ملازمت سے ملنے والے فنڈز سے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیا۔ یوں رباحہ کی دانشمندی سے گردش حالات کی ڈولتی ناؤ پھر سے رواں دواں ہوگئی۔ اگر لوگوں کی فکر میں رہتے تو.....؟

❁ ❁

نہ جانے کیوں.....؟

کچھ چھوٹے چھوٹے الفاظ اتنے کڑوے کیوں ہوتے ہیں؟ کیوں لوگ یہ احساس دلاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی زندگی میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں۔ مگر سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ واقعی لفظوں کی ضرب درد سے بھرپور ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں اپنوں کے کھو جانے کا دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کی زندگی میں بے پناہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں مگر زندگی میں کچھ ایسے بھی موڑ آتے ہیں کہ کتنے ہی بڑے فیصلے آپ ان کے بغیر ہی کر لیتے ہیں۔ وہ مرحلے کتنے کٹھن ہوتے ہیں نا! واقعی وقت بڑا استاد ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ایک اچھے دوست کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کو آپ اپنا دکھ درد بتا سکیں جو آپ کی ذات اور احساس کو سمجھ سکتا ہو۔ مگر بہت قسمت والے ہوتے ہیں وہ جن کو ایسا دوست ملتا ہے۔ دوست وہی ہوتا ہے جو آپ کی ذات کو آپ کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرلے۔

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

مرتب: ایس۔ امتیاز احمد (کراچی)

☆☆☆

''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں''

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کردیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑتما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

husain_sayyed2001@yahoo.com

نکات دانش

☆.....آدمی کے نماز روزہ پر مت جاؤ بلکہ اس کی سچائی اور عقل کو دیکھو (حضرت عمرؓ)

☆.....کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض مت ہونا کیونکہ قدرت کا قانون ہے جس درخت کا پھل میٹھا ہوتا ہے لوگ پتھر بھی اس کو مارتے ہیں (حضرت علیؓ)

☆.....ایک طرف تو انسان جسمانی بیماریوں کا علاج سائنٹیفک بنیادوں پر کر رہا ہے لیکن دوسری طرف ایٹم بم سے انسانیت کی تباہی کا سامان بھی پیدا کر رہا ہے۔

☆.....جوہر سال حج پر جاتا تھا وہ جعلی ادویات بناتا پکڑا گیا۔

☆.....اگر صرف حفاظتی اقدامات انسان کو موت سے محفوظ رکھ سکتے تو خادم الحرمین شاہ فیصل شہید نہ ہوتے جن کی سکیورٹی دنیا کی بہترین سکیورٹی تھی اور نہ ہی امریکی صدر کینیڈی کو لاکھوں آنکھوں کے سامنے گولی لگتی۔ امریکی صدر کے لئے فول پروف سکیورٹی انتظامات کئے جاتے ہیں۔

☆.....ذہین ترین مرد کی ذہانت جہاں ختم ہوتی ہے احمق ترین لیکن حسین عورت کی چالاکی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔

☆.....محض تمنائیں اور آرزوئیں نہ تو کسی راز کو ہویدا کرسکتی ہیں نہ کسی راز کو منکشف کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ بے عمل لوگوں کے لئے آرزوئیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور تمنائیں خواب آور گولی کی مانند ہوتی ہیں جسے کھا کر وہ دُور دُور تک پرواز کرتے ہیں لیکن آنکھ کھلنے پر سوائے بستر کی شکنوں کے انہیں کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔

☆.....مجھے امن سے محبت ہے، مجھے جنگ سے نفرت ہے مگر مجھے اس جنگ سے بھی امن کی طرح محبت ہے جو انسان اپنی آزادی، اپنی عزت اور ملک کی بقا کے لئے لڑتا ہے (خدیجہ مستور)

☆.....زندگی اتنی تلخ کیوں ہے؟ انسان اتنا دکھی کیوں ہے؟ اور صرف ایک بات معلوم کرنا چاہوں گا کہ میرے حصے میں اتنی آزمائشیں اور امتحان کیوں؟

☆.....حکمرانوں اور انسانوں میں اتنا فرق کیوں؟

☆.....پاکستان میں غریب ہونا 302 سے بڑا جرم ہے (سپریم کورٹ)

☆.....گم ووٹیج اور بجلی کی آنکھ مچولی، لوڈشیڈنگ سے شہریوں کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ افسوس یہ سارے جمہوری حکومت کے کارنامے ہیں۔

فتوے یا تاریخی غلطیاں

1440ء میں جرمنی میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا اور پورے یورپ میں آگ کی طرح پھیلتا گیا۔ ادھر سلطنت عثمانیہ کا شیخ الاسلام فتویٰ دیتا ہے کہ ہماری مقدس کتابیں مشینوں میں نہیں لکھی جائیں گی۔

1550ء میں انگریزوں نے انڈیا میں پرنٹنگ پریس لگایا تو ہند کے علماء نے بھی شیخ الاسلام کے فتوے کی توثیق کر دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس سے ہمارے کاتبوں کی روزی روٹی چھن جائے گی۔ ایجاد کے تقریباً 250 سال بعد مسلمانوں نے اس انقلابی ایجاد سے مستفید ہونے کی شروعات کی۔

1665ء میں پہلی بار انسانی خون (blood) کی ٹرانفیوژن کا کامیاب تجربہ کیا جاتا ہے۔ ادھر پھر مذہب کے ٹھیکیداروں نے فتویٰ دیا کہ انسان کا خون دوسرے انسان پر حرام ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان ڈاکٹر اس فیلڈ میں تین سو سال پیچھے رہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں رائٹ برادران نے امریکہ میں ہوائی پرواز کا کامیاب تجربہ کیا۔ ادھر ہمارے جاہلوں نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ لوہا بھی ہوا میں اُڑ سکتا ہے ان کا ایمان چلا گیا ہے۔ ساری دنیا نے اس نئی ایجاد کو دیکھا اور اس سے بھرپور استفادہ کر رہی تھی اور مسلمان کنفیوز گھوم رہے تھے کہ یہ لوہا بھی ہوا میں اُڑ رہا ہے لیکن اگر اس پر یقین کر لیا تو ایمان سے چلا جائے گا۔

سرسید احمد خاں نے انگریزی تعلیم پر زور دیا تو ان کو کافر کہا گیا۔

علامہ اقبال نے شکوہ لکھ دیا تو ان پر کفر کا لیبل لگ گیا۔ وہ ذہین آدمی تھے انہوں نے جواب شکوہ لکھ دیا تو وہ لیبل اُتار دیا گیا۔ اسی طرح ہزاروں اور فتوے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلط ثابت ہوئے۔ آخر کب تک یہ فتوے لگاتے رہیں گے اور جاہلوں کی طرح آپے سے باہر ہوتے رہیں گے۔

(فیس بک ڈاٹ کام سے توقیر علی شاہ کی پسند)

☆☆☆

گزشتہ چالیس برس کے اندر عالم انسانیت نے جتنی ترقی کی ہے اس سے پہلے کی چار صدیوں میں بھی نہیں ہو سکی۔

بڑی تلخ بات ہے

صاحبو! بات کہنے کی نہیں لیکن کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔ بڑی تلخ بات ہے لیکن بڑی سچی، اتنی تلخ سچائی کہ ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ یہ کہ ہم میں سے چند ایک افراد ہوں گے جو قرآن پاک پڑھتے ہوں گے۔ وہ افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اتنے چند..... باقی سب، آپ، میں، ہم قرآن

پاک پڑھتے نہیں اسے استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو ثواب کمانے کے لئے تلاوت کرتے ہیں۔ کچھ اپنے مرحوم عزیز و اقرباء کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ آیات کو تعویز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ورد کرتے ہیں۔ صوفی اکٹھے مل کر ذکر کرتے ہیں تاکہ وجدان کی کیفیت پیدا ہو۔ وجدان بھی تو ایک قسم کی لذت ہے۔ ہمیں راہ دکھانے والے اپنے نظریات کی تقویت کے لئے، عوام کو مرعوب کرنے کے لئے، شوکت نفس کے لئے قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ بہرصورت کوئی شخص قرآن کو سمجھنے اور جاننے کے لئے نہیں پڑھتا۔

سیانے کہتے ہیں کہ قرآن پاک گلاب کے پھول کی مانند ہے..... پتی در پتی، پتی در پتی، اوپر کی پتی اٹھاؤ تو نیچے ایک اور پتی، اسے اٹھاؤ تو ایک اور پتی، مفہوم در مفہوم، اوپر کا مفہوم ہٹاؤ تو نیچے ایک اور مفہوم، اوپر سطحی نیچے کائناتی۔ اکثر لوگ پہلی پتی یعنی اوپر کے مفہوم پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پالیا، ہم نے پالیا۔

قرآن کی بات تو وہی تیتر کی بولی والی ہے۔ تیتر بولا تو مفکر نے کہا کہہ رہا ہے "سبحان تیری قدرت" بنیا بولا ابے نہیں کیوں خوامخواہ بات کو الجھا رہا ہے، تیتر کہہ رہا ہے "لون تیل ادرک" پہلوان بولا تم دونوں غلط سمجھے تیتر کہہ رہا ہے "کھا گھی اور کر کثرت"

قرآن کہتا ہے لوگو! مجھے پڑھو، سمجھو، غور کرو، پھر تمہیں ایسی ایسی عقل و دانش کی باتیں ملیں گی کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ پردے اُٹھ جائیں گے۔ بڑے بڑے راز کھلیں گے جو تمہیں تسخیر کائنات میں مدد دیں گے۔

("تلاش" ممتاز مفتی کی کتاب سے اقتباس)

وسعت اللہ خاں کا کالم

مجھے آج ایسے ممالک اور معاشروں کی بات ہی نہیں کرنی جو دو ہزار گیارہ کی دنیا میں بھی دائرے میں چلتے رہنے کو سفر جانتے ہیں۔ کنویں میں پڑے کتے پر کپڑا ڈال کر سمجھتے ہیں کہ پانی پاک ہو گیا۔ گندگی کے ڈھیر کو پہاڑی کی شکل دے کر اسے خوشبودار مٹی سے لیپ دیتے ہیں۔

جو دل سے قائل ہیں کہ ان کی ننانوے فیصد غلطیوں اور غفلتوں کے ذمہ دار دوسرے ہیں اگر وہ یہ یہ نہ کرتے تو ہم بھی وہ وہ نہ کرتے۔ جنہوں نے دماغ کو تاریک قید خانے میں ڈال کر دل کو اس کا دربان مقرر کر دیا ہے جو شک کے پانی کو آب حیات سمجھتے ہیں۔ جو اپنے کرتوتوں کو خدا کے سر منڈھ کر پھر سے پھنے خاں بن کر فرضی و اصلی دشمنوں کو غلط ملط کر کے ہوا میں تلوار بازی شروع کر دیتے ہیں کہ پالا مار لیا ہے بھئی!

مجھے صرف ان ممالک کی بات کرنی ہے جہاں غلطی کو غلطی، غفلت کو غفلت اور جرم کو جرم تسلیم کر کے خود احتسابی کے نشتر سے پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تاکہ سارا کھاتہ صاف کر کے نئے ارادے اور عزم کے ساتھ آگے بڑھا جا سکے۔

جیسے جرمن، جو سن پینتالیس کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب باہر والوں سے نہیں لڑنا، اپنے آپ سے لڑنا ہے اور ایسا سماج تشکیل دینا ہے جہاں دوبارہ کوئی ہٹلر اور کوئی گوئبلز جنم نہ لے سکے۔ جہاں صرف تعلیمی سمر کیمپ بنیں اور کوئی کنسنٹریشن کیمپ نہ بن سکے۔

جیسے جاپان، جنہوں نے چھپن برس پہلے خود پر ایٹم بم گرنے کے بعد پوری دنیا کو اپنی چراگاہ سمجھنے کی ذہنیت ترک کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ اب ہتھیار سے نہیں صنعت، ایجاد اور جدیدیت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذریعے لڑنی ہے۔

اس وقت مجھے کچھ افراد بھی یاد آ رہے ہیں جنہوں نے اپنی ناکامیوں کو کامیابی کی چادر میں نہیں لپیٹا اور خود کو جزا و سزا کے عمل کے حوالے کر دیا۔

جیسے سن چھپن میں جنگ سوئز میں برطانیہ کو جھونکنے والے وزیراعظم انتھونی ایڈن نے ذمہ داری قبول کرتے ہوئے پانچ برس کی مدت پوری کرنے کی ضد نہیں کی اور استعفیٰ دے دیا۔

جیسے سن باسٹھ میں چین سے لڑائی میں شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے بھارتی وزیر دفاع کرشنا مینن نے استعفیٰ دے دیا اور وزیراعظم جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ کے فلور پر اعتراف کیا کہ شکست کی وجہ یہ ہے کہ ہم سوئے ہوئے تھے اور اپنے خوابوں کی دنیا میں تھے۔

جیسے سن سڑسٹھ کی جنگ میں اسرائیل سے شکست فاش کھانے والے مصری کمانڈر فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر نے مارے غیرت کے خودکشی کر لی۔

جمال عبدالناصر نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا لیکن لاکھوں مصریوں نے ان کے محل کا گھیراؤ کر کے استعفیٰ واپس لینے پر مجبور تو کر دیا لیکر ناصر اندر سے مر چکا تھا۔ ڈیڑھ برس بعد اس نے دل نے بھی زندگی سے استعفیٰ دے دیا۔

جیسے سن چوہتر میں رچرڈ نکسن نے واٹر گیٹ سکینڈل کی ریکارڈنگز کو جعلی یا اپنی منتخب صدارت کے خلاف غیر ملکی سازش قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔ اعتراف کیا کہ ہاں! یہ سب کچھ ہوا ہے اور بحیثیت صدر میں ذمہ دار ہوں اور نکسن نے کانگریس کے سامنے مواخذے سے پہلے استعفیٰ دے دیا۔

آج مجھے نہ تو سن پینسٹھ کی پاکستان ہندوستان جنگ، سن اکہتر کی جنگ بنگلہ دیش، سن نواسی کے تباہ کن جلال آباد حملے، سن ننانوے کی کارگل لڑائی اور دو ہزار پانچ کے عبدالقدیر خان نیٹ ورک سکینڈل کے ذمہ داران پر کوئی بات کرنی ہے اور نہ ہی اسامہ کے ڈرامہ پر کچھ لکھنا ہے۔

کچھ کہنے کا فائدہ؟؟؟؟؟

(بی بی سی ڈاٹ کام سے اقتباس)

سسک سسک کر

واقعہ تمام ہوا، اسامہ مر گیا۔ وہ مرنا ہی چاہتا تھا۔ ہم جینا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی مر جائیں گے۔ اندھی گولی سے نہ سہی بجلی کے انتظار میں سسک سسک کر۔ ڈرون حملے میں نہ سہی دہشت گردوں سے ڈر ڈر کر۔ خودکش حملے میں نہ سہی بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کے ذریعے۔ چینی کی بے چینی سے نہ سہی دودھ کے لئے بلک بلک کر۔ ہم بچے برائے فروخت کا بورڈ لگا کر کب تک پیٹ پال لیں گے۔ ہم گردے بیچ بیچ کر کتنے دن زندہ رہ لیں گے اور ملک بیچ کر کتنے سال اس دنیا میں رہ پائیں گے۔ ایمان بیچ کر کیا کچھ خرید میں گے؟ ہم وہ قوم ہیں جن کے پاس نیوکلیئر پاور تو ہے لیکن الیکٹرک پاور نہیں۔

زندگی

زندگی کبھی کسی کے لئے نہیں رُکتی۔ وقت کبھی کسی کے لئے نہیں ٹھہرتا۔ لمحے کبھی پل بھر کو نہیں تھمتے۔ ہوا ہر وقت چلتی ہے کیونکہ اگر تسلسل قائم نہ رہے تو زندگی کی سانسیں رُک جائیں۔ کائنات کا حُسن تبدیلی ہی میں پنہاں ہے۔ زندگی ان گنت لوازمات سے بھرپور ہے۔ محبتیں، نفرتیں، چاہتیں، تلخیاں اور خوش گمانیاں زندگی کے وہ نشیب و فراز ہیں جو قدم قدم پر اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ہم کبھی اپنی زندگی پر رشک کرتے ہیں تو کبھی کف افسوس ملتے ہیں۔ کبھی خواہشوں کو پا لینے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں تو کبھی پا کر کھو دینا بھی

زندگی ہے۔ یوں تو زندگی کے بارے میں ہر فرد کے نظریات جدا جدا ہیں لیکن ایک نظریہ پر آ کر انہیں متفق ہونا پڑتا ہے کہ زندگی انسان کے لئے اللہ کا ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ زندگی کھیل کے میدان کی طرح ہے جس میں تلخ و خوشگوار لمحے آتے ہیں۔ کبھی بہت اچھا ہو جاتا ہے تو کبھی برا اور کبھی بہت کچھ کرنے کو باقی ہوتا ہے کہ مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

انسان کی ایک آرزو پوری ہو جائے تو فوراً ہی دوسری بہت سی آرزوئیں اس کی جگہ آ موجود ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ لامتناہی زندگی بھر جاری رہتا ہے اور ناگہانی موت ان سب کو ختم کر ڈالتی ہے۔

روز ازل سے مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

☆☆☆

زندگی میں سفر کے دوران منہ کو تالا لگا کر رکھنا کامیابی کی نشانی ہے۔ لوگوں کے غلط رویوں کو شکایت کئے بغیر برداشت کرنا چاہیے۔ لوگوں کی خامیوں کو ان کے منہ پر بیان کرنا کوئی اچھی بات نہیں کیونکہ ان کے ہاں سچائی سننے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

عطیہ

سعودی عرب کے دارالحکومت میں مقیم ایک نابینا شخص کی بے بسی دیکھ کر اس کی بیوی نے شوہر کے لئے ایک آنکھ کا عطیہ دیا۔ بیوی کے اس ایثار سے شوہر کی آدھی بینائی بحال ہو گئی اور اس کی تاریک دنیا کسی قدر روشن ہو گئی بلکہ ایسی روشن ہوئی کہ شوہر کو اپنی وفاشعار بیوی کا کانا پن بھی نظر آنے لگا اور اس کی بدصورتی سے بدک کر اس نے دو آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت سے شادی کر لی۔

اب اس میں قصور بیوی کا ہے یا شوہر کا؟

ہمیں تو بیوی کا ہی قصور نظر آیا..... کہ اس نے آنکھ کا عطیہ دے کر خاوند کو خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرنے کی صلاحیت دی۔ اب اگر خاوند اس صلاحیت کا فائدہ نہ اٹھاتا تو بیوی کے لئے یہ اس کی ناشکری ہوتی۔ ہو سکتا ہے اب دوسری بیوی سے بھی ایک آنکھ لے کر خود دو آنکھوں والا بن جائے اور اسے بھی کانی کر کے چلتا کرے اور تیسری شادی رچا لے۔

آنکھیں واقعی بڑی نعمت ہیں۔

(فیس بک ڈاٹ کام سے انتخاب)

افکار پریشان

(جسٹس ایم آر کیانی کی کتاب سے)

مجھے انتخابات کے زمانے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ ووٹ ایک امیدوار کے ساتھ زیادہ تھے مگر سرکار دوسرے امیدوار کے ساتھ زیادہ تھی اور اس کے حق میں کھلم کھلا فرضی ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ انتخاب کی نگرانی ایک تحصیلدار کر رہا تھا۔ آزردہ امیدوار نے اس دھاندلی کی شکایت کی۔ تحصیلدار نے کہا کہ ڈپٹی کمشنر سے شکایت کرو۔ امیدوار نے جواب دیا وہاں بھی شکایت کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔ تحصیلدار نے کہا کہ چیف منسٹر کے پاس شکایت کرو۔

امیدوار نے جواب دیا وہاں بھی کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔

تحصیلدار نے کہا ''تو کیا اتنے لوگوں میں ایک میں ہی آپ کو دیانتدار نظر آتا ہوں۔ میں نے آخر کیا قصور کیا ہے!''

☆☆☆

معلوم نہیں ملتان اکادمی گانے کو جائز سمجھتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یا نہیں۔ پاکستان آرٹس کونسل میں تو گانا بھی جائز سمجھتے ہیں اور بجانا بھی۔ تیسری چیز ناچ کو بھی، جو ان دونوں سے بہتر ہے۔

بہت سی چیزوں کو آپ زماں و مکاں کے لحاظ سے جائز بنا دیتے ہیں مثلاً اگر ناچ اور گانے کو محفل رقص و سرود کہا جائے اور اس کا افتتاح کسی معتبر آدمی سے کرایا جائے اور وہ بازار کے بالا خانے کی بجائے کسی بنگلے میں ہو تو اسے آرٹ کہتے ہیں اور اس کا شمار فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

زائرین کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

مٹھی بھر

مٹھی بھر زہر، پینے کے پانی کے پورے تالاب یا ذخیرے کو مہلک بنا دیتا ہے اور پوری آبادی کو ابدی نیند یعنی موت کے حوالے کر سکتا ہے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے بھی مٹھی بھر ہی تھے مگر قیام پاکستان کی خوشیاں منانے والے عوام اور خواص ان کی انتہائی خوفناک سازشوں سے آگاہی حاصل نہ کر سکے اور انہوں نے، ان مٹھی بھر پاکستان دشمنوں نے، پاکستان کے دوستوں کا روپ دھار کر یہاں کے عوام میں نفرت، نفاق، بددیانتی، کرپشن کو پھیلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

پاکستان کی قومی تاریخ گواہ ہے اور یہ گواہی ضبط تحریر میں آ کر قومی شعور کا حصہ بننی چاہیے کہ مٹھی بھر اندرونی دشمنوں کی موجودگی میں پاکستان کسی غیر ملکی دشمنی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مہربان دوست واصف علی واصف نے دعا مانگی تھی کہ ''اے خدا اسلام کو مسلمانوں سے محفوظ رکھ۔'' پوری دنیا میں مقبول ہونے والی اس دعا کو قدرت نے ابھی تک قبول نہیں فرمایا مگر اس دعا کے اندر سے کچھ دعائیں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ''خدایا پاکستان کو پاکستان کے محافظوں سے محفوظ رکھ۔ خدایا پاکستان کے ادب کو ادیبوں سے محفوظ رکھ۔ اے خدا پاکستان کے قانون کو قانون دانوں سے محفوظ رکھ۔ خدایا پاکستان کی جمہوریت کو جمہوریت پسندوں سے محفوظ رکھ اور اے خدا پاکستان کے عوام کو ان کے مٹھی بھر دشمنوں، شر پسندوں، تخریب کاروں اور دہشت پسندوں سے محفوظ رکھ۔''

''مٹھی بھر'' سے یہ کہاوت بھی یاد آتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اپنے غلام ایاز کی ذہانت کا امتحان لینے کے لئے ایک تالاب کے کنارے پوچھا کہ اس تالاب میں کتنے پیالے پانی ہو گا؟ ایاز نے جواب دیا ''سلطان حضور! اگر پیالہ تالاب کے برابر ہے تو صرف ایک پیالہ، اگر تالاب سے آدھا ہے تو پھر دو پیالے اور اگر.....''

(''گریبان'' منو بھائی کا کالم جنگ ڈاٹ کام 15 جولائی سے اقتباس)

بلی

یہ جانور صدیوں سے بیک وقت پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے گھرانے بھی موجود ہیں جنہوں نے بیک وقت 20، 20 بلیاں پالی ہوئی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو بلیوں سے تنگ آ کر انہیں بوری میں بند کر کے میلوں دور چھوڑ آتے ہیں۔ شاہدرہ میں مقیم ایک خاتون نے گھر میں 30 بلیاں پالی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں نہلاتی، دھلاتی اور کھانا کھلاتی۔ رات کو یہ ان کے بستر پر ہی سو جاتیں لیکن اب مہنگائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے ان بلیوں کی تعداد پانچ چھ تک محدود کر دی ہے۔ اسی طرح پوش

علاقوں میں کئی گھرانوں نے سیامی نسل کی بلیاں پالی ہوئی ہیں۔ کئی شوقیہ حضرات اب بھی ان کی خاطر مدارت میں دن رات ایک کر دیتے ہیں اور مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کی مثال دیتے ہیں جو بلیاں پالنے کے حوالے سے مشہور تھے۔ خاتون خانہ مسز خالدہ کا کہنا ہے کہ ''یوں لگتا ہے انسانوں کے ساتھ ساتھ بلیوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر محلے میں ہر طرف دندناتی دکھائی دیتی ہیں اور گھروں میں آدھی رات کو کسی منڈیر یا صحن میں گھر کے دروازے کے بالکل سامنے غراتی، لڑتی اور شور مچاتی نظر آتی ہیں۔ اکثر لوگ ان کی لڑائی کو منحوس سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی آوازیں سن کر بعض اوقات یہ گمان ہوتا ہے جیسے خواتین بین کر رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں گھر سے بھگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر خواتین اس حوالے سے بھی تنگ ہوتی ہیں کہ رات باورچی خانے میں یہ برتنوں میں منہ مارتی ہیں، دودھ پی جاتی ہیں اور گندگی پھیلا دیتی ہیں۔ ننھے بچے اگرچہ بلیوں کے بچوں سے کھیلنا پسند کرتے ہیں لیکن مائیں انہیں قریب نہیں پھٹکنے دیتیں کہ مبادا پنجے نہ مار دیں۔ ان کے ریشمی بالوں کو ویسے بھی الرجی کا موجب سمجھا جاتا ہے۔ بلیاں گھر میں بچے دے دیں تو ان سے چھٹکارا مزید مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بچوں کو منہ میں لے کر سات گھروں میں گھومتی ہیں لیکن ان کے اس عمل سے ساتوں گھرانوں میں مشکل آ پڑتی ہے۔'' یہ صرف ایک خاتون خانہ کے تاثرات نہیں 80 فیصد خواتین بلیوں کو ایسا بن بلایا مہمان سمجھتی ہیں جو ان کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔ کئی خواتین اس لئے بلیاں پالتی ہیں کہ ان کے گھروں سے چوہے ختم ہو جاتے ہیں لیکن چوہے ختم بھی ہو جائیں تو پھر ان بلیوں سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔

ہجوم گزیدہ

گزشتہ چند سال سے احتجاج کی آڑ میں بے گناہ لوگوں کی املاک و جائیداد کو لوٹنے، سواریوں کو جلانے اور اپنی انا کی تسکین کے لئے بے گناہ لوگوں کو جھوٹے الزامات لگا کر جان سے مار دینے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ گھناؤنی حرکات ہمارے رسم و رواج کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ حکمرانوں کو لوٹ مار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ دوسرے مسائل کی طرف کیسے توجہ دیں؟

چنی گوٹھ میں پچھلے دنوں جو المناک واقعہ پیش آیا ہے اس نے پوری دنیا میں بسنے والے ہر باشعور اور سچے مسلمان کو شرمندہ کر دیا ہے۔

دین کی سربلندی اور مقدس کلام کی عظمت کی حفاظت کے نام پر جرائم پیشہ اور شر پسند عناصر نے وہ کھیل کھیلا کہ چنگیز خاں اور حجاج جیسے ظالم اور جابر حکمرانوں کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی۔ 3 جولائی بروز منگل کی شام چوک چنی گوٹھ پر یہ المناک واقعہ پیش آیا۔ وہ کون تھا؟ اس کا تعلق کس خاندان اور شہر سے تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ بظاہر وہ پاگل یا مجذوب ہی لگتا تھا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، دنیا سے بیزار سا وہ شخص سارا دن شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ چلتے پھرتے کے دوران سڑکوں کے کنارے گندگی کے ڈھیروں سے جو چیز اس کی آنکھوں اور دل کو اچھی لگتی وہ اسے اٹھا کر اپنے پاس موجود ایک بیگ میں ڈال لیا کرتا تھا۔ اس طرح کے دیوانے پورے ملک میں ملتے ہیں جن کے متعلق کسی کو شاذ و نادر ہی پتہ ہوتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟ نہ ہی ان کی طرف قانون نافذ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے والے ادارے توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی انسانی حقوق کی تنظیمیں یا این جی اوز۔ البتہ جب کوئی سانحہ رونما ہو جائے تو پھر آسمان سر پر اٹھا کر ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر سرخرو ہو جاتا ہے۔

وہ سارا دن کے مزدوری کے بعد چوک چنی گوٹھ پر شام کو آیا تو تھکا ہوا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اعجاز خاں کھوکھے والے کو اپنے بیگ سے پچاس روپے نکال کر دیئے اور اس نے پینے کے لئے کولا کی بوتل مانگی اور بیگ کو بند کر کے وہیں رکھ دیا۔ بوتل پی کر اس نے خالی بوتل کھوکھے والے کو دی اور پیشاب کرنے کا اشارہ کر کے وہ کھوکھے کے پیچھے موجود خالی پلاٹ کی طرف چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد کھوکھے والے نے انتہائی بے حیائی اور بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بیگ کھول کر بیگ میں سے چھ ہزار روپے نقدی اور طلائی چین چرالی۔ ابھی وہ بیگ کو بند نہ کر پایا تھا کہ وہ مجذوب شخص اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اعجاز کا بازو پکڑ لیا اور اس سے اپنی چیزوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگا۔ اعجاز نے اُلٹا اس کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ اس موقع پر اعجاز نے ایک اور کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کی چین اور رقم ہضم کرنے کے لئے شور مچا دیا کہ اس شخص نے قرآن مجید کو جلایا ہے۔ بس اب کیا تھا معاملہ چور سے ہٹ کر مذہبی نوعیت کا بن گیا۔ وہ مجذوب تو پہلے ہی کم گو تھا وہ اپنی صفائی میں کیا بولتا۔ مجمع اکٹھا ہوتا گیا اور ہر آنے والا اس لاوارث اور کمزور آدمی کو اپنے اپنے حصے کا مار مار کر اپنے تئیں ثواب حاصل کرنے لگا۔ اسی اثناء میں کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ کچھ ملازمین تھانہ سے گاڑی پر آئے اور اس مجذوب کو اپنے ساتھ تھانے لے جا کر اس کو حوالات میں بند کر دیا۔ ایس ایچ او نے خود ہی مدعی بن کر اس کے خلاف 295/B کا مقدمہ درج کر لیا۔

ایسے میں مساجد میں دین کے نام پر لوگوں کو اکٹھا ہو کر تھانے پہنچنے کے اعلانات کئے گئے۔ یہاں پر بھی لیڈری کے شوقینوں نے لوگوں سے کہا کہ اسلام کو بچانا ہے تو آج جہاد کرنا ہوگا۔ ہجوم اکٹھا ہو گیا اور پہلے دو ائیر کنڈیشنڈ کوچز کے شیشے توڑے گئے پھر ان میں موجود مسافروں کا سامان لوٹا گیا۔ جلوس آگے بڑھا۔ اب ہر طرف سے عوام تھانہ چنی گوٹھ کی طرف بھاگ پڑے تھے۔ وائرلیس پر پیغامات پر مقامی ڈی ایس پی بھی موقع پر پہنچے تو بغیر وردی تھے۔ تھانے کے گیٹ پر ہجوم بڑھا تو مبینہ طور پر چند شرپسندوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ سارے پولیس ملازم تھانے میں قید ہو گئے تھے۔ پولیس نے بھی جوابی ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ آنسو گیس کا استعمال بھی کیا گیا لیکن ہجوم بے قابو ہوتا جا رہا تھا اور آخر کار تھانے میں جمع ہو گیا۔ چند لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، نعرے لگائے، دیواروں سے ٹکریں ماریں۔ لوگوں کی املاک لوٹنے میں بھی یہی لوگ آگے آگے تھے۔ لوگوں نے حوالات کی چابی زبردستی ملازمین سے چھین لی۔ ملازموں سے ہر قیمتی چیز چھین لی۔ تھانے کو آگ لگا دی اور ملزم کو باہر لا کر وہ انسانیت سوز کام کیا گیا کہ آسمان بھی رو دیا ہوگا۔ اس لاوارث آدمی کو ڈنڈوں سوٹوں سے مارا گیا۔ پھر اس کو رسیوں سے باندھ کر سڑک پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ پھر نعرہ لگا کہ اس کو چوک چنی گوٹھ پر لے چلو، اس کو وہیں سزا دیں گے۔ ہجوم ملزم کو سڑکوں پر گھسیٹتا ہوا چوک چنی گوٹھ لے گیا۔ گھسیٹنے کی وجہ سے ملزم کے جسم کی کھال اُتر چکی تھی

اور گوشت صاف نظر آ رہا تھا۔ چوک پر پہنچ کر لکڑیاں اور ٹائر ڈال کر ان پر پٹرول چھڑکا گیا، آگ تیز ہوئی تو ملزم کو اس پر درندہ صفت لوگوں نے اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا۔ اس سارے عمل کے دوران جل کر مرنے والے نے اپنے منہ سے کوئی درد بھری چیخ یا آواز نہیں نکالی اور نہ ہی ہجوم سے کوئی منت یا درخواست کی۔

(ناصر خاں نیازی کالفیچر، خبریں ملتان 18 جولائی سے اقتباس)

تہذیب

کسی ملک کی تہذیب کا معیار نہ اس کی آبادی ہے، نہ عبادت گاہیں، نہ بڑے شہروں کا وجود، نہ دولت کی مقدار..... اصل معیار یہ ہے کہ وہ ملک کس قسم کے انسان پیدا کر رہا ہے۔

چند پارلیمانی اصطلاحات

☆تحریک التواء

ایسی تحریک جس کے تحت کوئی حالیہ اور فوری عوامی اہمیت کا ٹھوس معاملہ زیر بحث لانے کے لئے اسمبلی کی کارروائی ملتوی کی جاتی ہے۔

☆بحث

اگر ایوان کے ارکان کی مجموعی تعداد کا چھٹے سے زائد حصہ کسی تحریک التواء کے حق میں ہو تو سپیکر اس پر اسی روز کے لئے یا جتنی جلد ممکن ہو اجازت دے گا جو کہ دو گھنٹے سے زائد نہ ہوگی مگر اجازت ملنے کے تین دن کے اندر جیسا کہ سپیکر متعین کرے بحث کی جائے گی۔

☆اسمبلی

اسمبلی سے مراد قومی اسمبلی۔

☆دو ایوانی

ایک پارلیمنٹ جس کے دو ایوان ہوں۔ پاکستان کی پارلیمنٹ دو ایوانی ہے اور یہ ایوان بالا یعنی سینیٹ اور ایوان زیریں یعنی قومی اسمبلی پر مشتمل ہے۔

☆ضمنی انتخابات

ضمنی انتخابات اس وقت ہوتا ہے جب پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان اور صوبائی اسمبلیوں کی کوئی نشست اس مدت (عام انتخابات کے درمیانی عرصہ) کے دوران کسی رکن کی موت، استعفیٰ، نااہلیت یا کسی بھی وجہ کی بناء پر خالی ہو جائے۔

☆آئین

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین 1973ء۔

☆ڈپٹی سپیکر

جب سپیکر کا عہدہ خالی ہو یا سپیکر غیر حاضر ہو یا کسی وجہ کی بناء پر اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے قاصر ہو تو ڈپٹی سپیکر بطور سپیکر کام کرتا ہے۔

☆قائد حزب اختلاف

وہ رکن جو سپیکر کی رائے میں وقتی طور پر حزب اختلاف کے ارکان کی اکثریت کا قائد ہو۔

☆وزیر

وزیر اعظم، وفاقی وزیر یا وزیر مملکت یا پارلیمانی سیکرٹری جسے وزیر کی طرف سے اس ضمن میں کوئی ذمہ داری سونپی یا تفویض کی گئی ہو۔

☆حزب اختلاف

پارٹی یا پارٹیاں جو حکومتی پارٹی سے تعلق نہ رکھتی ہوں۔

☆پارلیمنٹ ہاؤس

وہ عمارت جو اسمبلی کی نشست کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

☆کورم

کورم ارکان کی وہ کم سے کم تعداد ہے جو اسمبلی کی کارروائی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ آئین کے آرٹیکل (2)55 کے تحت اسمبلی کے کل ارکان کا 1/4

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حصہ کورم کے لئے ضروری ہوتا۔

☆وقفہ سوالات

ضوابط کے تحت سوالات پوچھنے اور جوابات دینے کے لئے مقررہ وقت۔

☆قرارداد

عوامی دلچسپی کے کسی معاملے پر بحث اور اظہار رائے کے لئے پیش کی جانے والی تحریک جس میں آئین میں درج قرارداد بھی شامل ہوتی ہے۔

☆سپیکر

اسمبلی کا سپیکر اور اس میں ڈپٹی سپیکر یا وقتی طور پر چیئرمین کے طور پر کام کرنے والا کوئی رکن۔

☆سٹینڈنگ کمٹی

اسمبلی کا ایک ذیلی یونٹ جو اسمبلی کو اپنے فرائض کی تکمیل میں معاونت کے لئے مستقل طور پر قائم کیا جاتا ہے۔ سٹینڈنگ کمیٹی کو اسمبلی کی طرف سے کسی خاص شعبے پر قانون سازی کا دائرہ اختیار دیا جاتا ہے۔

☆سینیٹ

ایوان بالا

☆نشست

کسی ایک دن اسمبلی یا کمیٹی کا اجلاس

(FAFEN پارلیمنٹ مانیٹر تیرہویں قومی اسمبلی کی کارکردگی کا سالانہ جائزہ سے اقتباس)

☆☆☆

FAFEN سے مراد فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک۔ یہ 42 سول سوسائٹی تنظیموں کا ایک نیٹ ورک ہے جو پاکستان میں جمہوری احتساب کے فروغ کے لئے سرگرم عمل ہے۔

نہ دن کو چین نہ رات کو سکون

رات کے تین بجے شب کا سکوت گھڑی کے الارم نے توڑ دیا۔ خاتون خانہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ٹائم دیکھا اور پھر بستر سے باہر آ گئیں۔ خاموش رات کے اس پہر خاتون خانہ کے جاگنے کا مقصد کسی مریض کی تیمارداری، پڑھائی یا عبادت کرنا نہیں بلکہ وہ اس سٹور روم کی طرف لپکیں جو کپڑوں کی استری کے لئے مختص تھا۔ وہاں میز پر ان کے بچوں اور میاں کے کپڑوں کا انبار لگا تھا۔ انہوں نے نیم خوابیدہ حالت میں کپڑے استری کرنے شروع کر دیئے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک کام جاری رہا۔ عین چار بجے بجلی چلی گئی۔ اس وقت تک ان کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ سو وہ نماز کی تیاری کرنے لگیں۔ نماز پڑھ کر کچھ ہی دیر سوئی ہوں گی کہ بچے اُٹھ گئے۔ شوہر کی تیاری اور بچوں کے سکول جانے کے دوران ہر طرف نیم تاریکی اور اداسی سی چھائی تھی۔ سب نے بے دلی سے ناشتہ کیا اور اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ خاتون خانہ رات کی جاگی ہوئی تھیں اور جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر ان کا دماغ پھٹنے لگا تھا کہ آنے والے اوقات اس سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوں گے۔ ہر گھنٹے بعد جانے والی بجلی نے ان کے سارے کام کاج درہم برہم کر کے رکھ دیئے تھے۔ بجلی نہ آنے اور واشنگ مشین نہ چلنے سے میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ آخرکار خاتون کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئیں۔ انہیں اس احساس نے ہلکان کئے رکھا کہ ان کے تمام عزیز و اقارب نے تو یو پی ایس اور جنریٹر لگوا لئے تھے لیکن ان کی مالی حالت اس سہولت کی متحمل نہیں تھی۔ بچے الگ احساس کمتری کا شکار تھے۔ اس مسلسل ذہنی کرب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز انہیں ماہر نفسیات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے رجوع کرنا پڑا۔ اس نے سردرد، بلڈ پریشر اور ڈپریشن کی وجہ مسلسل بے آرامی، نیند کی کمی اور احساس کمتری بتائی۔ وہ نسخہ لے کر گھر آ گئیں لیکن ادویہ استعمال نہ کیں کیونکہ جاننے والوں نے مشورہ دیا کہ اگر ایک بار خواب آور دواؤں کی عادی ہو گئی تو ساری عمر جان نہیں چھوٹے گی۔ سو انہوں نے ''حالات کے جہنم'' کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ شوہر کا بھی یہی خیال تھا کہ جب تک لوڈشیڈنگ کا عذاب ختم نہیں ہوتا، زندگی میں سکھ چین بھی نہیں آ سکتا۔

ملک میں یہ واحد خاتون نہیں جنہیں بجلی کے بحران نے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ اگر آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو آپ کو ہر دوسرے گھر بلکہ ہر گھر میں لوڈشیڈنگ کے ڈسے، توانائی کے بحران کے ستائے افراد دکھائی دیں گے۔ ان کی دماغی اور ذہنی کیفیت اس بات کی عکاسی کر رہی ہوگی کہ ان کی زندگی سے روشنی چھن چکی ہے۔ دور جدید میں ایٹمی قوت ہونے کے باوجود اندھیرے ان کا مقدر بن گئے ہیں۔ پوری قوم کی ذہنی اور جسمانی کارکردگی روبہ زوال ہے۔

پاکستانی قوم جن منفی ذہنی تبدیلیوں، تباہ کن رجحانات، مایوسیوں اور ناامیدیوں سے دوچار ہے وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ ہم پہلے ہی دوسری اقوام سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ توانائی کا بحران ہمیں تباہی کے ایک ایسے گڑھے میں پھینک دے جہاں سے نکلنا ممکن ہی نہ ہو۔ پاکستان میں لوڈشیڈنگ ایک سازش ہے جس کے تحت قوم کو دانستہ ذہنی و جسمانی طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔

(روف ظفر کا فیچر جنگ ڈاٹ کام سنڈے میگزین 6 مئی سے اقتباس)

غالب اور بیگم غالب

غالب کی تحریروں میں ان کی ازدواجی زندگی کا متعدد مواقع پر ذکر آیا ہے لیکن چشم دید گواہ کی مدد کے بغیر یہ تعین کرنا ناممکن ہے کہ اس ذکر کا کتنا حصہ مزاحاً اور کتنا سنجیدگی سے قلم بند ہوا ہے تاہم حمید اللہ خاں نے اپنی تصویر کی تکمیل کے لئے غالب کے ''بیانات'' کے گہرے مطالعہ اور معتبر روایات دونوں سے کام لیا ہے اور ایک واضح نقش ابھارنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نواب سرور الملک کے حوالے سے غالب اور بیگم غالب کے تعلقات کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان دونوں میاں بیوی میں ہمیشہ ان بن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ مغرور و متکبر تھیں۔'' اس بیان کی مزید تقویت کے لئے معظم زمانی بیگم (بگا بیگم) دختر نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں (عارف کی بہو) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

راقم الحروف کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر غالب اور بیگم غالب کی زندگی کے آخری زمانہ کے متعلق چشم دید حالات سننے کا موقع ملا۔ ان کے الفاظ بھی یہی تھے کہ ''میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔'' بقول ان کے مرزا صاحب غصے میں آتے تو ان کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے ''میرا تو ناک میں دم کر دیا۔'' دوسری طرف بیگم غالب خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ اپنی بھتیجی (زمانی بیگم) سے کہتی تھیں ''تُو تو بچہ ہے بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کر بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔''

حمید اللہ خاں نے غالب اور بیگم غالب کے تعلقات پر روشنی ڈال کر اس سلسلے کے ان قیاسات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جو حالی اور اس کے بعد کے سوانح نگاروں کی متضاد آراء سے پیدا ہوئے

تھے مثلاً حالی لکھتے ہیں:

''چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی (غالب کی) گھٹی میں پڑی تھی، ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تکلفی پر معمول کر سکتا ہے۔''

اس کے برعکس ایک اور نقاد شیخ محمد اکرم کا یہ خیال ہے: ''مرزا کی تحریروں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو دام سخت ہی سمجھتے رہے۔''

غالب اور بیگم غالب کے تعلقات کی نوعیت کو پہلی مرتبہ واضح کرنے کے ساتھ حمید اللہ خاں نے ان کی کشیدگی کے اسباب کا بھی سراغ لگایا ہے۔ لکھتے ہیں: ''دولہا دلہن دونوں خود پسند اور تیز طبیعت کے مالک تھے۔ قدرتاً دونوں نے ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے کشمکش کی اور دونوں میں سے کسی نے آخر دم تک ہار نہ مانی۔''

امراؤ بیگم کی پرورش ناز و نعم کے عالم میں ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ غالب جوان ہو کر باپ دادا کی سپہ گری کی زندگی اختیار کرے گا اور امراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹ سسرال میں بھی حاصل ہو رہے گا لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسد اللہ بیگ نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ نکالی۔ تمام عمر بے کاری میں یا بے کار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی۔ غالب اور بیگم غالب میں جہاں طبیعتوں کے ''ایکے'' نے مستقل پھوٹ کی بنیاد ڈالی.....

وہیں اختلاف مزاج کے بعض پہلوؤں نے دونوں کی روحانی علیحدگی کو زیادہ مضبوط اور پائیدار کر دیا۔ مرزا الٰہی بخش خاں نے جب دنیا سے منہ موڑ کر تصوف اور ریاضت کی زندگی اختیار کی تو امراؤ بیگم کی فطری پارسائی کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ادھر غالب کی رندی اور وارفتگی کو زندگی کے اس تضاد سے کوئی سروکار نہ تھا..... ایک اور وجہ اختلاف دونوں میں ایک کی سنجیدگی اور دوسرے کی ظرافت تھی۔ غالب کے ٹھٹھے کی عادت اکثر مواقع پر امراؤ بیگم کو ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھوکھلا ہنسوڑ پن جس کے پیچھے بے اقبالی اور فاقہ مستی کا بھیانک چہرہ ہو، اس بی بی کے لئے کوئی معنی نہ رکھ سکتا تھا جسے اپنی وسیع برادری سے عزت و آبرو کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے خدا جانے کس کس طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔''

غالب کی اندرون خانہ ٹھٹھوں کے سلسلے کا ایک واقعہ بگا بیگم کی زبان سے یوں بیان ہوا ہے:

''برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ چچوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں بھی بیٹھی تھی۔ گاؤ تکیے کے کونے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا۔ ہو، میں اور میری بیوی، تم کیوں بیٹھی ہو؟'' میری ساس بولیں ''اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہیے۔ اب بہو مل گئی۔''

عہد و سوانح کے سلسلے کے مضامین کے ذریعے جہاں غالب کی زندگی کے بارے میں نئی باتیں سامنے آئی ہیں وہیں ایسی معلومات بھی فراہم ہو گئی ہیں جن سے غالب کے طرز زیست اور اخلاق و عادات سے متعلق پہلے سے موجود مواد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

(''نقوش غالب'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی کتاب سے اقتباس)

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی اردو افسانے کا وہ قطب مینار ہے جسے دیکھنے کے لئے فی الواقع پگڑی سنبھالنا پڑتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اس کے افسانے بڑے بڑوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عصمت نے ازخود کسی کی پگڑی نہیں اچھالی، پگڑی کا خود بخود اچھلنے کو جی چاہے تو اس میں عصمت کا کیا قصور کہ وہ تو بقول ممتاز مفتی پہلے پھلجھڑی تھی اب مکہ سے آئی ہوئی بی جمن معلوم ہوتی ہے۔ یہ بی جمن 1976ء میں پاکستان کی سیاحت کے دوران اسلام آباد بھی آئی اور اپنی مومن صورت کے باوصف لوگوں کو کافر بنا گئی۔

اس کے بالوں کی سفیدی اردو افسانے کی بے داغ آبرو، پیشانی کے سمٹاؤ میں یادوں کی خفی تحریریں، سکڑی ہوئی آنکھوں میں تجربات کی گہرائی، آنکھوں پر عینک، اپنے مخصوص انداز نظر کی دلیل، چہرے کا سانولا پن، فرحت اللہ بیگ کے اس دعویٰ کا ثبوت ہے کہ آخری عہد کے مغلوں کا یہی رنگ امتیاز تھا۔ دہرا جسم اب بھی اس کے سکول انسپکٹریس ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ آواز جیسے طبلے کی گھمک میں کانسی کے کٹوروں کی سنگت اور چہرے پر جوانی کا وہ کرب کہ ع

اللہ حشر میں نہ اٹھائے جواں مجھے

عصمت چغتائی سے پاکستان نیشنل سنٹر اسلام آباد کے ایک جلسے میں ملاقات ہوئی۔ یہ جلسہ اسی کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ جلسے کے دوران کچھ لوگوں نے اس سے افسانہ سنانے پر اصرار کیا۔ وقت کم تھا۔ مطالبہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عصمت اپنی سکول انسپکٹریس کو ساڑھی میں سمیٹے اٹھی اور مائیک پر آ کر بولی ''میں نے زندگی میں کسی کی بات نہیں مانی، آپ کی بات بھی نہیں مانوں گی۔''

حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا اور منتظمین کے چہرے آسودہ ہو گئے۔ مختصر سے مضامین پڑھے گئے۔ ایک صاحب نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آخر پوچھ ہی لیا کہ واہگہ کے اس پار سے جب بھی محبت اور دوستی کے پھول ادھر آتے ہیں تو ان سے بارود کی بُو کیوں آتی ہے؟

ممتاز مفتی نے عصمت آپا سے کہا ''ہم تو آپ کے خیالات سننے آئے ہیں اور آپ ہیں کہ کل سے ٹرخا رہی ہیں۔'' ''تو اور کیا کروں؟'' آپا نے جل بھن کر جواب دیا۔ میں پھر سوال کر بیٹھا ''آزادی، قوم کے شعور کی پختگی کے انتہائی مدارج میں ملتی ہے پھر ایسا کیوں ہوا کہ برصغیر کی آزادی کی مذمت میں سب سے زیادہ نظمیں، غزلیں اور افسانے اردو کے ترقی پسند ادیبوں نے لکھے؟ اسے سیاسی یا ادبی شعور کے کس کھاتے میں ڈالا جائے؟''

عصمت چغتائی جھٹ بولی ''ہم نے آزادی کی مذمت اس لئے کی کہ یہ عوام کے صحیح نمائندوں کے ہاتھ نہیں آئی بلکہ اس پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن اب ہمارے عوام کے صحیح نمائندوں کے ہاتھ آ گئی ہے میرا مطلب ہے ہاتھ آ رہی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی بیگم اختر جمال قدرے تلخ لہجے میں بولیں ''ہائے بھئی! چائے کی مناسبت سے ہلکی پھلکی باتیں کیجئے۔ عصمت آپا تھکی ہوئی ہیں۔''

(''دلائل'' امین راحت چغتائی..... کی کتاب سے اقتباس)

غزل

مرے ہم نفس مرے ہم نوا مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بلب مجھے زندگی کی دعا نہ دے
میں غم جہاں سے نڈھال ہوں کہ سراپا حزن و ملال ہوں
جو لکھے ہیں مرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے
نہ یہ زندگی مری نہ یہ داستاں مری داستاں
میں خیال و وہم سے دور ہوں مجھے آج کوئی صدا نہ دے

مرے گھر سے دور ہیں راحتیں مجھے ڈھونڈتی ہیں مصیبتیں
مجھے خوف یہ کہ مرا پتہ کوئی گردشوں کو بتا نہ دے
مجھے چھوڑ دے مرے حال پر ترا کیا بھروسہ ہے چارہ گر
یہ تری نوازش مختصر مرا درد اور بڑھا نہ دے
مرا داغ دل سے ہے روشنی اسی روشنی سے ہے زندگی
مجھے ڈر ہے اے مرے چارہ گر یہ چراغ تو ہی بجھا نہ دے
وہ اٹھے ہیں لے کے خم و سبو ارے او شکیل کہاں ہے تو
ترا جام لینے کو بزم میں کوئی اور ہاتھ بڑھا نہ دے
(شکیل بدایونی)

خدا کے نام پر دھوکہ

آج کوئی حقیقی صوفی نہیں اگر ہے تو وہ جدید علوم سے بے بہرہ ہونے کے باعث ماڈرن دماغ کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ رہے آستانے تو وہاں بیٹھے لوگ چھوٹی موٹی پیراسائیکالوجیکل طاقتوں کے ذریعے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں، افریقہ کے ڈک ڈاکٹروں اور سرکس کے جادوگروں میں کوئی فرق نہیں بلکہ وہ لوگ ان سے بہتر ہیں کیونکہ وہ لوگ خدا کے نام پر دھوکہ تو نہیں دیتے۔ پروفیسر پھونکوں، تعویزوں، سایوں، بھوت پریت اور اثر بد کے ذکر پر قہقہہ لگا کر کہتا ہے ''بے وقوف لوگ آج کے ذہین اور تعلیم یافتہ انسان کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس کا کہنا ہے کہ اسے آج تک سفلی علوم کا کوئی ماہر نہیں ملا جو ملا فراڈ نکلا.....

یہ لوگ عوام کی توہم پرستی کیش کراتے ہیں۔

حاجی لق لق

روز اول سے موت و حیات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ انسان پیدا ہوتے ہیں اور وقت معین پر دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ان کی یاد دلوں میں تازہ رہتی ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تصور بھی ذہنوں سے اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ گویا وہ ہم

تمھیں کتنا چاہتے ہیں

کبھی تم نے یہ بھی سوچا
کہ تمہارے دل گرفتہ
تمہیں کتنا چاہتے ہیں؟
تمہیں زندگی سے بڑھ کر
جو عزیز ہم نے جانا
سو، کوئی سبب تو ہوگا
کبھی تم نے یہ بھی سوچا؟
ہر شام منتظر تھے
کہیں قمقمے اجالے
کہیں تتلیاں لبوں کی
کہیں پھول جیسے عارض
کہیں قمقموں سی آنکھیں
یہ جو چارہ گر ہمارے
کوئی ساعت رفاقت
سر شام مانگتے تھے
انہیں کیا خبر کہ ہم نے
تمہیں سونپ دی ہیں راتیں
تمہیں دان کی ہیں آنکھیں
کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہارے دل گرفتہ
پس بام و در اکیلے
کسی شمع سوختہ سے
یہ جو کر رہے ہیں باتیں
تمہیں کتنا چاہتے ہیں
تمہیں روز و شب کے دکھ میں
کبھی بھولنا بھی چاہیں
تو کبھی نہ بھول پائیں
کہ یہ عہد زندگی ہے
جسے توڑنا بھی چاہیں
تو کبھی نہ توڑ پائیں

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سے تھے ہی نہیں۔ لیکن ان میں بعض عظیم ہستیاں جنم لیتی ہیں جن کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے انہیں جلد فراموش نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی موت کے زخم کو مندمل کرنے کے لئے وقت کو بھی ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہی وہ عظیم لوگ ہیں جن کے ذریں کارنامے انہیں بقائے دوام عطا کرتے ہیں۔ ان عظیم شخصیات میں علماء، صلحاء، فنکار، ادیب اور دانشور شامل ہیں جو ملک و قوم کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ ایسی عظیم شخصیات کو غالب خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ضلع لاہور کی تحصیل قصور کے قصبہ پٹی (Patte) کے ایک معروف ظرافت نگار اور اہل قلم عطا محمد چشتی المعروف حاجی لق لق بھی انہی دانشوروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ملک و قوم کے لئے بہت سا علمی و ادبی سرمایہ چھوڑا۔

کسی بھی ملک یا قوم میں کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ملک و ملت کے لئے باعث فخر ہوتے ہیں۔ حاجی لق لق بھی ان مایہ ناز اکابرین میں سے ایک تھے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کا نام اور ان کا کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے اپنی انتھک اور بے لوث علمی و ادبی خدمات سے اپنی زندگی ہی میں وہ شہرت پائی جس پر لوگ رشک کرتے ہیں۔ میر بھی ایسے ہی عظیم لوگوں کے لئے کہتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلے ہیں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عطا محمد تو ان کا اصل نام تھا پھر وہ لق لق کے نام سے کیوں مشہور ہوئے۔ اس سلسلہ میں حاجی لق لق کے بیٹے عبدالرشید بدر چشتی کی وضاحت کے مطابق ''لق لق'' ایک ایسا پرندہ ہے جو حج کے دوران سعودی عرب کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ حاجی صاحب کو یہ پرندہ پسند تھا لہٰذا انہوں نے اپنے اصل نام ابوالعلاء عطا محمد چشتی کی بجائے لق لق لکھنا پسند کیا اور پھر اس نام (لق لق) سے معروف ہوئے جبکہ ''لق لق'' کی وضاحت کرتے ہوئے شبلی ایم کام لکھتے ہیں:

''لق لق دراصل ایک سیلانی پرندے کا نام ہے جو عراق میں پایا جاتا ہے اور مسجدوں کے گنبدوں پر بسیرا کرتا ہے۔ ابوالعلاء چشتی کو اس پرندے کی عادات و خصائل اس درجہ پسند تھیں کہ انہوں نے اپنا قلمی نام بھی یہی رکھ لیا۔ اردو صحافت میں چونکہ یہ نام انوکھا اور دلچسپ تھا اس لئے بہت جلد زبان زد خلائق ہو گیا۔''

حاجی لق لق اپنے قلمی نام ''لق لق'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بعض حضرات خطوں کے ذریعے میرے قلمی نام ''لق لق'' کی وجہ تسمیہ پوچھا کرتے ہیں اس لئے میں بازیابی چاہتا ہوں کہ اپنے ''اسم گرامی'' یا یوں کہیے اسم ''طیوری'' کی تشریح کر دوں۔ میں تقریباً پانچ سال تک عراق میں رہا ہوں۔ وہاں لم ڈھینگ قسم کا ایک پرندہ ہوتا ہے جسے حاجی لق لق کہتے ہیں۔ حاجی اس لئے کہ ایک خاص موسم میں یہ ہجرت کر کے کہیں دوسرے ملکوں میں چلا جاتا ہے اور کچھ عرصہ بعد پھر واپس آ جاتا ہے۔ عراق والوں کا خیال ہے کہ حج کرنے کے لئے جایا کرتا ہے۔ میری ٹانگیں ذرا لمبی ہیں اور حاجی لق لق پرندے کی ٹانگیں بھی طویل ہوتی ہیں اس لئے میرے عرب دوست اسی رعایت سے حاجی لق لق کہا کرتے تھے۔ جب میں نے ہندوستان آ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دنیائے صحافت میں قدم رکھا تو مجھے ظریفانہ رنگ میں لکھنے کا خیال بھی آیا۔ اس کے ساتھ یہ فکر ہوئی کہ اس رنگ میں لکھنے کے لئے کوئی قلمی نام ہونا چاہیے۔ مجھے فوراً اس نام کا خیال آیا جس سے میرے عرب دوست مجھے یاد کرتے تھے یعنی حاجی لق لق۔

المختصر ایک پرندہ ہے جس کے اوصاف لق لق کو پسند تھے اور انہوں نے اسے اپنا قلمی نام رکھ لیا۔

(شاہین اختر صاحبہ کا تحقیقی مطالعہ مجلّہ ''معیار'' 7 اسلام آباد سے اقتباس)

اپنا گریباں چاک

ترکی سے واپسی کے چند روز بعد یعنی 31 دسمبر 2000ء کی شام غسل خانے میں نہاتے ہوئے میرا پاؤں فرش پر لگی نئی ٹائلوں پر پھسلا۔ میں بُری طرح گرا اور میرے کولہے کی ضمیر بون فریکچر ہوگئی۔ خدا جانے یہ سزا کس کی طرف سے ملی شیطان کی طرف سے؟ یا خدا کی طرف سے؟ یا شاید نیک لوگوں کی بد دعا سے؟ سرجری کرانی پڑی۔ کولہے میں دو کیل ٹھونکے گئے۔ ہفتہ بھر شیخ زید ہسپتال میں رہا۔ ارشاد حسن خاں چیف جسٹس سپریم کورٹ مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔

اس حادثے نے زندگی میں پہلی بار مجھے احساس دلایا کہ میں اب جوان نہیں رہا۔ میں ویسے تو کم بیمار رہا ہوں مگر ستر برس کی عمر میں داخل ہونے پر ابتدا ''بلڈ پریشر'' کے عارضہ سے ہوئی۔ ایک شام سیر کرتے ہوئے میری بائیں آنکھ کے سامنے دھبہ سا آ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی پتنگا میری آنکھ میں گھس گیا ہے مگر آنکھ ملنے سے دھبہ غائب نہ ہوا۔ ٹیسٹ وغیرہ کرائے۔ معلوم ہوا کہ آنکھ کی پتلی کو خون پہنچانے والی رگ بلڈ پریشر کے سبب پھٹ گئی ہے اور سیاہ دھبہ دراصل ہیمبرج کے باعث نظر آتا ہے۔ علاج سے آنکھ تو ضائع نہ ہوئی۔ دھبہ چلا گیا مگر بینائی میں خاصا فرق پڑ گیا۔ بلڈ پریشر کو قابو میں رکھنے کے لئے دوائیاں کھانی شروع کیں۔ پھر نیویارک میں انجیو پلاسٹی بھی ہوئی مگر غسل خانے میں گرنے اور کولہے کی ہڈی فریکچر ہونے کے سبب مجھ پر ڈپریشن طاری ہوگیا۔ میں اپنے آپ کو اپاہج اور معذور محسوس کرنے لگا۔ میں ہر روز ایک گھنٹہ تیز چلنے کا عادی تھا۔ میں مغربی رقص کا دلدادہ تھا مگر اب گھنٹوں بیٹھا بغیر کسی سوچ اور موضوع کے سوچتا رہتا اور اگر سوچ کا کوئی موضوع سوچنے میں کامیاب ہو جاتا تو کبھی تخیل میں سیڑھی لگا کر اپنے آپ کو آسمان پر چڑھتا دیکھتا۔ کبھی نیوکلیئر بم کے پھٹنے سے اسرائیل اور امریکہ کی تباہی کے مناظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے۔ نہ پڑھنے کو جی چاہتا نہ لکھنے کو نہ بولنے کو۔ ''افسردگی'' یا ''ڈپریشن'' بجائے خود ایک عارضہ ہے۔ اس کا فوری علاج نہایت ضروری ہے ورنہ بگڑ جائے تو تخیل اور حقیقت میں امتیاز نہیں رہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا جسم ہے جس میں دماغ بھی شامل ہے۔ بڑھاپے کے سبب پہلے تو جسم میں دردیں نکلنا شروع ہوتی، گردن، کندھے، پیٹھ، کمر، گھٹنے ان دردوں کا نشانہ بنتے ہیں پھر کان اونچا سننے لگتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ نقطے سے تیرنے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں یوں لگتا ہے جیسے مچھر ہوں اور ہاتھ بے اختیار اٹھ کر آنکھوں کے قریب تالی بجا کر انہیں مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یادداشت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی چہرہ یاد رہتا ہے مگر نام بھول جاتا ہے اور کبھی نام یاد رہتا ہے مگر چہرہ بھول جاتا

ہے۔ بعض اوقات اچھے بھلے جانے پہچانے، پہچانے نہیں جاتے۔ بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اسی طرح بڑھتی عمر کے ساتھ جب قوت مردمی رو بہ تنزل ہونے لگتی ہے تو ابتدا میں یہ بڑی تشویش کا باعث بنتی ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دراصل شہوت کے ساتھ ہر مرد کی انا کی وابستگی ہے اس لئے اس کمزوری کو صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ بعض اصحاب میں وقت گزرنے کے ساتھ یہ خواہش ہی مر جاتی ہے۔ یوں وہ سٹیج آ جاتی ہے جب انسان مصلے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتا ہے لیکن بعض اوقات ایسی کمزوریوں کے باوجود انسان کے اندر کا حیوان باہر جھانکنے سے باز نہیں رہتا۔

رومی، گوئٹے اور اقبال ان فلسفی شعراء میں سے ہیں جو انسانی ارتقاء کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں کی بلکہ حیات کے کئی ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان انسان کے مرحلہ تک پہنچا ہے اور ابھی اس نے مزید کئی ارتقائی منازل طے کر کے اس مقام تک پہنچنا ہے جسے انجیل ''انسان کامل'' ابن ماجہ ''متوحد'' رومی ''انسان برتر'' نطشے ''مافوق الانسان'' اور اقبال ''ہمکار خدا'' کا نام دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ میری نگاہ میں تو انسان کے اندر رینگنے والے کیڑے مکوڑے، کانٹے دار پودے اور جھاڑیاں، پرندے، خونخوار حیوان وغیرہ یعنی اس کے آباء و اجداد ابھی تک زندہ موجود ہیں۔ خدا کے نازل کردہ مذاہب یا ادیان بھی اس کے اندر کے حیوان کو مستقلاً زیر نہیں کر سکے۔ مذہبی جبر یا ثقافتی رواداری سب اسے قابو کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس اندر کے حیوان کو بعض لوگ شیطان سمجھتے ہیں مگر شیطان تو اپنے تکبر کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا۔ انسان کے معتوب ہونے کا باعث تکبر نہیں بلکہ اس کی بھوک اور شہوت، حیوانی خصوصیات ہیں۔

(جسٹس (ر) جاوید اقبال کی کتاب سے اقتباس)

منہ کا سرطان

جدید طبی تحقیق اور میڈیکل سائنس کی روز افزوں ترقی نے انسانی زندگی کو سہل اور محفوظ بنا دیا ہے لیکن بعض کاروباری طبقوں نے عام لوگوں کی صحت عامہ کے بارے میں عدم واقفیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں جان لیوا مشاغل میں الجھا دیا ہے جس کی وجہ سے سگریٹ، پان، بیڑی، گٹکا، نسوار اور اسی طرح کی دیگر مضر صحت چیزوں کے عادی نہ صرف موذی امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں بلکہ شعبہ طب سے وابستہ ماہرین کی ان کاوشوں پر بھی پانی پھیر رہے ہیں جو وہ انسانی زندگی کو محفوظ بنانے کے لئے بروئے کار لا رہے ہیں۔ حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ مضر صحت اشیاء کے استعمال سے جہاں معدہ، آنتیں، گردے اور دیگر انسانی اعضاء متاثر ہوتے ہیں وہیں ایسی چیزیں منہ کے سرطان کا بھی سبب بن رہی ہیں۔

ایک ڈینٹسٹ (dentist) ڈاکٹر محمد اشفاق کے مطابق دانت کی معمولی تکلیف کے باعث آنے والے اکثر مریضوں کو جب چیک کیا جاتا ہے تو یہ ہولناک انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی معمولی تکلیف سرطان جیسے موذی مرض میں تبدیل ہو چکی ہے۔

(''صحت و فٹنس'' جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

قیمتی پتھر

ایک طرف تو جواہرات کی عجیب و غریب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرامات پر یقین کیا جاتا ہے تو دوسری طرف ان خیالات کو ضعف الاعتقادی کا نام بھی دیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو زمانۂ جاہلیت کے ان گزرے ہوئے لوگوں کی پرچھائیں کہا جاتا ہے جو خدا کو بھول کر ان بے جان پتھروں کو پوجا کرتے تھے۔ قیمتی پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں یاقوت، مرجان اور موتی کا ذکر کیا گیا تاہم یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان کے اثرات ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کیا ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر پتھروں کی تجارت اور جواہرات کا استعمال مسلسل ہو رہا ہے۔ جواہرات کی چمک دمک ہر دور میں انسانی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہی ہے اور ان کا جمالیاتی اور صنعتی پہلو بھی اپنی جگہ اہم ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ٹیپو سلطان شہید بھی پتھروں اور ستاروں پر یقین رکھتے تھے۔ اسی طرح مغلوں کے طرز تعمیر میں بھی پتھروں کی کشیدہ کاری واضح نظر آتی ہے۔ آج کل فٹ بال ٹیموں کے اکثر کھلاڑی بھی اپنے ہاتھ میں ہزاروں ڈالر مالیت کے ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان ہی کی بدولت کامیابیاں حاصل کرتے ہیں حالانکہ کامیابی تو محنت اور ہمت سے ملتی ہے۔ بہرحال پتھروں کے انسانی زندگی پر اثرات کے حوالے سے بے شمار کہانیاں مشہور ہیں اور پتھروں کے بارے میں مختلف عقائد بھی ہیں۔ بعض تو توہمات کا بھی شکار ہیں لیکن قیمتی پتھروں کا ایک باقاعدہ علم ہے اور بادشاہوں کے درباروں سے عام بازاروں تک اس علم کو جاننے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ کامیابی کی منازل طے کرنے والے کبھی کوئی پتھر نہیں پہنتے بلکہ وہ ان پتھروں کا استعمال ایک اضافی اور غیر ضروری کوشش گردانتے ہیں جبکہ گلیوں، بازاروں اور مزاروں میں ایسے متعدد ملنگ، فقیر دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے ہاتھوں کی انگلیاں قیمتی پتھروں سے جڑی انگوٹھیوں سے مزین ہوتی ہیں مگر وہ ساری عمر مست ملنگ ہی رہتے ہیں۔ جہاں تک پتھروں سے متعلق پائے جانے والے خیالات و نظریات کا تعلق ہے تو بازاروں میں موجود پتھروں سے شناسائی رکھنے والے ماہرین میں سے ہر ماہر کی رائے مختلف ہی ہے اور ان کے اثرات کے حوالے سے نظریات بھی مختلف ہیں۔ اعتقاد رکھنے والوں کے پاس بھی مختلف دلائل ہیں اور نہ رکھنے والوں کے پاس بھی۔

منٹو

زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا۔ سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور نمایاں ہو جائے۔

(منٹو)

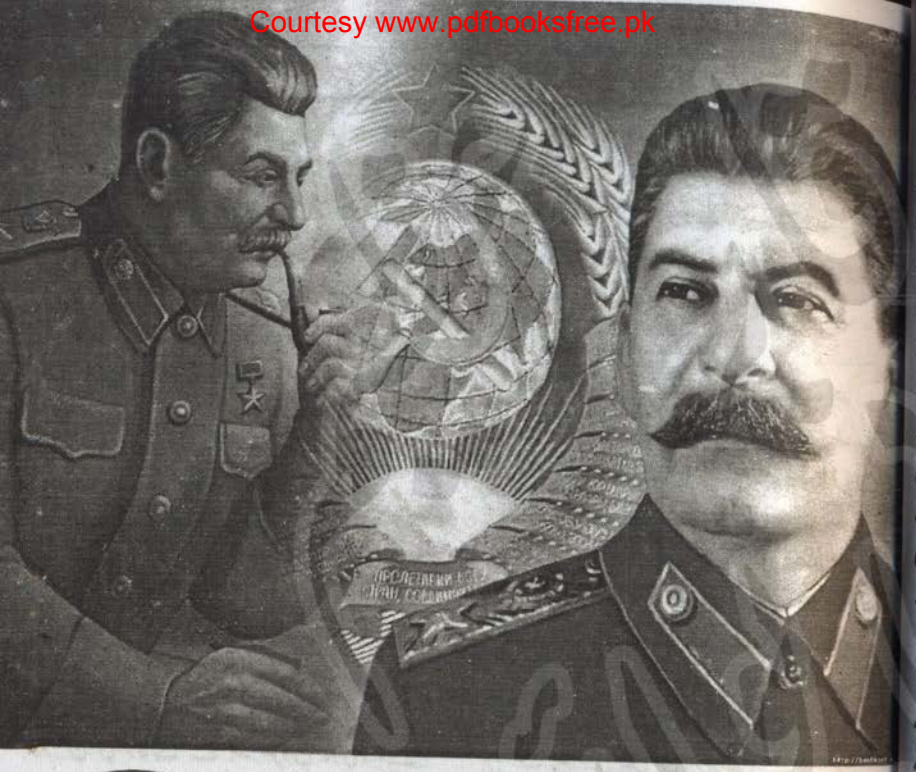

جوزف سٹالن
(1879ء — 1953ء)

مائیکل ہارٹ
مترجم: عاصم بٹ

جدید دور کے سفاک ترین آمر کی داستان..... اس نے اپنی زندگی میں لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا یا جبری مشقت کی عقوبت گاہوں میں بھیجا یا انہیں فاقہ دے کر مار ڈالا!

سٹالن جس کا اصلی نام آئیوسف وساریونووچ ذوگاشویلا تھا، کئی سال تک سوویت یونین کا آمر رہا۔ وہ جارجیا (کاکسس) قصبے ''گوری'' میں 1878ء میں پیدا ہوا۔ اس کی مادری زبان جارجین تھی۔ یہ روسی زبان سے خاصی مختلف ہے جسے اس نے بعد میں سیکھا اور جسے ہمیشہ جارجین لہجہ کے ساتھ بولتا تھا۔

سٹالن کی پرورش غریب ماحول میں ہوئی۔ اس کا چمار باپ ایک شرابی تھا اور بیٹے کو بے تحاشا مارتا تھا۔ وہ گیارہ برس کا تھا جب اس کا باپ چل بسا۔ آئیوسف نے ''گوری'' میں ہی ایک کلیسائی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر نوجوانی میں ''تفلس'' میں الہیاتی علوم کے مدرسہ میں داخل ہوا۔ 1899ء میں مخرب خیالات کے پرچار کے الزام میں اسے مدرسہ سے خارج کر دیا گیا۔ وہ خفیہ مارکسی تحریک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شامل ہوگیا، پھر جب تنظیم میں نفاق پیدا ہوا، وہ "بالشویک" دھڑے کا حامی بن گیا۔ 1917ء تک تمام سالوں میں وہ تنظیم کا ایک فعال رکن رہا۔ قریب چھ بار وہ گرفتار ہوا (لیکن ایک تو اسے کم سزا ملی، دوئم وہ ایک سے زائد مرتبہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا سو یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ مخالف سرکاری جماعت ہی کا کارندہ تھا) اسی عرصہ میں اس نے ایک مناسب فرضی نام "سٹالن" (آہنی انسان) اختیار کیا۔

سٹالن نے 1917ء کے اشتمالی انقلاب میں کوئی حقیقی اہم کردار ادا نہیں کیا تاہم اگلے دو برس میں اس کی فعالیت بہت بڑھی۔ 1922ء میں اشتمالی جماعت کا سیکرٹری جنرل بن گیا۔ اس عہدے سے اسے جماعت کی انتظامیہ میں گہرا اثر ورسوخ حاصل ہوا جس نے اقتدار کی جنگ میں، جو لینن کی وفات کے بعد شروع ہوئی، اسے کامیابی دلوائی۔

لینن واضح طور پر لیون ٹراٹسکی کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ اپنی سیاسی وقعت میں لینن نے کہا کہ سٹالن ایک سفاک آدمی ہے اور اسے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے فوراً برخاست کر دینا چاہیے تاہم 1924ء کے اوائل میں لینن کی وفات کے بعد سٹالن اس وصیت نامہ کو دبانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے "پولٹبرو" کے دو اہم اراکین لیو کامینوف اور گریگوری لیونووف کے ساتھ اتحاد بنایا اور ایک "ٹرائیکا" بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ انہوں نے مل کر ٹراٹسکی اور اس کے حامیوں کو شکست دی۔ تب سیاسی جنگ کا کھلاڑی زینوووف اور کامینوف کی طرف مڑا اور انہیں بھی مات دی۔ بائیں بازو کی متحارب قوتوں (ٹراٹسکی، کامینوف، زینووف اور ان کے طرفداروں) کو اقتدار کی جنگ میں شکست دینے کے بعد سٹالن نے اپنے اہم سیاسی منصوبوں پر کام شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سٹالن اشتمالی جماعت کے دائیں دھڑے کی طرف متوجہ ہوا جو پہلے اس کے حلیف تھے، اور انہیں بھی شکست دی۔ 1930ء کی دہائی میں وہ سوویت یونین کا مطلق العنان آمر بن گیا۔

1934ء میں اقتدار کے ہاتھ آجانے کے بعد سٹالن نے سیاسی معزولیوں کا ایک خوفناک سلسلہ شروع کیا۔ ان معزولیوں کا آغاز یکم دسمبر 1934ء کو ہونے والا ایک اعلیٰ اشتمالی افسر اور سٹالن کے مشیروں میں سے ایک سرگائی کروف کے قتل کے بعد ہوا۔ تاہم یہ امر بجا معلوم ہوتا ہے کہ سٹالن نے خود کروف کے قتل کے احکامات جاری کیے تھے۔ کچھ اس لیے کہ وہ کروف سے خلاصی چاہتا تھا، دوئم آئندہ ہونے والی سیاسی معزولیوں کو جواز فراہم کرنا چاہتا تھا۔

اگلے چند برس میں ان افراد میں سے بیشتر کو غداری کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کروا دیا گیا جو 1917ء کے اشتمالی انقلاب کے سرکردہ راہنماؤں میں سے تھے اور جنہوں نے لینن کے ساتھ کام کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر نے عوامی عدالتوں میں اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی کہ تھامس جیفرسن صدر بننے کے بعد ان تمام احباب کو گرفتار کر لیتا جنہوں نے اعلان نامہ آزادی اور آئین پر دستخط کیے تھے، سب پر غداری کا مقدمہ چلواتا اور انہیں عوامی عدالتوں میں اعتراف جرم پر مجبور کرتا۔ 1932ء میں جس شخص گیزک یا گودا نے ان ابتدائی معزولیوں کی نگرانی کی تھی خود اسی پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے غداری کا الزام قبول کیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ اسی معاملے میں اس کے جانشین نکولائی یازوف کو بھی عہدے سے معزول کر کے قتل کیا گیا۔

1930ء کی دہائی میں ہونے والی جبری معزولیوں کا دائرہ کار اشتمالی جماعت اور سوویت مسلح افواج تک دراز تھا۔ ابتداً ان کا ہدف اشتمالیت کے مخالفین یا دیگر انقلابی نہیں تھے (ان میں سے بیشتر کو لینن کے دور میں ہی مار دیا گیا) اس کی بجائے ان معزولیوں کا شکار اشتمالی جماعت کے اراکین ہی تھے۔ سٹالن نے زاروں کی پولیس سے زیادہ بے دردی کے ساتھ اشتمالیت پسندوں کا خون بہایا۔ مثال کے طور پر 1934ء میں جماعت کی کانگریس میں منتخب ہونے والے مرکزی کمیٹی کے اراکین میں دو تہائی سے زائد ان معزولیوں کے دوران ہلاک کر دیئے گئے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ سٹالن کا بنیادی مقصد ملک کے اندر ایک مطلق العنان حکومت کا قیام تھا۔

سٹالن کے خفیہ پولیس کے ناجائز استعمال، جابرانہ گرفتاریوں اور قتل و غارت گری اور اپنی حکومت کے لیے معمولی سے بھی خطرناک شخص کو طویل عرصہ بامشقت اسیری میں رکھنے کے عمل نے عوام کو دھمکا کر اطاعت پر مجبور کیا۔ 1930ء کی دہائی کے اختتام تک وہ جدید دور کی غالباً انتہائی مطلق العنان آمریت استوار کر چکا تھا۔ ایسا حکومتی ڈھانچہ جس کا اثر ونفوذ زندگی کے ہر شعبے میں تھا اور جس کے تحت کوئی عوامی آزادی ممکن نہیں تھی۔

سٹالن کی وضع کردہ معاشی پالیسیاں زراعت کے جبری ارتکاز پر مبنی تھیں۔ یہ پالیسی کسانوں میں انتہائی ناپسندیدہ تھی جبکہ اس کی مخالفت بھی خوب ہوئی۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل میں سٹالن کے فرمان کے تحت لاکھوں مزدوروں کو مار دیا گیا یا فاقوں سے وہ خود مر گئے۔ سو آخر یہ پالیسی مروج ہوگئی۔

ایک اور پالیسی جو سٹالن نے جبراً عائد کی وہ سوویت یونین میں صنعتکاری کا سریع الرفتار فروغ تھا۔ یہ ایک حد تک پانچ سالہ منصوبوں کے ایک سلسلہ کے ذریعے مکمل ہوا، جسے روس کے علاوہ کئی ممالک نے اخذ کیا۔ متعدد ناہمواریوں کے باوجود سٹالن کا صنعت وحرفت کے فروغ کا منصوبہ مختصر مدت میں کامیاب ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں بے پایاں نقصانات کے باوجود سوویت یونین اس جنگ کے ملبے سے دنیا کی دوسری عظیم صنعتی طاقت کی حیثیت سے ابھرا (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سٹالن کی وضع کردہ زرعی اور صنعتی پالیسیوں نے سوویت یونین کو شدید نقصان پہنچایا)۔

اگست 1939ء میں ہٹلر اور سٹالن نے معروف عدم جارحیت کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اگلے دو ہفتوں میں ہٹلر نے مغربی سرحد سے پولینڈ پر حملہ کیا۔ چند ہفتوں بعد ہی سوویت یونین مشرقی سمت سے پولینڈ پر حملہ آور ہوا اور ملک کے مشرقی نصف حصہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اسی برس سوویت یونین نے تین آزاد ریاستوں لٹویا، لیتھوینیا اور اسٹونیا پر حملہ کر دیا۔ تینوں ریاستوں نے بغیر جنگ کیے ہتھیار ڈال دیئے اور ریاست ہائے متحدہ سوویت روس سے الحاق کر لیا۔ اسی طور حملے کی دھمکی کے زیر اثر رومانیہ کا ایک حصہ بھی روس سے ملحق ہوا۔ فن لینڈ نے ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ نتیجتاً روس نے حملہ کر کے فن لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اس جبری الحاق کے سلسلہ کے متعلق عموماً یہ معذرت پیش کی جاتی تھی کہ روس کو نازی حکومت کے متوقع حملہ کے پیش نظر دفاعی مقاصد کے لیے ان علاقوں کی ضرورت تھی تاہم جب جنگ تمام ہوئی اور جرمنی کو مکمل شکست ہوئی، سٹالن نے ان مقبوضہ علاقوں میں سے کسی کو آزاد نہیں کیا۔

جنگ عظیم دوئم کے اختتام پر روسی فوجوں نے مشرقی یورپ کے ایک بڑے حصہ پر تسلط جما لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سٹالن نے روس کے تخت اس تمام علاقہ پر اشتمالی حکومت قائم کرنے کے اس موقع سے بھرپور استفادہ کیا۔ یوگوسلاویہ میں بھی ایک مارکسی حکومت قائم ہوئی، چونکہ یوگوسلاویہ میں روسی فوجی دستے موجود نہیں تھے سو یہ روسی سلطنت کا حصہ نہیں بنے۔ مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کو یوگوسلاویہ کی مثال کی تقلید سے باز رکھنے کے لیے سٹالن نے مشرقی یورپ کے مقبوضہ علاقوں میں جبری معزولیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جنگ کے فوراً بعد کے دور میں "سرد جنگ" کا آغاز ہوا۔ اگرچہ کچھ ناقدین نے اس کے لیے مغربی راہنماؤں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ سرد جنگ کی بنیادی وجہ سٹالن کے توسیع پسندانہ عزائم تھے، اور اس کی یہ خواہش تھی کہ اپنے اشتمالی نظام اور روسی طاقت کو دنیا بھر میں رائج کیا جائے۔

جنوری 1953ء میں روسی حکومت نے اعلان کیا کہ ڈاکٹروں کے گروہ کو اعلیٰ روسی حکام کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس اقدام سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ سٹالن معزولیوں کا مزید ایک سلسلہ جاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاہم 5 مارچ 1953ء کو یہ تہتر سالہ بوڑھا آمر ماسکو میں کریملن میں فوت ہوا۔ اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا اور اعزاز کے ساتھ "ریڈ سکوائر" کے عجائب گھر میں لینن کی میت کے برابر عوامی نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔ بعد کے سالوں میں سٹالن کی توقیر میں بڑی تیزی سے کمی آئی جبکہ آج کل عمومی طور پر اسے تمام روس میں ایک مکروہ شخصیت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

سٹالن کی خانگی زندگی کامیاب نہیں تھی۔ 1904ء میں اس کی شادی ہوئی۔ تین سال بعد ہی اس کی بیوی تپ دق میں لاحق ہو کر مر گئی۔ ان کا واحد بیٹا جیکب جنگ عظیم دوئم میں جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ جرمنوں نے اسے قیدیوں کے تبادلے کے طور پر استعمال کرنے کی پیشکش کی، جسے سٹالن نے رد کر دیا، جیکب جرمن اسیری میں ہی مر گیا۔ 1919ء میں سٹالن نے دوسری شادی کی۔ اس کی دوسری بیوی نے 1932ء میں خودکشی کی حالانکہ افواہیں اس طور ہیں کہ سٹالن نے ہی اسے قتل کیا یا اسے مرجانے دیا۔ دوسری شادی سے اس کے دو بچے ہوئے۔ ایک بیٹا روسی فضائی فوج میں افسر تھا، بعد ازاں وہ کثرت مے نوشی میں مبتلا ہوا اور 1962ء میں فوت ہوا۔ سٹالن کی بیٹی سویتلانہ، سوویت یونین سے فرار ہو کر امریکہ میں جا بسی۔

سٹالن کی شخصیت کی سب سے اہم خصوصیت اس کی سفاکانہ طبیعت تھی۔ رحم کے لیے کسی طرح کی جذباتی درخواست اس پر معمولی اثر انداز بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک مریضانہ حد تک انتہائی شکی مزاج انسان تھا تاہم وہ ایک نہایت قابل انسان بھی تھا۔ بہت پرجوش، مستقل مزاج اور مکار انسان جبکہ غیر معمولی ذہانت بھی اسے حاصل تھی۔

وہ قریب صدی کے چوتھائی حصہ تک سوویت یونین کا آمر رہا، اور لاکھوں زندگیوں پر اس کے اثرات پڑے۔ اگر کسی آمر کے اپنی نسل پر مجموعی اثرات کا تعین اس طور پر کیا جائے کہ اس کے زیر حکومت عوام کی تعداد، اس کے ذاتی اختیارات اور اس کے جملہ دور اقتدار کا اس سے تناسب بنتا ہے تو غالباً تاریخ میں نمایاں ترین آمر ہوتا۔ اپنی زندگی میں سٹالن نے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا یا جبری مشقت کی عقوبت گاہوں میں بھیجا یا انہیں فاقہ دے کر مار ڈالا (اس حوالے سے صحیح ترین معلومات دستیاب نہیں ہیں کہ ہونے والی متعدد معزولیوں اور پھر اموات کی تعداد کیا ہے، تاہم یہ تیس ملین کے لگ بھگ ہے)۔

سو اس امر میں کچھ کلام نہیں رہ جاتا کہ سٹالن کے مختصر دورانیہ کے اثرات نہایت گہرے اور وسیع تھے۔ تاہم اپنے ہم عصر ایڈولف ہٹلر کی طرح (جس سے اکثر اس کا موازنہ کیا جاتا ہے) اس کے بارے میں بھی یہ امر واضح نہیں ہے کہ آئندہ ان کے اثرات کس قدر دیرپا ہوں گے۔

اپنی زندگی میں سٹالن نے روس کی سرحدوں میں توسیع کی۔ مشرقی یورپ میں ایک جسیم سلطنت قائم کی اور ریاست ہائے متحدہ سوویت روس کو ایک بڑی طاقت بنا دیا جبکہ دنیا کا کوئی گوشہ اس کے اثرات سے باہر نہیں تھا تاہم ماضی کے چند برسوں میں مشرقی یورپ کی یہ روسی سلطنت منہدم ہو گئی ہے جبکہ سوویت یونین پندرہ خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔

سٹالن کے دورِ حیات میں سوویت یونین ایک بڑی پولیس کی ریاست تھی لیکن سٹالن کی موت کے بعد خفیہ پولیس کی ہولناک گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آج روسیوں کو زیادہ شخصی آزادی حاصل ہے، جتنی آزادی ان کے ملک کی تاریخ میں کبھی انہیں نہیں ملی۔

سٹالن کا معاشی منصوبہ مارکس اور لینن کے افکار سے ماخوذ تھا جبکہ مارکس نے ان پالیسیوں کو تجویز کیا تھا اور لینن نے انہیں عملاً منطبق کرنے کی سعی کی۔ یہ سٹالن ہی تھا جو سوویت یونین میں بڑے پیمانے پر نجی کاشت کاری اور نجی کاروبار کو بند کروانے میں کامیاب ہوا تاہم وہ تمام پالیسیاں ناکامی کا شکار ہوئیں اور اب تو مکمل طور پر متروک ہو چکی ہیں۔

اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عمومی طور پر سٹالن کے مجموعی اثرات کے متعلق غلط اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جوزف سٹالن ایک طاقت کے خبط میں مبتلا آمر نہیں تھا جس نے ایک بڑے ملک پر پچیس برس حکومت کی۔ "سرد جنگ" کی بنیاد رکھ کر وہ اپنی موت کے بعد کئی سال تک دنیا کی تاریخ کو اثر انداز کرتا رہا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سمیت کسی جنگ نے دنیا پر ایسے گہرے اثرات نہیں چھوڑے جتنے سرد جنگ نے مرتب کیے۔ یہ فقط روس اور امریکہ ہی نہیں تھے جو متاثر ہوئے، دنیا کا ہر ملک اس کشمکش کے سفارتی اور معاشیاتی اثرات تلے آیا۔ جبکہ دنیا کے کئی ایک خطوں میں اس کی بدولت جنگیں چھڑیں۔ ان دو عظیم طاقتوں کے بیچ اسلحہ کی دوڑ، جو اگرچہ تاریخ کی گراں ترین اور سب سے بڑی اسلحہ کی دوڑ تھی، اس کشمکش کا فقط ایک ہی پہلو تھا۔ اس پر کھربہا ڈالر اُٹھ گئے۔ بدترین بات یہ ہوئی کہ کئی سال تک تمام دنیا نیوکلیائی جنگ کے خطرے تلے دبی رہی، جو تمام تہذیب انسانی کو صفحۂ ہستی سے حرف مکرر کی طرح مٹا سکتی تھی۔

سرد جنگ کے متعلق ایک غیر موافق تاثر ہی پایا جاتا ہے جبکہ اکثریت کی خواہش ہے کہ یہ کسی طور تمام ہو جائے لیکن سالہا سال سے مُردہ سٹالن کی طاقت میں کمی نہیں آئی اور وہ کسی بھی زندہ سیاسی شخصیت سے کہیں زیادہ ہمیں متاثر کر رہا ہے۔ تاریخ کی کسی بھی موثر شخصیت کی نسبت اس کے بارے میں یہ بات کہیں بجا ہو گی کہ "انسان جو برائی کرتا ہے، وہ اس کی موت کے بعد بھی موثر رہتی ہے؟"

سرد جنگ ختم ہو چکی ہے، اور سٹالن کے مکروہ اثرات بھی اب اپنے اختتام کو پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سٹالن کے جرائم کے لیے کچھ قصور وار لینن بھی ہے، جس نے سٹالن کی سفارش کی اور اس کے لیے جگہ بنائی۔ تاہم سٹالن تاریخ کی عظیم الجثہ شخصیت تھی۔ ایک سفاک ذہین انسان جسے جلد فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

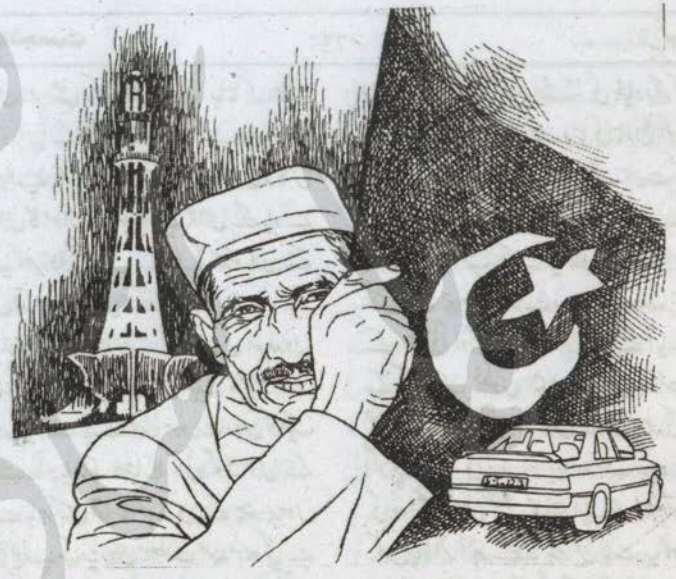

بڑا اندھیرا ہے

کس کس طریقے سے بہادر اور نادرہ کے والیوں نے اس کا استحصال نہیں کیا۔ جب ضرورت ہوئی روپیہ پھینک کر اسے خرید لیا۔ جب ضرورت نہ رہی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ جب مدد چاہی حاصل کر لی اور جب کوئی جرم گلے پڑ گیا تو اس کا الزام نادرہ پر لگا دیا کیونکہ وہ لاوارث تھی، کمزور تھی، بے سہارا تھی۔

ضمیر کو جھنجھوڑتی علاماتی تحریر جو ہمارے حالات کی ترجمان ہے

ہارون اشرف

وہ بستر مرگ پر بے بسی کے عالم میں اپنے آخری دن گزار رہا تھا..... موت اس کے جسم سے ہر لمحہ قطرہ قطرہ زندگی چھینتی جا رہی تھی اور اس کا نحیف بدن موت کے ہر وار سے کمزور تر ہو کر روح کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ اس کا کمزور جسم جسے لمبی بیماری نے کھا لیا تھا، اب مزید اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے اپنے جسم سے قوت کی آخری رمق تک چھین لی تھی اور زندگی کے طوفان کے سامنے ڈٹا رہا تھا۔

مگر اسے بستر پر بے بسی کی موت مرنا تھا..... اور ستم یہ تھا کہ اس کا سارا جسم اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا مگر دماغ اسی طرح چاک و چوبند تھا اور خیالات و تفکرات کا ایک ہجوم لئے ہر وقت اسے بے چین اور پریشان رکھتا تھا اور اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ میرے بعد میری بیٹی کا کیا ہوگا؟ ہر طرف چور اور لٹیرے ہیں۔ اپنوں اور غیروں میں کوئی فرق نہیں۔ کچھ نے میری زندگی میں ہی اپنے اصلی چہرے بے نقاب کر دیئے ہیں اور کچھ میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اپنے جگر گوشے کو کس کے حوالے کر کے جاؤں؟ کون اس کی ذمہ داری اٹھائے گا؟ کون اس کا والی بنے گا؟ ہر طرف اندھیرا ہے۔

نادرہ جان پدر! تجھے خدا کے حوالے کیا.....

شروع خزاں کی ایک ویران شام، سفید بے داغ بستر پر، ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ہر طرف سوگ کے سائے پھیل گئے۔ لوگ اسے یاد کر کے روتے رہے۔ لاکھوں کا مجمع ہو گیا۔ سارا شہر اس کے جنازے پر امڈ آیا۔ بڑی عزت کے ساتھ اسے لحد میں اُتارا گیا۔ اردگرد کوئی اور قبر نہیں تھی۔ ایک کھلا میدان تھا جس کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ اس شخص کے شایان شان ایک شاندار مقبرہ تعمیر ہو سکے مگر کسی نے نادرہ کی خبر نہ لی۔ اس کے سر پر کسی نے دست شفقت رکھ کر تسلی کے دو بول نہیں کہے۔ وہ جو اس کے باپ سے مخلص تھے، گھبرائے ہوئے پھر رہے تھے۔ اتنے سب منافقوں اور موقع پرستوں کے بیچ ان کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کونے میں بیٹھی اپنے باپ کو روتی رہی مگر اس کی سسکیاں کسی کو سنائی نہ دیں۔ اس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ تقدیر میں ٹھوکریں لکھی تھیں۔ بہت سے والیوں نے اس کی ذمہ داری سنبھالنی تھی اور اسے لُوٹ کر اور برباد کر کے چھوڑ دینا تھا۔

باپ کی موت کے کچھ دن بعد تک تو وہ مخلص ہاتھوں میں رہی مگر وہ ہاتھ کمزور تھے۔ یہ لوگ منظر سے ہٹے تو خود بخود اس کے گرد کچھ لوگوں کا حلقہ بن گیا۔ ان میں کچھ لوگ تو اس کے باپ کے زمانے کے تھے۔ اس کی خدمت کر چکے تھے اور یہی تمغہ سینے پر سجائے پھرتے تھے۔ باقی لوگ رفتہ رفتہ اس حلقے میں شامل ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر کو پہلے سے موجود حضرات نے متعارف کروایا تھا۔ یہ سب نادرہ کے والی تھے۔ ان میں ہمیشہ ایک شخص باقیوں کا سربراہ ہوتا تھا اور اس کے ماتحت نادرہ کی کفالت اور اس کے دیگر معاملات اور امور چلانے میں معاون ہوتے تھے۔ ان میں کچھ سنکی تھے، کچھ بیوقوف، کچھ لالچی اور کچھ بہت ہی چالاک تھے۔ کوئی نیک نیت انسان اگر اس حلقے میں نادرہ اور اس کے باپ سے وفاداری اور محبت سے مجبور ہو کر فقط خدمت کرنے کی غرض سے شامل ہو جاتا تو جلد ہی اسے بیوقوف بنا کر ایک طرف کر دیا جاتا۔

یہ سب اپنی پوجا کرتے تھے۔ اپنی ہی شخصیت کے دلدادہ تھے اور خودسری کے حصار میں قید تھے۔ ہر شخص اپنے مفاد اور خواہش کو مقدم رکھتا تھا۔ نادرہ کے علاوہ انہیں ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ ہر روز اس کے اردگرد ایک تماشا ہوتا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہانکتا تھا۔ ان کے چہروں، ان کی گفتگو، ان کی دلچسپیوں اور ان کی حرکتوں سے ان کی نیتیں اور اصلیت عیاں ہوتی تھی۔ ان کے بیچ بھی سازشیں چلتی رہتی تھیں۔ ماتحت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف رہتے تھے اور کبھی مل کر سربراہ کو بھی بے دخل کر دیتے تھے۔ نادرہ مجبور اور بے بس ان کے بیچ خاموشی اختیار کئے رہتی۔ ان سب کو نادرہ کا خیال صرف اسی وقت آتا جب اس سے کوئی فائدہ نکلتا ہو۔ ہر وقت کی ذہنی اذیت اور پریشانی کی وجہ سے اس کا وہ پہلے جیسا رنگ روپ نہ رہا اور اس کمسنی میں اس کی صحت گرنے لگی۔

اس کی زندگی کے سٹیج پر ہر شخص اپنے کردار میں نمودار ہوتا اور تماشا دکھا کر چلا جاتا مگر ان میں سے ایک بہت ہی گھاگ تھا۔ اس شخص کا نام ''شاطر'' تھا۔ وہ نادرہ کے باپ کی موت کے وقت سے اس صورتحال کو بہت دلچسپی اور غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی وہ نادرہ کے والی کے ایک اہم مشیر اور مددگار کی حیثیت سے اس حلقے میں داخل ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ حلقے میں اس کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔ اس کا رعب اور دبدبہ بھی ان سب سے زیادہ تھا۔ خوش شکل، دراز قد اور ہوشیار تھا۔ دوسروں کی بیوقوفیوں اور کمزوریوں پر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اسے ان سب کو آپس میں لڑا کر بہت لطف آتا تھا۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس سب کی کمزوریاں تھیں اور سازشی ذہن اسے شرارتوں پر اُکساتا تھا۔ نادرہ کا ہر نیا والی اسے اپنا دست راست، رازدان اور دوست سمجھتا تھا مگر وہ کب سے دل ہی دل میں نادرہ کی کفالت اور اس کی تمام تر دولت پر تصرف کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس آون جاون کے میلے کو ختم کر کے خود کو نادرہ کا مستقل اور مطلق العنان کفیل بنانا چاہتا تھا مگر ابھی وہ وقت ذرا دُور تھا..... ان سب کے ہوتے ہوئے نادرہ کو دشمنوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کی بربادی کا فریضہ تو خود اس کے والی پورا کر رہے تھے۔ طاقتور دشمن نے جب اس یتیم کے والیوں کا یہ حال دیکھا تو نادرہ کو کمزور جان کر دست درازیاں بڑھا دیں اور اسے نقصان پہنچانے لگا۔

شاطر اس خوش فہمی میں تھا کہ وہ سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے مگر ایک شخص اس سے بھی زیادہ عیار تھا اور شاطر کو بھی اس بساط پر محض ایک مہرہ سمجھتا تھا۔ اس شخص کا نام ''بہادر'' تھا اور اس کی طاقت کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ سب سے بڑا غنڈہ تھا اور سب لوگ اس سے دب کر رہتے تھے۔ اس سے بیر کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے برسوں میں اپنی بے تاج بادشاہت قائم کی تھی اور اپنے قہر کے زور پر حکومت کرتا تھا۔ بظاہر وہ بہت تہذیب یافتہ نظر آتا تھا مگر اندر اندر سبھی جانتے تھے کہ بہادر سے ڈر کر رہنا ہے۔ اس کے پاس وہ وہ ہتھیار اور ذرائع تھے جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے تھے۔ بے شمار دولت، اُجرت کے قاتلوں کی پوری فوج، جدید ترین اسلحہ، بہت سے جاسوس اور سب سے بڑھ کر اثر و رسوخ، خوف اور جعلی عزت جو باقی سب کو اس کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی تھی۔ بہادر دوسروں کے ساتھ ساتھ نادرہ کے معاملات پر بھی نظر رکھتا تھا اور تھوڑی بہت جاسوسی بھی ہوتی تھی مگر بدنصیبی اس یتیم زادی کی کہ ایک دن بہادر کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے اسی وقت یہ طے کر لیا کہ جیسے بھی ہو وہ اس حُسن کے پیکر کو اپنے دشمن ''سرخ'' کے خلاف استعمال کرے گا۔

نادرہ کے والیوں سے بات چیت ہوئی۔ وہ سبھی بہادر کی حمایت کرنے کو ترس رہے تھے۔ شاطر نے خصوصاً اس تجویز کی بھرپور حمایت کی اور دشمن کی طرف سے جو خطرہ تھا اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جس سے سب مرعوب ہو گئے اور بہادر سے دوستی کر لینا ان سب کی نظر میں بہت اہم ہو گیا چنانچہ معاہدہ ہو گیا کہ کڑا وقت آنے پر بہادر نادرہ کی پوری حفاظت کرے گا۔

کچھ عرصے بعد جب آپس کے جھگڑوں اور سازشوں نے حلقے میں تقریباً سبھی کو نڈھال کر دیا تو شاطر نے اپنی سب سے اہم چال چلی اور نادرہ کی خراب صحت اور بُری حالت کا رونا رو کر، طاقت کے بل پر سب کو نکال دیا۔ اس نے نادرہ پر اپنا قبضہ مستقل اور مضبوط کرنے کے لیے اپنے ہر مخالف کو چاہے وہ نادرہ کا ہمدرد تھا یا دوسروں کی طرح مفاد پرست، بلاامتیاز نکال باہر کیا اور نادرہ کا سب کچھ بن بیٹھا۔

شروع کے دنوں میں شاطر نادرہ کو اچھا کھانا کھلا کر اور کچھ حقیقتیں چھپا کر واپس صحتمندی کی طرف لے آیا مگر نادرہ کا سودا ہو چکا تھا۔ وہ بہادر کی دولت اور اثر و رسوخ کے عوض بک چکی تھی اور بہادر نے اسے کہاں کہاں استعمال کرنا تھا، یہ طے ہو چکا تھا۔ بہادر بڑا بدمعاش تھا اور دُور کی سوچتا تھا۔ شاطر نے نادرہ کو سجا بنا کر بہادر سے متعارف کروا دیا۔ شروع شروع میں اس پر کوئی بھاری ذمہ داری نہ ڈالی گئی۔ بس بہادر کے دشمن ''سرخ'' کی تھوڑی بہت جاسوسی..... اس کے عوض بہت سی دولت شاطر کے

ہاتھ آ گئی۔ کچھ اس نے نادرہ کو دے دی اور کچھ نادرہ کی ملکیت کے معاملات اور دیگر امور میں لگا دی۔ خود ہڑپ کرنے کی اسے ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کا سارا فائدہ بالواسطہ اسی کو جاتا تھا۔

ایک دن دشمن سے لڑائی چھڑ گئی۔ شرارت شاطر کی تھی۔ جب لڑائی بڑھنے لگی تو وہ پریشان ہو گیا۔ سب کچھ اس کی امیدوں کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ نادرہ کی ملکیت کا وہ قیمتی حصہ جو دشمن نے نادرہ کے باپ کی زندگی میں ہی ہتھیا لیا تھا، تھوڑے بہت آدمی بھیج کر چھڑا لے گا مگر اس کے سارے اندازے اور تخمینے غلط نکلے۔ اب تو بات بڑھ گئی تھی اور دشمن کو زیادہ دیر روکنا ممکن نہیں تھا۔ نادرہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ شاطر پریشانی میں اپنے قدموں سے کمرے کا طول و عرض ناپ رہا تھا۔

''نادرہ! اب اس مشکل سے نکلنے کی صرف ایک صورت ہے۔''

''کیا؟''

''تم خود بہادر صاحب کے پاس جاؤ اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلاؤ کہ وہ مشکل میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ وہ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

نادرہ نے جا کر بہادر سے فریاد کی۔ بہادر صاحب کی تو نظریں ہی بدلی ہوئی تھیں۔ وہ شاطر کو بُرا بھلا کہتا رہا اور کسی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ لڑائی جہاں ہے وہیں رُکوا دوں۔''

بہادر کی وعدہ خلافی سے پریشان اور رنجور نادرہ واپس آ گئی۔ کچھ دن بعد لڑائی ختم ہو گئی۔

وقت کیسے خود کو دُہراتا ہے۔ اب شاطر کو بھی اپنے اردگرد خطرے منڈلاتے نظر آنے لگے۔ نادرہ اس سے بدگمان ہو چکی تھی اور اس کی کفالت کے بہت سے دوسرے دعویدار میدان میں آ چکے تھے۔ کئی دن تک جھگڑا چلتا رہا۔ آخر شاطر سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا۔

شاطر کے پرانے، بااعتماد ساتھیوں میں سے ایک شخص ''منہ زور'' نام کا بھی تھا۔ وہ جواں سال اور ذہین تھا۔ پہلے تو شاطر کا دست راست تھا مگر جب بدگمان ہونے پر آیا تو اس کے خلاف محاذ کھول دیا اور جس جھگڑے کے نتیجے میں شاطر کو جانا پڑا اس کا بہت حد تک ذمہ دار ''منہ زور'' ہی تھا۔ وہ نادرہ کی کفالت کا بڑا پرزور دعویدار تھا اور اس سے ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ وہ نادرہ کا والی بن کر اس کے سب مسائل سلجھا دینا چاہتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ طاقت کا حصول اور اپنے خوابوں کی تکمیل بھی اس کا مقصد تھا۔ فی الحال نادرہ کے ہونے والے والی کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

انہی دنوں اچانک نادرہ کے دائیں بازو میں ایک پرانی تکلیف اُٹھی اور شدت اختیار کرتی گئی۔ اسے بچپن سے یہ تکلیف لاحق تھی جس کا علاج نہیں ہوا تھا اور اندر ہی اندر ایک ناسور بن گئی تھی۔ اس کا پورا دایاں بازو اب اس سرطان کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ نادرہ کے دن تکلیف میں گزرنے لگے۔ وہ سب لوگ جو شاطر کے جانے کے بعد نادرہ کے والی بنے ہوئے تھے یا بننے کے امیدوار تھے اس کے لیے مختلف علاج تجویز کرتے رہے مگر ہر نئی دوا کے ساتھ مرض بڑھتا گیا۔ نادرہ کی بیماری کی خبر دشمن تک بھی پہنچی اور ایک رات انہوں نے شب خون مارنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ جاڑوں کی ایک اندھیری رات تھی۔ نادرہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ دشمن کے آدمی سارے حفاظتی بند توڑ کر اندر آئے اور نادرہ پر ٹوٹ پڑے۔ اس کا سرطان زدہ بازو بُری طرح مجروح ہوا اور دشمن کے آخری وار سے کٹ کر گر گیا۔ نادرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تکلیف اور صدمے سے بیہوش ہوگئی اور کئی دن تک اسی حالت میں رہی۔ بہادر اس مرتبہ بھی اس کی مدد کو نہ آیا۔

اسے ہوش آیا تو زخم مندمل ہونے کی طرف مائل تھے۔ منہ زور اس کا والی بن چکا تھا اور اس بگڑی ہوئی صورتحال کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نادرہ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسروں کی طرح اسے نہیں لوٹے گا اور اس کے سب دُکھ دُور کر دے گا۔ نادرہ نے سب کچھ اسے سونپ دیا اور اپنے زخم مندمل ہونے کا انتظار کرنے لگی مگر پریشانیاں تھیں کہ بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ زخم پر زخم لگ رہے تھے۔ منہ زور اس ساری صورتحال کو مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا مگر وہ بھی اتنا اہل ثابت نہ ہوا۔ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود اس کی کچھ کمزوریاں اس کے پیروں کی بیڑیاں بن گئیں۔ اس سے کچھ ایسی فاش غلطیاں ہوئیں جن کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ کچھ جگہ بہتری آئی، کچھ معاملات بدتر ہوگئے۔ مجموعی طور پر نادرہ کے معاملات بدستور خراب رہے۔ پھر ایک دن منہ زور نے بہادر کی شان میں گستاخی کر دی اور اسے ایک عبرتناک مثال بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ شاطر جیسا ایک اور آدمی ڈھونڈا گیا اور ایک سازش کے ذریعے منہ زور کو ایک اذیت ناک موت سے ہمکنار کر دیا گیا۔

شیطانی مونچھوں والا ''لومڑ'' نادرہ کا مختارِ کل بن بیٹھا.....

توبہ توبہ! کیا وقت تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ لومڑ تو سب کا باپ نکلا۔ ایسا بُرا وقت نادرہ پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے لومڑ سے سوال تک کرنے کا حق نہیں تھا۔ بس اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا تھی۔

بہادر نے بساط پر سرخ کے خلاف قاتل چال چلنے کا سنہری موقع پا لیا تھا۔ لومڑ نے رقم سے اپنی جیبیں گرم کیں اور اپنے کرخت لہجے میں نادرہ کو حکم دیا۔

''تیار ہو جا! آج سے تو صحیح معنوں میں بہادر کی داشتہ ہے۔ اس نے تیری قیمت ادا کی ہے اور تجھے اپنے دشمن سرخ کو زیر کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔''

''خدا کے لیے مجھے بخش دو۔ میری روح جسم سے نکلنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ میرے حال پر رحم کھاؤ۔ مجھ میں اب کیا رہ گیا ہے؟ نہ رنگ نہ روپ۔ دائیں بازو سے معذور میں کس کام کی؟''

لومڑ نے رحم نہ کھایا اور مونچھوں کو تاؤ دے کر اسی پتھریلی آواز میں بولا ''جو کہا گیا ہے تجھ سے..... وہ کہا جا چکا ہے۔''

لومڑ اپنے پورے دانت نکال کر بہادر سے مصافحے کرتا رہا اور نادرہ اپنی عزت لٹا کر خون کے آنسو روتی رہی۔

نادرہ کی مدد سے بہادر نے سرخ کو تباہ کر دیا۔ اب اس کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ کوئی اس سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ اسے کئی سال تک نادرہ کی ضرورت نہ پڑی مگر اسے کھلا بھی چھوڑا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ بہادر نے لوگوں کو زیر رکھنے کا ایک اور حربہ نادرہ پر آزمایا اور اس کے والیوں کو لالچ دے کر نادرہ کے نام بھاری قرضے جاری کر دیئے جو سب اس کے والی کھا گئے اور وہ خود گلے گلے تک قرضوں کے بوجھ تلے دب گئی اور بالکل سر اٹھانے کے قابل نہ رہی۔

کس کس طرح سے اسے استعمال نہیں کیا گیا کس کس طریقے سے بہادر اور نادرہ کے والیوں نے اس کا استحصال نہیں کیا۔ جب ضرورت ہوئی روپیہ پھینک کر اسے خرید لیا۔ جب ضرورت نہ رہی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ جب مدد چاہی حاصل کر لی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب کوئی جرم گلے پڑ گیا تو اس کا الزام نادرہ پر لگا دیا کیونکہ وہ لاوارث تھی، کمزور تھی، بے سہارا تھی۔ اس کے باپ کے مر جانے کے بعد کسی نے اس کے سر پر عزت کی چادر نہ ڈالی۔ کوئی اُٹھ کر اس کی طرف سے بہادر کو جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے دریدہ بدن کو اور لُوٹا گیا۔

بہادر اسی طرح چاک و چوبند اور شاندار تھا۔ گزرتے وقت نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور وہ زہر بھری مسکراہٹ سے نادرہ اور دوسرے بہت سے لوگوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھتا تھا۔ اس کی نظر بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور اسے نادرہ کی پروا کیوں ہوتی؟ کیا وہ اس سے ٹکر لے سکتی تھی؟

ایک دن بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ اور بہادر کی بدسلوکی سے تنگ آ کر نادرہ خود اس کے پاس پہنچی اور اس کے دربار میں اس کے روبرو کھڑے ہو کر سوال کیا۔

’’کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا میں اور تو برابر نہیں ہیں؟ کیا مجھے وہ سب حقوق حاصل نہیں جو تجھے اور ساری دنیا کے انسانوں کو حاصل ہیں؟ کیا میری ملکیت پر دست درازی جرم نہیں؟ کیا میری دولت لوٹنا جرم نہیں؟ کیا مجھ سے وعدہ خلافی غلط نہیں؟ کیا میرے آدمیوں کو مارنا قتل نہیں؟ کیا یہ دوغلہ پن نہیں؟ تیرے انصاف کا معیار دہرا کیوں ہے؟‘‘

بہادر خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس کی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔ ایک بلند بھیانک قہقہہ۔

’’کن خیالوں میں ہو بی نادرہ؟ لگتا ہے اتنے برس تم نے خواب غفلت میں گزار دیئے۔ یہ کیسی شکایتیں ہیں جن کا نہ کوئی جواز ہے نہ معنی؟ اس وقت یہ غیرت کہاں ہوتی ہے جب تمہارے والی میرے ایوانوں میں دُم ہلاتے پھرتے ہیں اور مجھ سے قرضوں اور امداد کے خواہاں رہتے ہیں؟ ان کے کشکول بھی نہیں بھرتے اور میرے خزانے بھی کبھی خالی نہیں ہوتے۔ یہی رشتہ ہے تمہارا اور ہمارا۔ تمہارا ہر نیا والی آ کر تمہاری نئی قیمت لگاتا ہے اور ہم خرید لیتے ہیں۔ تم بکاؤ مال ہو۔ ہم نہیں تو کوئی اور خرید لے گا۔ تمہاری حیثیت ایک گری ہوئی بازاری عورت سے زیادہ نہیں۔ بُرے سلوک کی شکایت تو بیوی کیا کرتی ہے، خریدی ہوئی عورت نہیں۔ خریدی ہوئی عورت سے جو سلوک ہوتا ہے اس کی قیمت ادا کر دی جاتی ہے۔ ہم نے اچھی قیمت ادا کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔‘‘

بھرے دربار میں اس ذلت پر نادرہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز تڑپتی ہوئی فریاد سارے دربار میں گونج اٹھی۔

’’میں بکی نہیں بیچی گئی ہوں۔ میں تو چوری کا مال ہوں جسے جس نے جیسا چاہا بیچا، استعمال کیا۔ میں نے کبھی تجھ سے اپنی قیمت نہیں مانگی۔ میرے والی مجھے بیچتے رہے۔ مجھے بھی کھا گئے اور تجھ سے جو کچھ پایا وہ بھی ان کی تجوریوں میں چلا گیا۔ مجھے کچھ نہ ملا۔ تم لوگوں کے کھیل میں میں برباد ہو گئی۔ میں کہیں کی نہ رہی۔‘‘

وہ مڑی اور تھکے ہوئے بوجھل قدم اٹھاتی دربار سے باہر نکل گئی۔ اس کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔ اہل دربار میں سے کسی کی آواز اس کے کان میں پڑی ’’اچھے والی چنے ہوتے تو آج اس حال کو نہ پہنچتی......‘‘

کیا پڑھنے والا اب تک نہیں جان سکا کہ اس کہانی کی نادرہ (بیش قیمت) آپ کا اپنا پاکستان ہے؟

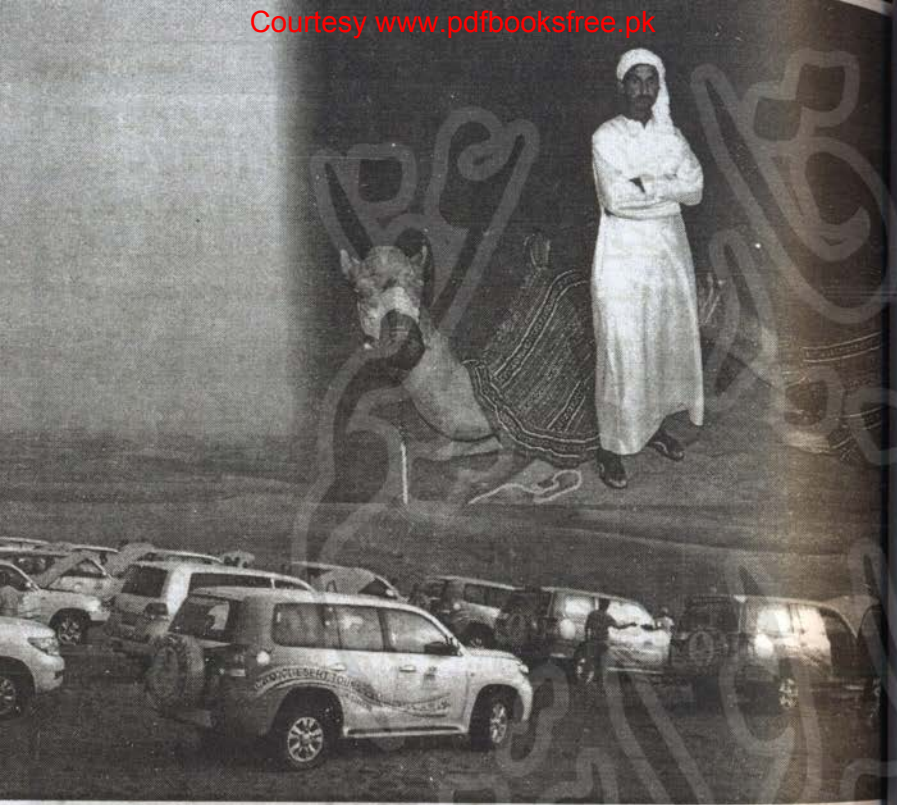

دبئی ڈیزرٹ سفاری

ہر خاص و عام میں مقبول عرب دنیا کی یہ سیرگاہ قدیم و جدید دور کی تمام روایات سمیٹے ہوئے ہے

عارف محمود ڈیل

دبئی میں یوں تو بہت سے مقامات قابل دید ہیں لیکن اگر آپ سیر و سیاحت کی غرض سے دبئی گئے ہیں اور آپ دبئی سفاری سے لطف اندوز نہیں ہوئے تو سمجھ لیں کہ آپ کی سیاحت ادھوری رہی ہے۔

دبئی اور متحدہ عرب امارات کی سیر کو آنے والے افراد کو دبئی سفاری جوش و جذبے اور مہم جوانہ سپرٹ سے سرشار کر دیتی ہے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے دبئی سفاری ہر خاص و عام میں بے حد مقبولیت رکھتی ہے۔ یہ اپنے اندر قدیم و جدید دور کی تمام روایات سمیٹے ہوئے ہے۔

یہاں اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم زمانے میں عرب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدو صحراؤں میں کس طرح سفر کرتے تھے اور اس سفر کے دوران وہ کن لذتوں یا کٹھنائیوں سے دوچار ہوتے تھے جبکہ دوسری جانب جدید سہولیات سے مزین گاڑیوں اور لینڈ کروزرز میں تاریخی و کرشماتی صحرا میں تھرل سے بھرپور ڈرائیونگ سے بھی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔

بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر دبئی سفاری میں سیاحوں کو چوبیس گھنٹے تفریحی سہولیات فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ صبح شام اور رات کا وقت سفاری کی سیر کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ اگر آپ سفاری کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو اپنے ذہن کو آمادہ کرنا ہوگا کیونکہ یہ سیر کسی مہم جوئی سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے آپ کو اپنے آرام دہ کمرے سے باہر نکل کر صحرا میں جانا ہوگا۔

اب یہ آپ کی پسند پر منحصر ہے کہ صحرا میں آپ اونٹ کی سواری سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں یا آپ کی نظر انتخاب شور مچاتی، دھواں اور ریت اُڑاتی لینڈ کروزر پر پڑتی ہے۔ دبئی سفاری میں اونٹ کی سواری یا لینڈ کروزر رائیڈنگ کے علاوہ ریت کے ٹیلوں پر بورڈنگ کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ سینڈ بورڈنگ دبئی سفاری کی اہم سپورٹس تصور کی جاتی ہے۔

دبئی کی سیر کے دوران صرف نصف دن سفاری کے لئے مختص کیا جائے تو اس دوران آپ کو عرب کے بدوؤں کے قدیم طرز زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی سب سے جدید اور مہماتی سپورٹس سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملتا ہے۔

اگر آپ صبح کے وقت صحرا میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو صبح آٹھ بجے ہوٹل چھوڑنا پڑے گا۔ ہوٹل سے نکلتے ہی کھلے صحرا میں جانے کے لئے آپ کو چند میل کا سفر کرنا پڑے گا۔ دبئی سفاری میں کیمل ٹرین تک جانے کے لئے مرغام صحرا سے آدھے گھنٹے کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ مرغام دنیا کے بڑے صحراؤں میں سے ایک ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلوں پر بورڈنگ بھی کی جاسکتی ہے اور یہاں واقع وادی کا رُخ بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہ سفاری ٹور آپ کو عین صحرا کے قلب میں لے جاتا ہے جہاں آپ رولر کوسٹر کے ذریعے ریتلے ٹیلوں کے گرد چکر لگا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے صحرا کی سیر کے لئے شام کا وقت منتخب کیا ہے تو اس دوران آپ تاحد نگاہ پھیلے صحرا اور ڈوبتے ہوئے سورج کا دلفریب منظر دیکھ سکتے ہیں۔ سفاری کی سیر کے دوران چند باتوں کا خیال رکھنا ازحد ضروری ہے۔

کچھ لوگ صحرا میں خود ڈرائیونگ کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، یہ سچ ہے کہ صحرا میں خود گاڑی چلانا انوکھے تجربے سے دوچار کرتا ہے تاہم یہاں صرف ایسے افراد ہی کو گاڑی چلانی چاہیے جو ڈرائیونگ میں ماہر ہوں۔ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ دبئی میں ڈیزرٹ سفاری ٹور آپریٹر سے رابطہ کرلیا جائے۔ ان آپریٹرز کے پاس مقامی تربیت یافتہ افراد ہوتے ہیں جو ریت کے ٹیلوں پر گاڑی چلانے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔

اگر آپ کو ڈیزرٹ سفاری میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ یقیناً عرب نوجوانوں کی ڈرائیونگ میں مہارت کے معترف ہوں گے۔ یہ ڈرائیور صحرا میں سفر شروع کرنے سے قبل گاڑی کے انجن سے لے کر پہیوں تک ہر چیز کا معائنہ کرتے ہیں تاکہ سفر کے دوران کسی مشکل یا حادثے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب صحرا میں گاڑی سٹارٹ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے جوش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اضافہ ہونے لگا ہے۔

یہیں سے ڈیزرٹ سفاری کے سفر سے لطف اندوز ہونے کا آغاز ہوتا ہے۔ گاڑی جب ریت کے اونچے ٹیلوں پر 45 ڈگری کے زاویے سے چڑھتی، اُترتی ہے تو انسان میں تھرل کی کیفیت بیدار کر دیتی ہے اور یہ تھرل صرف ڈیزرٹ سفاری میں ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دبئی سفاری میں صرف ریت کے ٹیلوں کے درمیان ڈرائیونگ سے ہی محظوظ نہیں ہوا جا سکتا بلکہ یہاں بنے کیمپ اور عرب کے لذیذ کھانوں سے بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ دبئی سفاری میں کیمپوں کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کیمپ خیموں میں بنائے گئے ہیں جن میں کرسیاں، میز اور فرشی نشست کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہیں یا فرشی نشست پر لگائے گئے گدوں، کشنز پر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کیمپوں کے درمیان میں ایک مرکزی سیٹ ہوتی ہے جہاں پر رقص پیش کیا جاتا ہے۔ یوں تو ان کیمپوں میں متعدد عربین ڈشز ملتی ہیں تاہم باربی کیو ڈیزرٹ سفاری پیکیج کا حصہ ہے۔ کیمپ میں کھانے کے بعد ''شپ آف ڈیزرٹ'' (اونٹ کی سیر) سے آپ رات کے وقت صحرا کی خوبصورتی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

سفاری کیمپوں میں عربی ڈریسز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سیاح ان ملبوسات کو زیب تن کر کے تصاویر بنوانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں پر خواتین کے لئے مہندی لگانے اور بچوں کے لئے پلے کارنر کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ دبئی سفاری میں ہر طرح کے انسانوں کے لئے ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں۔

فرق

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کوئی دانشمند مضمون نگاری کے لئے سمندر کا رُخ کیا کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ ساحل سمندر پر چہل قدمی کیا کرتا تھا۔

ایک روز وہ ساحل پر ٹہل رہا تھا تو اسے کنارے پر ایک انسان کسی رقاص کی مانند حرکت کرتا دکھائی دیا۔ وہ متجسس ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو دن کا آغاز رقص سے کرتا ہے۔ یہ جاننے کے لئے وہ اسکی جانب چل پڑا۔ نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایک نوجوان ہے جو رقص نہیں کر رہا تھا۔ وہ ساحل پر جھکتا، کوئی شے اٹھاتا اور پھر پھرتی سے اسے دور سمندر میں پھینک دیتا۔

دانش مند اس نوجوان کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں پوچھا، ''صبح بہ خیر! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

نوجوان بولا، ''ستارہ مچھلی کو سمندر میں پھینک رہا ہوں۔''

دانشمند بولا: ''میں سمجھا نہیں۔ تم ستارہ مچھلی کو سمندر میں کیوں پھینک رہے ہو؟''

نوجوان نے کہا ''سورج چڑھ رہا ہے اور لہریں پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ میں نے انھیں پانی میں نہیں پھینکا تو یہ مر جائیں گی۔''

''لیکن نوجوان! یہ ساحل تو میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور سارے ساحل پر ستارہ مچھلیاں بکھری ہوئی ہیں ممکن نہیں کہ تمھاری اس کوشش سے کوئی فرق پڑے۔''

نوجوان نے شائستگی سے دانش مند کی بات سنی، نیچے جھک کر ایک اور ستارہ مچھلی اٹھائی اور اسے لہروں کی طرف اچھالتے ہوئے بولا ''لیکن اس کے لیے تو فرق پڑ گیا۔''

☆☆☆

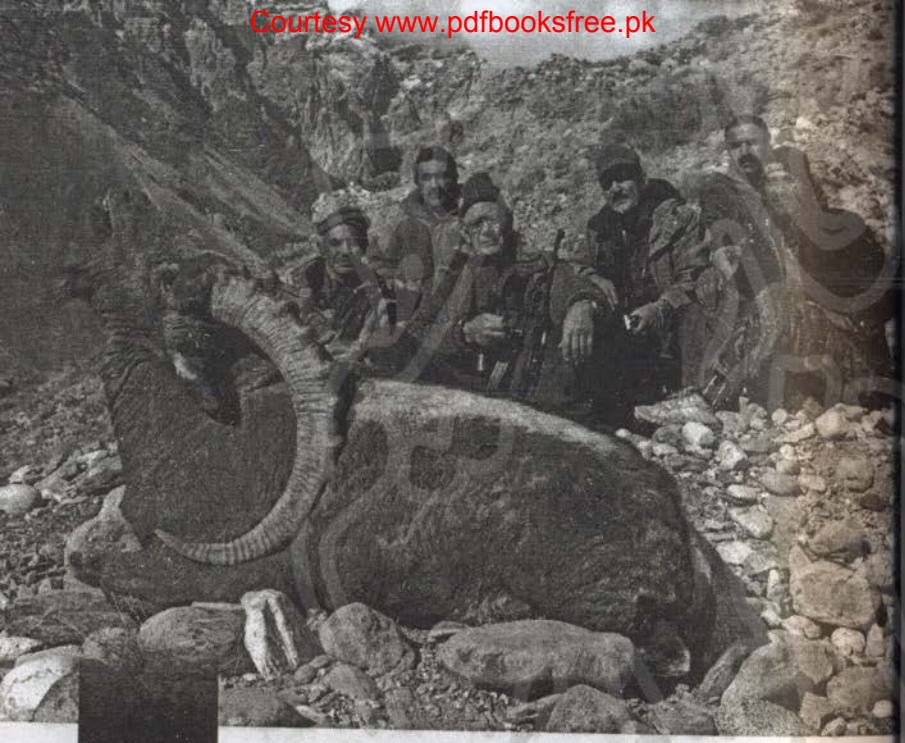

شمس الحسن فاروقی

گلگت کے شکاری

یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت تھا پھر دن کی روشنی دگری سے میرے اعصاب پوری طرح بیدار ہو گئے تھے اور ہمت عود کر آ گئی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بندوق اٹھائی اور زمین سے جست کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بندوق کی نالی ملازم کی طرف کر دی اور ڈپٹ کر کہا ''سچ سچ بتا تو کون ہے؟ ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔''

بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان پیش آئے شکار کے حیرت انگیز واقعات

یہ سطریں جن بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان بیٹھ کر سپردِ قلم کر رہا ہوں، ان کا تعلق دنیا کے بلند ترین اور انتہائی دشوار گزار سلسلۂ کوہستان سے ہے۔ ان عظیم پہاڑوں کی وادیوں میں بسنے والے سادہ لوگ بھی سخت جانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ گو اب ان کی سخت کوشی و سخت جانی ہماری تہذیب ڈستی جا رہی اور ان کی ایمانداری اور خوش معاملگی کو ہم مہذب شہریوں کی بے ایمانی اور بدمعاملگی کا گھن لگ گیا ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر تک یہاں کے پہاڑوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مارخور، اڑیال اور اسی قبیل کے مختلف جانوروں کی خاصی بہتات تھی۔ چنانچہ شکار کا فن بھی خوب پروان چڑھا مگر بے دردی سے جانور مارے جانے کی وجہ سے شکار پہلے عنقا ہوا پھر اس پر پابندی لگی اور اس کے بعد قدرتی طور پر شکاری بھی ختم ہونا شروع ہو گئے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ گلگت کے علاقے میں ہر کس و ناکس کو جو بندوق پکڑ کر فائر کر سکتا ہو یا جسے محض شکار کا شوق ہو، شکاری کہلانے کا حق نہیں ہے۔ یہاں شکاری صرف وہ کہلا سکتے ہیں جو بہترین نشانہ باز ہونے کے علاوہ جسمانی اور دماغی صلاحیتوں نیز سخت جانی میں عام لوگوں سے بہت ممتاز ہوں۔ اس بات کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ ہر گاؤں اور ہر قصبے میں ایسے خاصے لوگ ہوا کرتے تھے جن کے پاس اپنی بندوق ہوتی تھی اور جو وقتاً فوقتاً شکار کی مہموں پر جاتے رہتے تھے مگر اس کے باوجود بڑے بڑے قصبوں میں بھی مشکل سے واحد شکاری پایا جاتا تھا اور اب صورتحال یہ ہے کہ میری معلومات کے مطابق ہنزہ و نگر کے علاقوں کے اکثر قصبوں میں ایک بھی شکاری نہیں۔ بیچارے شکاری جو شکار کا گوشت، کھال اور مشک نافہ وغیرہ فروخت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، شکار کی کمیابی، شکار پر سرکاری پابندی کی وجہ سے بے کار ہو گئے اور وقت سے پہلے ہی بغیر کوئی جانشین تیار کئے اس دنیائے فانی سے یکے بعد دیگرے کسمپرسی کے عالم میں رخصت ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ واقف کار حضرات سے یہاں کے شکاریوں کی سخت جانی، سخت اعصابی اور مافوق الفطرت بہادری کے عجیب عجیب واقعات سننے میں آئے ہیں مگر اس مضمون میں ان واقعات پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے جن کے راویوں کے کردار کی متعدد شریف اور قابل اعتبار حضرات نے تائید و تصدیق کر دی ہے۔ اتفاق سے اس کسوٹی سے گزرنے کے بعد زیادہ تر ایسے واقعات رہ گئے ہیں جن میں مرکزیت فن شکار سے زیادہ شکار کے دوران پیش آمدہ مافوق الفطرت باتوں کو حاصل ہے۔

ستمبر ۶۶ء میں راقم الحروف کا تبادلہ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے معدنی ترقیاتی منصوبہ برائے شمالی علاقہ جات کے سربراہ کی حیثیت سے گلگت ہو گیا۔ طے پایا کہ مجھے گلگت بذریعہ جیپ براستہ وادی کاغان پہنچنا چاہیے۔ دیگر ضروری سامان کے ساتھ ہم نے اپنی بندوق بھی ساتھ رکھ لی۔ بنیادی طور پر بندوق کو جانی حفاظت کے لیے رکھا گیا تھا مگر اس کو کیا کہیے کہ جب ہم لوگ وادی کاغان عبور کر کے وادی سندھ میں داخل ہوئے تو علاقہ چلاس میں شامت اعمال کے مارے دو عدد جنگلی کبوتر سڑک کے ساتھ پہاڑی ڈھلوان پر بیٹھے نظر آئے۔ شکار کو اتنا قریب دیکھ کر رہا نہ گیا۔ فائر کیا تو دونوں غریب گر گئے۔ آگے چلے تو اتفاق سے مزید دو عدد کبوتروں کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ہمارے اس شکار اور کبھی نہ خطا ہونے والے نشانے نے جیپ ڈرائیور کو بڑا متاثر کیا۔ قصہ مختصر اپنے اس ڈرائیور کے طفیل ہم گلگت میں اور کم از کم اپنے عملے میں 'بڑے شکاری' مشہور ہو گئے۔ اس بات پر ہم بڑے شاداں تھے کہ بیٹھے بٹھائے صرف چار عدد کبوتر مار لینے پر بڑے شکاری کا خطاب مل گیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ جلد ہی گلگت سے کوئی دس میل کے فاصلے پر وادی دینیور کے بالائی سرے (علاقہ بارت) پر ارضیاتی سروے کے لیے جانا پڑا۔ اس علاقے کی سطح سمندر سے تقریباً

9 ہزار فٹ بلند ہے۔ وہاں ایک ہفتے کا قیام تھا جس کے لیے ہم اپنے ساتھ تنبو بھی لے گئے تھے۔ وہاں آمد کے دوسرے یا تیسرے روز بارت گاؤں کا ایک لڑکا ہمارے کیمپ میں آیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ میں شکاری ہوں؟ میں لڑکے کے اس اچانک سوال پر پہلے کچھ بوکھلایا پھر قریب رکھی ہوئی بندوق پر ایک نظر ڈالی۔ اپنے دبلے پتلے اور غیر متناسب جسم پر نگاہ دوڑائی۔ لاغر بازوؤں پر مچھلیاں محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی پھر چہرے پر رعب پیدا کرنے کی سعی کرتے ہوئے لڑکے کی طرف بے نیازی سے دیکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ جواب پا کر غریب لڑکا بولا "ہمارے گاؤں میں بھی ایک شکاری ہے میں اسے آپ کے آنے کی خبر دوں گا۔" دوسرے دن ایک ادھیڑ عمر کا سادہ سا عام قد و قامت کا مگر قدرے گٹھے ہوئے بدن والا شخص سامنے آیا۔ چہرے کی جھریاں اور کھڑے خدوخال ماضی کی سختیوں کی داستانیں کہہ رہے تھے۔ وہ بڑے مطمئن اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس علاقے میں مارخور خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اگر شکار کا پروگرام بنایا جائے تو وہ ساتھ دینے اور راہبری کرنے کے لیے بلا معاوضہ تیار ہے۔ اس کے پاس اپنی بندوق اور کارتوس ہیں اور وہ ہم پر کسی بھی قسم کا بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ خیر صاحب یہاں تک تو حالات امید افزا تھے مگر جب شکار کے پروگرام کی تفاصیل طے کی جانے لگیں تو اپنی سٹی گم ہو گئی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہمارے کیمپ کی بلندی تقریباً 9 ہزار فٹ تھی اور جہاں ہمیں دوسرے دن علی الصبح چل کر تیسرے پہر تک پہنچنا تھا وہ جگہ کیمپ سے تقریباً 4 ہزار فٹ اور برف کی "دائمی لائن" سے ذرا نیچے واقع تھی یعنی اس مقام کی سطح سمندر سے تقریباً 13 ہزار فٹ بلندی تھی اور پہاڑ تقریباً عمودی تھا۔ وہاں پہنچ کر رات کسی غار میں بسر کرنا تھی اور دوسرے دن علی الصبح وہاں مارخوروں کا شکار کھیلنا تھا چنانچہ شکاری صاحب کے سامنے اپنے شکاری پن کا بھرم رکھنے کو سرکاری کام کی زیادتی اور اس کی اہمیت کا بہانہ بنایا اور اس کے ساتھ شکاری مہم پر جانے سے معذرت کی مگر اپنے ایک فیلڈ اٹنڈنٹ کو جو ۶۵ء کی کشمیر کی جنگ میں بحیثیت کمانڈو داد شجاعت دے چکا تھا، شکاری کے ساتھ دوسرے دن اپنی بندوق لے کر جانے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن اس دور کنی شکاری پارٹی کو ہم نے بڑے شوق سے رخصت کیا۔ تیسرے دن جب ہم کیمپ میں فیلڈ سے واپسی پر مارخور کا متوقع گوشت پکانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو دن ڈھلے یہ منظر دیکھا کہ شکاری پارٹی اپنے کمبل اور بندوقیں اٹھائے گھسٹتی ہوئی واپس آ رہی ہے۔ آگے آگے شکاری اور پیچھے پیچھے ہمارا کمانڈو فیلڈ اٹنڈنٹ..... شکاری کے چہرے پر یہ تغیر تھا کہ جھریاں مزید گہری ہو گئی تھیں اور آنکھیں مزید اندر دھنس گئی تھیں۔ فیلڈ اٹنڈنٹ کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ بمشکل پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ قریب آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں کا بیمار ہو اور قریب الموت ہو۔ راستے میں کہیں پیر پھسلنے سے ٹانگ پر چوٹ آئی تھی اور غریب لنگڑا ہو گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ شکار نہیں ملا۔ متوقع مارخوروں کا غول تو دیکھا گیا اور وہ شکاریوں کی گھات کی جانب آ بھی رہا تھا مگر شومئی قسمت سے یا تو اسے شکاریوں کی موجودگی کا کسی آہٹ سے علم ہو گیا یا پھر اس کا موڈ کسی اور تحریک سے بدل گیا اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے شکاریوں کی ریخ میں آنے سے پہلے ہی پلٹ گیا۔ اس واقعے سے یہ بات ہم پر بہت اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ مارخوروں کا شکار بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور اس علاقے میں شکاری کا ٹائٹل کم از کم ہمارے لیے بڑا مہنگا اور جان لیوا ثابت ہوگا۔

اس کے بعد ہم نے اپنی گنہگار آنکھوں سے گلگت میں مارخوروں کے شوق میں آنے والی امریکی شکاریوں کی ایک جماعت کا حشر بھی دیکھا۔ یہ جماعت دو دن پیشتر بڑے طمطراق سے بے تحاشا سازوسامان خدم وحشم اور مقامی راہبروں کی خاصی بڑی نفری کے ساتھ روانہ ہوئی تھی اور بہت بری حالت میں، راستوں کے کھڈوں میں گر پڑ کر واپس آئی لیکن یہ لوگ اپنے وطن خالی ہاتھ کیوں جاتے؟ ذلت سے بچنے کی تدبیر یہ کی گئی کہ بازار سے مارخور کا نیم حنوط شدہ سر خریدا اور نشانی کے طور پر ساتھ لے گئے۔ یہ بے چارے لاہور کے کسی کاروباری ادارے کے امریکی پرنسپلز تھے اور کوئی پیشہ ور یا ماہر شکاری نہ تھے۔ ان کے بازار سے مارخور کا سر خریدنے کی بات مجھے ایک امریکی یا کینیڈین سیاح نے بتائی جو اسی زمانے میں گلگت آیا ہوا تھا۔

غرض ان تمام مشاہدات سے میرے دل پر ان مقامی شکاریوں کی ہیبت بیٹھتی چلی گئی جو ان پہاڑوں پر مارخوروں کا نہ صرف شکار کرتے ہیں بلکہ انہیں پیٹھ پر لاد کر نیچے بھی لاتے ہیں۔

دسمبر ۶۶ء میں اپنے ڈارکوٹ کے ٹرپ کے دوران مجھے جناب حسین علی خاں مغپون کے در دولت پر ایک رات مہمان رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اپنی جوانی کے زمانے میں راجہ صاحب بڑے اچھے شکاری رہے ہیں۔ ان کی صحت، وجاہت، بلند حوصلگی اور خوش مزاجی کا تذکرہ بعض غیر ملکی سیاحوں نے اپنی کتابوں، یادداشتوں اور خطوط وغیرہ میں بھی کیا ہے۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے اور دمے کی بیماری نے خاصا کمزور کر دیا ہے۔ راجہ صاحب بڑے صاف گو اور جرأت مند انسان ہیں۔ بے حد خوش مزاج اور حاضر جواب۔ اس زمانے میں راجہ صاحب کے ہاں ان کے ایک قریبی عزیز حاجی سلطان ولی خان صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب اس زمانے میں خاصے بوڑھے اور حد درجہ کمزور ہو چکے تھے۔ ایام جوانی میں زبردست شکاری رہے تھے اور شکار کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ ان کی شکاری زندگی میں بڑے عجیب وغریب واقعات پیش آئے تھے۔ ذیل میں ان سے براہ راست طور پر سنے ہوئے واقعات میں سے ایک واقعہ قلمبند کرتا ہوں۔ ہاں یہ عرض کر دوں کہ ان سے یہ واقعہ سنانے کی درخواست میری طرف سے راجہ صاحب نے کی تھی اور حاجی صاحب کے کچھ سنانے سے پہلے راجہ صاحب اور دیگر مقامی شرکائے محفل نے بیک زباں کہا تھا..... حاجی صاحب کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ ان کا کردار ہمیشہ صاف اور بے داغ رہا ہے اور ہم سب ان کی باتوں کے سچ ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نشست میں صرف حاجی صاحب کی آپ بیتی سنوانے پر اکتفا کیا جا رہا ہے ورنہ غیر مصدقہ شکاری واقعات تو مقامی لوگوں سے لاتعداد سنے جا سکتے ہیں۔''

حاجی صاحب مرحوم کی شخصیت کے بارے میں میرا ابھی یہی تاثر ہے کہ وہ پابند شرع، سیدھے سادے اور صاف گو انسان تھے۔ ان کی باتوں

میں جھوٹ یا بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا پہلا اور انوکھا واقعہ یوں شروع کیا ''ایک مرتبہ میں اپنے ایک ملازم کے ساتھ مارخور کے شکار کی مہم پر روانہ ہوا تھا۔ میرا یہ ملازم خود بھی بڑا ماہر شکاری، انتہائی نڈر اور سخت جان تھا۔ یہ بہار یا گرمیوں کا موسم تھا۔ شام کے وقت ہم نے مارخوروں کے ایک غول میں سے ایک وجیہہ مارخور شکار کیا۔ گولی میں نے چلائی مگر مارخور کو ذبح میرے شکاری ملازم نے کیا۔ شام کا وقت تھا اور ہم کافی تھک بھی گئے تھے۔ اس لیے طے پایا کہ شکار کردہ مارخور کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے دن علی الصبح اُٹھ کر اسے بنایا جائے گا اور بعد ازاں واپس روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ مارخور کو اس قدرے مسطح جگہ پر لایا گیا جہاں کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ اس جگہ کوئی مناسب غار وغیرہ نہ تھا نیز باہر سونے میں اس لیے بھی مضائقہ نہ تھا کہ موسم خوشگوار تھا۔ ہم نے مُردہ مارخور کو ایک طرف ڈال دیا اور کچھ فاصلے پر ہم اپنے اپنے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ موسم بالکل صاف خوشگوار تھا اور وہ قمری مہینے کی کوئی درمیانی رات تھی۔ ہم دونوں لیٹتے ہی سو گئے۔ رات کو کسی وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ چمکیلی چاندنی سے پورا علاقہ دن کی طرح روشن ہے۔ دُور اور نزدیک کی ہر چیز بالکل صاف نظر آ رہی ہے اور عجیب پرکیف منظر ہے۔ اچانک بائیں جانب نظر اٹھی جہاں مارخور پڑا ہوا تھا اور خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ سانس رُک گیا اور دل بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا..... کیونکہ مارخور کی جگہ چمکتے ہوئے سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک انسانی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا اور کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ معاً میرا خیال اپنے ملازم کی طرف گیا اور میں نے گردن گھما کر برابر لیٹے ہوئے ملازم کی طرف دیکھا تو دوسرے ہولناک منظر نے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ ملازم کی کیفیت یہ تھی کہ وہ چت پڑا تھا۔ گردن اور ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور سر زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ منہ بھیانک انداز میں کھلا تھا اور زبان باہر لٹک رہی تھی۔ دونوں آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے کسی نے بڑی بے رحمی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر فوراً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے اوسان بحال کیے۔ اپنا جسم اپنا کمبل اور ساتھ رکھی ہوئی بندوق کو ٹٹولا اور محسوس ہوا کہ ہر چیز جوں کی توں ہے، اپنی جگہ ہے اور میں ان سب چیزوں کو واضح طور پر دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ یکا یک پھر میں نے اپنی بائیں جانب نظر کی کہ شاید وہ انسانی لاش میرا وہم ہو مگر کفن میں لپٹی لاش بدستور وہیں پڑی تھی اور اس کی ہر تفصیل بالکل واضح تھی۔ تمام پتھر بھی بالکل ویسے ہی پڑے ہوئے تھے جیسے ہم نے سونے سے پہلے چھوڑے تھے۔ اگر کوئی چیز نہیں تھی تو مارخور کی لاش۔ میرے دل میں یکا یک پھر ملازم کا خیال آیا اور فوراً پلٹ کر ایک مرتبہ پھر داہنی طرف دیکھا تو وہ اسی حالت میں ساکن و جامد اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔

جیسے جیسے مجھ پر یہ بات واضح ہوتی گئی کہ یہ سب حقیقت ہے مجھ پر خوف غلبہ کرتا گیا اور میں نے اپنا منہ ایک دفعہ پھر کمبل میں چھپا لیا اور میں دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ بہرحال جب دوبارہ آنکھ کھلی اور میں نے ڈرتے ڈرتے کمبل سے منہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ سورج نکلے خاصی دیر ہو چکی ہے اور موسم صاف ہونے کے باعث ہر طرف چٹکیلی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی میں ادھر ادھر دیکھنے اور صورتحال پر غور کرنے بھی نہ پایا تھا کہ میرے کانوں میں اپنے شکاری ملازم کی آواز آئی۔ وہ ہنستے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا ''صاحب آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ اتنی دیر سے سو کر اٹھے ہیں۔ چلیے واپسی کی تیاری کرتے ہیں۔ میں نے مارخور کا تیا پانچا کر لیا ہے۔''

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اپنے ملازم کو نہ صرف زندہ سلامت پایا بلکہ دیکھا کہ وہ نہایت اطمینان اور سکون سے بنے ہوئے مارخور کو پیٹھ پر لادے جانے والے بوجھ کی شکل میں ترتیب دے رہا تھا۔ میں نے اپنے ملازم کی بات سُنی ان سُنی کر کے فوراً بائیں طرف دیکھا جہاں میں رات کو ملازم کی گلا گھٹی ہوئی لاش دیکھ چکا تھا مگر اب وہاں اس جیسی کوئی چیز نہ تھی سوائے اس کے لپیٹے ہوئے کمبل کے۔ اب یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت تھا پھر دن کی روشنی و گرمی سے میرے اعصاب پوری طرح بیدار ہو گئے تھے اور ہمت عود کر آ گئی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ساتھ رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور زمین سے جست کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بندوق کی نالی ملازم کی طرف کر دی اور ڈپٹ کر کہا

''سچ سچ بتا تُو کون ہے؟ ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔''

ملازم میری اس حرکت سے ہکا بکا رہ گیا اور تعجب سے کہنے لگا ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا آپ مجھے بھی نہیں پہچانتے؟'' غرض کافی بحث و تکرار کے بعد بھی جب مجھے اس غریب اور سیدھے آدمی سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی تو زچ ہو کر میں نے اس سے کہا ''تُو جو کچھ بھی ہے میرے قریب بالکل نہ آئیو! ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔''

قصہ مختصر یہ کہ میں نے مارخور کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس میں سے جو کچھ نیچے لے جایا جانا تھا وہ سب ملازم پر لدوایا اور اسے اپنے آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ اس کے پیچھے میں چلا اور اُبھری ہوئی بندوق کی نال تمام راستے ملازم کی طرف رکھی۔ ملازم بے حد پریشان تھا اور سخت متعجب کہ مجھے یکا یک یہ کیا ہو گیا ہے۔

اللہ اللہ کر کے ہم لوگ نیچے اپنے گاؤں پہنچے۔ میں نے ملازم کو اس کے گھر چھوڑا اور حکم دیا کہ وہ میرے پاس کسی صورت میں نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ مارخور کا گوشت یا کھال کوئی چیز مجھے نہ بھجوائے۔ دراصل مجھے ملازم اور مارخور ہر دو کے اصلی ہونے کا یقین ہی نہ تھا کہ خود اپنی آنکھوں سے رات کو کئی بار بصد ہوش و حواس ملازم کو مرا ہوا اور مارخور کو انسانی میت میں تبدیل شدہ دیکھ چکا تھا لیکن آہستہ آہستہ مجھ پر اس بات کا اثر زائل ہونا شروع ہو گیا اور میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ملازم کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے اور اصل معاملہ کچھ اور ہی ہو گا مگر اس واقعے کے تیسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ ملازم اچانک بیمار پڑ گیا ہے اور اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تقریباً تین دن سخت تکلیف اور اذیت میں رہنے کے بعد وہ غریب اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ میرے ذہن پر پھر اس واقعے کی تفاصیل ابھر آئیں اور میں نے غریب ملازم کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے سے بھی پرہیز کیا تاہم میں اس امر پر حیران تھا کہ یہ قصہ کیا ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بہرحال کچھ عرصے تک

تو مجھ پر اس واقعے کا اثر رہا اور میں کسی شکاری مہم پر نہ گیا۔ رفتہ رفتہ بات آئی گئی ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر میں شکار کی مہموں پر جانے لگا مگر اس کے بعد ایسا کوئی اور مافوق الفطرت واقعہ پیش نہ آیا۔''

اسی محفل میں حاجی سلطان ولی صاحب نے اپنی شکاری زندگی کا ایک اور عجیب واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ پہلے واقعے کی طرح پراسرار تو نہیں مگر غیر معمولی ضرور ہے۔ ہوا یہ کہ حاجی صاحب ایک دن ایک بلند پہاڑ پر مارخور کے شکار کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ شام کا وقت ہو گیا تھا اور جس مقام پر وہ لوگ تھے وہ وادی سے کئی ہزار فٹ بلند تھا لیکن وہاں سے نیچے وادی اور اس کی گزرگاہیں صاف نظر آتی تھیں۔ اس موقعے پر ان کی شکاری پارٹی کئی آدمیوں پر مشتمل تھی۔ یہ پارٹی وہاں رات بسر کرنے کا بندوبست کرنے جا رہی تھی کہ اچانک ساتھ کھڑی ہوئی چٹان سے انہیں انسانوں کے بات چیت کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آوازیں ان کی جانی پہچانی تھیں یعنی ان کے گاؤں کے لوگوں کی ہی تھیں جو آپس میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ چٹان کے قریب تر جانے سے آوازیں زیادہ واضح اور صاف طور پر سنائی دیتی تھیں۔ باتوں کے انداز اور مختلف آہٹوں سے یہ اندازہ بآسانی ہوتا تھا کہ بات چیت کرنے والے چل رہے ہیں۔ ساتھ ہی ایک گھنٹی کی سی آواز بھی انسانی آوازوں کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز جانوروں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی کی آواز سے مشابہ تھی۔ یہ لوگ سخت متعجب ہوئے۔ اسی حالت تحیر میں ناگاہ شکاری پارٹی کے ایک رکن کی نظریں نیچے وادی میں ایک راستے پر گڑ گئیں۔ وادی میں پیدل راستے پر دو آدمی ایک بار بردار گدھے کے ساتھ خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ وہ اتنی دُور تھے کہ ننگی آنکھ سے مشکل ہی سے نظر آ رہے تھے۔ دوربین لگا کر دیکھا گیا اور ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ کیا گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ آوازیں انہی لوگوں اور گدھے کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی یا اس پر لدے ہوئے سامان کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد جب شاید ان لوگوں نے کوئی موڑ کاٹا تو وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ حاجی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس مقام پر مجھے لے جائیں گے تاکہ اس خاص چٹان کی ماہیت و ساخت پر مزید کام کیا جا سکے مگر افسوس کہ حالات نے مجھے اس کی اجازت نہ دی کہ فوراً بعد میرا گلگت سے مظفرآباد (آزاد کشمیر) تبادلہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ آپ بیتی ہے گلگت کے علاقے استوار کے گاؤں ہرچو کے مشہور شکاری جناب حاجی محمد امیر صاحب کی۔ بدقسمتی سے یہ عظیم شکاری تقریباً ۱۱۹ سال کی عمر میں اپریل ۱۹۷۶ء میں اپنے گاؤں ہرچو میں انتقال کر گئے۔ اس واقعے کے اصل راوی 'ہنزہ یاقوت پراجیکٹ' کے ایک باریش، دین دار اور فرض شناس افسر جناب عبدالرحمٰن (نائب جیولوجسٹ) ہیں جو حاجی صاحب کے نواسے ہیں۔ عبدالرحمٰن صاحب نے یہ واقعہ اپنے نانا سے دوسرے عزیزوں کے ساتھ کئی مرتبہ سنا تھا تاہم میری درخواست پر کچھ عرصہ پیشتر ایک مرتبہ پھر اپنے گاؤں میں جا کر اپنے والد اور دیگر بزرگوں سے اس واقعے کی مزید تفاصیل حاصل کیں اور ایک ایسا تحریری بیان تیار کر کے میرے حوالے کیا جس پر ان کے متعلقہ تمام بزرگ متفق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ عبدالرحمٰن صاحب اور بہت سے دیگر مقامی لوگوں کے مطابق حاجی محمد امیر بڑے دین دار، راست گو، سادہ اور جفاکش انسان تھے۔ ایک سو انیس سال کی عمر میں بھی وہ چاق و چوبند تھے اور کسی طرح پچپن یا ساٹھ سال سے زیادہ کے دکھائی نہ دیتے تھے۔ حاجی صاحب وہ سب کام بنفس نفیس انجام دیتے جو گلگت کے پہاڑی گاؤں میں ایک عام آدمی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حاجی صاحب نے اپنی زندگی میں تقریباً چار ہزار مارخور شکار کیے۔ گلگت کے بہت سے متعلقہ لوگوں کے قول کے مطابق وہ گلگت کے سب سے بڑے شکاری تھے۔

زیرِ بحث واقعہ تقریباً ستر (۷۰) سال پہلے پیش آیا جبکہ ایک دن اپنے زمانۂ جوانی میں حاجی صاحب مارخور کے شکار کی مہم پر ہرچوگاؤں کے نواحی پہاڑوں میں گئے ہوئے تھے۔ صبح سے تیسرے پہر تک انہیں کوئی شکار نظر نہ آیا مگر شام کو جب یہ مارخوروں کی گزرگاہ پر بنائے ہوئے ایک شکاری مورچے میں گھات لگائے بیٹھے تھے، ایک بڑا اڑیال خراماں خراماں ٹہلتا ہوا اپنی جانب آتا نظر آیا۔ شاید نیچے چراگاہوں میں پیٹ بھر کر سب معمول شب باشی کے لیے اپنے ٹھکانے کی جانب جا رہا تھا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا، فوراً چست باندھی اور اڑیال کے کچھ اور نزدیک آ جانے پر فائر داغ دیا۔ گولی اڑیال کے پیٹ پر لگی اور پار نکل گئی۔ اس کے جسم سے خون بہنے لگا مگر عام حالات کے برعکس وہ واپس مڑ کر بھاگنے کے بجائے شکاری کی طرف دوڑنے لگا۔ حاجی صاحب اس کے اس رویے پر قدرے حیران تھے اور دوسرا فائر کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ وہ قریب آ کر اچانک مڑا اور پھر واپس بھاگنے لگا۔

یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی دوربین وغیرہ وہیں پھینکی اور خود رائفل لے کر اڑیال کے پیچھے دوڑنے لگے۔ کچھ فاصلے پر جا کر اور مناسب موقع پر انہوں نے دوسرا فائر کیا جو شکار کی اگلی ٹانگ پر لگا اور وہ لنگ گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے تیسری گولی اس کی اگلی دوسری ٹانگ پر لگی۔ اڑیال پھر چند لمحے کے لیے رُکا اور اس مرتبہ اس نے راستہ بدلا اور پہاڑ پر چڑھنے کے بجائے نشیب کا رُخ کیا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ اب پہاڑ یا جنگل کا رُخ کرنے کے بجائے وہ ایک پہاڑی گاؤں دشکن کی جانب جا رہا تھا۔ یہ گاؤں ہرچوگاؤں کے بالائی علاقے میں بجانب شمال مغرب واقع ہے۔ حاجی صاحب اڑیال کا پیچھا کرتے ہوئے دشکن گاؤں کے علاقے میں پہنچے تو وہاں کے چرواہے اپنے اپنے مویشی لے کر پہاڑوں سے اُتر رہے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی نے حاجی صاحب کی یا ان کے اڑیال کی طرف کوئی توجہ نہ دی گویا کوئی انہیں دیکھ ہی نہ رہا ہو حتیٰ کہ اڑیال اور پھر خود وہ جب بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کے درمیان سے گزرے تب بھی کسی نے ان دونوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بالآخر شکار اور شکاری دونوں گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اچانک اڑیال نے پھر اپنا رُخ بدلا اور اب وہ گاؤں کے بڑے نالے کی جانب دوڑ رہا تھا۔ نالہ عبور کر کے جب وہ دوسری طرف چڑھ رہا تھا تو حاجی صاحب نے ایک اور فائر اس پر داغ دیا۔ گولی کھا کر غریب اڑیال واپس نالے میں گر گیا۔ حاجی صاحب بھی اسے ذبح کرنے کے لیے نالے میں کود پڑے مگر جونہی اڑیال کے قریب پہنچے وہ یکا یک اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اگلی دونوں ٹانگوں سے بالکل انسانوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے انداز میں ان کی کوئی بھر لی۔ اڑیال کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ حاجی صاحب کی گردن کے اوپر تھی اور دوسری ان کی بغل میں۔ مگر اس سے بھی تعجب خیز بات یہ تھی کہ حاجی صاحب کو اپنی گرفت میں لے کر گرانے یا مارنے کی بجائے عجیب سی آواز نکالتا ہوا اپنی زبان سے ان کا منہ چاٹنے لگا۔ پوری طاقت صرف کر کے حاجی صاحب نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور پھر اسے گرانے کے لیے گتھم گتھا ہو گئے۔ دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی مگر کوئی فریق نیچے نہ گرا۔ یکا یک حاجی صاحب نے موقع پا کر اپنا شکاری چھرا نکالا اور اڑیال کے سینے میں گھونپ کر پیٹ تک چیر دیا۔ اڑیال نڈھال ہو کر پانی میں گرا۔ حاجی صاحب نے اسے فوراً ذبح کر دیا اور اسے نالے سے باہر نکال کر ایک قدرے محفوظ جگہ پر لا ڈالا۔ اس وقت تک ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ حاجی صاحب کا بھوک اور تھکن سے بُرا حال تھا اور شکار بنانے اور وہاں سے گھر لے جانے کی بالکل سکت نہ تھی۔ تھوڑی دیر وہ ستائے پھر اُٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ گاؤں کے راستے اور اسی نالے پر حاجی صاحب کے گاؤں ہی کے ایک میراثی کی پن چکی (جندر) تھی۔ جب وہ وہاں سے گزرنے لگے تو دیکھا کہ پن چکی کی کوٹھڑی میں روشنی ہے اور کوئی اندر موجود ہے۔ قریب جا کر اندر جھانکا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میراثی غلام علی کی بیوی اپنے چار سالہ بچے کے ساتھ بیٹھی ہے اور چولہے پر مکئی کی روٹیاں پکا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا اور باہر ہی سے آواز لگائی:

''کوئی ہے جو مجھے روٹی دے دے! سخت بھوک لگی ہے۔''

آواز سنتے ہی بچہ ایک دل دوز چیخ مار کر ماں سے جا لپٹا اور ماں بھی بے حد خوفزدہ ہوئی کیونکہ ماں اور بچہ دونوں ہی ان سے اچھی طرح واقف تھے جیسا کہ چھوٹے دیہات میں ہوتا ہے کہ ہر شخص چھوٹا ہو یا بڑا اور امیر ہو یا غریب، ایک دوسرے کو بخوبی جانتا ہے۔ اس لیے انہوں نے دوبارہ بے تکلفی سے آواز لگائی:

''بھئی میں انسان ہوں کوئی جن بھوت نہیں۔ تم لوگ کیوں ڈر رہے ہو اور مجھے روٹی کیوں نہیں دیتے؟''

عورت اپنے بیٹے کو بمشکل گود میں لے کر اٹھی اور مکئی کی ایک روٹی ان کی طرف بڑھا دی مگر ایسا کرتے ہوئے وہ سخت خوفزدہ تھی اور اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ حاجی صاحب نے روٹی تھامی اور پھر ان کے خوف کی وجہ نہ سمجھتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ عام حالات میں وہ چکی میں بیٹھ کر ہی روٹی تناول کرتے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچے تو کوئی بارہ کا عمل تھا۔ گھر پہنچتے ہی تمام روداد اپنے دادا صاحب کے گوش گزار کی جو خود بھی اپنے وقت کے مشہور شکاری تھے اور بڑے بہادر اور سخت اعصاب والے انسان تھے۔ ساری روداد سن کر انہوں نے حاجی صاحب کو تسلی دی اور کہا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ شکاری زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے فیصلہ صادر فرمایا کہ شکار کردہ اڑیال اسی وقت گھر لایا جائے گا اور ہم اس عجیب وغریب اڑیال کا گوشت کھا کر ہی آرام کریں گے۔ انہوں نے حاجی صاحب کے بڑے بھائی جناب محمد خاں صاحب کو دو آدمیوں کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر روانہ کیا اور ہدایت کی کہ اڑیال کو جلد از جلد اُٹھا کر لاؤ۔ یہ پارٹی بغیر کسی تاخیر کے،

رات ہی کو روانہ ہوئی اور شکار کیے ہوئے اڑیال کے ساتھ فجر کے وقت واپس گھر پہنچ گئی مگر اس خبر کے ساتھ کہ متذکرہ پن چکی پر غریب میراثی کی بیوی اور اس کا چار سالہ لڑکا دونوں مُردہ پائے گئے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ مکئی کی روٹی توے پر تھی اور بیٹا ماں کی گود سے چمٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا حاجی صاحب کو روٹی دینے کے فوراً بعد ہی ماں بیٹے کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر گئیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس واقعے کے دوسرے دن حاجی صاحب کے بڑے بھائی محمد خان اچانک کسی عجیب وغریب بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ہر قسم کا علاج معالجہ کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر بیماری کا مہینہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی راہی ملک عدم ہوئے مگر خود حاجی صاحب کو کوئی گزند نہ پہنچی اور کچھ دن کے بعد جب اس عجیب وغریب واقعے کا اثر ان کے دماغ سے ذرا کم ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر اپنے شکاری معمولات پورے زور وشور سے شروع کر دیئے۔ حاجی صاحب اکثر اپنے پوتوں اور نواسوں کے اصرار پر یہ واقعہ پوری تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

اگلے واقعے کا تعلق جناب مظفر عالم صاحب سے ہے جو گلگت کی سابقہ ریاست نیپال کے راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں، ان کا آبائی گاؤں سلپی ہے اور وہ آج کل بھی وہیں مقیم ہیں۔ مظفر عالم صاحب سے راقم الحروف کا رابطہ اس طرح پیدا ہوا کہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں مجھے اپنے دفتر میں اطلاع ملی کہ دریائے گلگت کی ایک معاون وادی اور سابقہ ریاست اشکومن میں ایک صاحب کو یاقوت کے نمونے ملے ہیں چونکہ ہنزہ کی یاقوت کی پٹی (RUBY BELT) کی ارضیاتی تفسیر یا پروجیکشن کے مطابق سابقہ اشکومن اور یاسین کی ریاستوں کے علاقوں میں یاقوت کے ذخائر پائے جانے کا قوی امکان تھا۔ اس لیے میں نے فوراً ہی جائے وقوعہ کے معائنے کا پروگرام بنایا اور پاکستان معدنی ترقیاتی کارپوریشن کے گلگت پروجیکٹ کے انچارج جناب علی بہادر صاحب کو بحیثیت معاون، کہ وہ اس علاقے سے ملحق سابقہ ریاست گپس کے رہنے والے ہیں، ہمراہ لے کر وادی اشکومن کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ صاحب جنہیں مبینہ طور پر یاقوت ملے تھے، نیپال اور اشکومن کی سرحد پر واقع سلپی گاؤں کے متذکرہ بالا مظفر عالم صاحب تھے، اپنے دولت خانے پر ایک پرخلوص اور پرتکلف چائے کی دعوت میں میرے استفسار پر مظفر صاحب نے اپنی شکاری زندگی کا جو عجیب واقعہ سنایا وہ قارئین کرام کی نذر ہے:

قیام پاکستان سے قبل مظفر صاحب گلگت کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ایک انگریز دوست کو مارخور کا شکار کھلانے کی مہم پر اپنے کئی دیگر مقامی شکاریوں کے ساتھ اشکومن میں دریائے اشکومن کے ایک معاون پھکورہ نالے کی وادی میں گئے۔ ان کے مقامی ساتھیوں میں ان کے دوست، علاقہ چٹورخن کے محمد علی صاحب بھی تھے۔ اس شکاری پارٹی نے پہاڑ پر پہنچ کر ایک قدرے مسطح مقام پر اپنا ٹینٹ نصب کر دیا۔ انگریز مہمان دراصل خود شکار کرنے میں کم مگر شکاری مہم کی تصویر کشی میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

مظفر صاحب کا بیان ہے کہ ان کی پارٹی ابھی اپنے کیمپ سے شکار کی اصل مہم پر جانے کی تیاری کر رہی تھی اور کچھ لوگ ساتھ جانے والا سامان ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے اور جو فارغ تھے وہ ٹینٹ کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ خود مظفر صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھٹی

انسپکٹر نواز خان

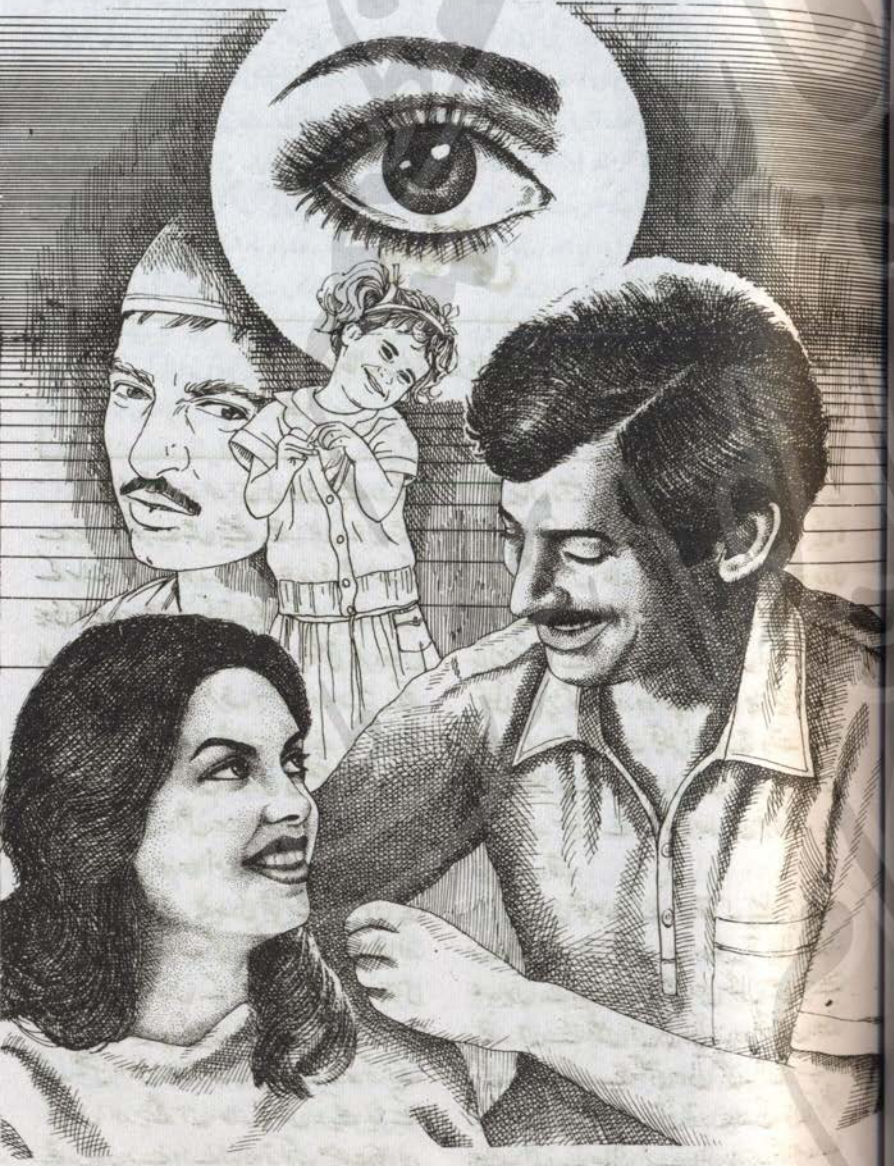

ٹینٹ سے کچھ فاصلے پر ایک اونچی جگہ کھڑے پہاڑ کا نظارہ کر رہے تھے۔ موسم خوشگوار اور ہوا نرم رو تھی۔ ان کے دیکھتے دیکھتے چوٹی سے برف کا ایک تودہ اپنی جگہ سے نیچے کھسکا اور برق رفتاری سے نیچے کی جانب پھسلنے لگا۔ جیسے جیسے تودہ نیچے آ رہا تھا، ایک بڑے سفید بادل یا بگولے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ابھی یہ اس تماشے کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ انہیں یہ پریشان کن احساس ہوا کہ تودہ جو چند ثانیوں میں برف کا ایک عظیم بگولہ بن گیا تھا، تیزی سے انہی کی طرف آ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس مصیبت سے آگاہ کرتے ہوئے آواز دی اور خود بھی پناہ لینے ٹینٹ کی طرف لپکے۔ مگر چند ہی قدم دوڑے ہوں گے کہ ہوا کے ایک زبردست جھکڑ نے انہیں تنکے کی طرح ایک طرف اُچھال دیا اور اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنے آپ کو فضا میں ایک بے بس پتے کی طرح اُڑتے ہوئے پایا۔ اس کے بعد یکا یک جیسے انہیں کسی نے زمین پر زور سے پٹخ دیا اور وہ چوٹ سے بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ اپنی اصل جگہ سے بہت دُور اور اس علاقے کی سب سے خطرناک اور عمودی نالے کی کٹائی کے سرے پر نرم برف کے ایک بڑے تودے میں پھنسے پڑے ہیں۔ سر اور ہاتھ نسبتاً آزاد تھے مگر نچلا دھڑ اور ٹانگیں برف میں دھنسی ہوئی تھیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد جسم اس برف سے آزاد ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ مادر زاد ننگے ہیں۔ جسم سے کوٹ، جرسی، قمیص، شلوار، جوتے حتیٰ کہ بنیان اور موزے بھی غائب ہیں۔ مظفر صاحب کے مطابق اس وقت تک وہ نیم بے ہوشی یا غنودگی کی کیفیت میں تھے مگر ایک بات مستقل ان کے ذہن میں تھی کہ کسی طرح ساتھ کی عمودی دیواروں والی خطرناک وادی میں گرنا ہے، وہیں مجھے عافیت ملے گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی دوسرا خیال یہ بھی ذہن میں آتا کہ اس وادی کی طرف نہ جانا کہ وہاں موت تیری منتظر ہے مگر دوسرے ہی لمحے پھر کوئی نادیدہ طاقت انہیں اس ہولناک وادی کی طرف کھسکنے پر مجبور کر دیتی۔ نتیجتاً وہ آہستہ آہستہ موت کی اس وادی کی طرف کھسک رہے تھے اور قریب تھا کہ وہ اس میں گر جاتے کہ اسی اثناء میں ان کا دوست محمد علی دیگر ساتھیوں سمیت انہیں تلاش کرتا وہاں پہنچ گیا اور لپک کر عین اس وقت انہیں تھام لیا جبکہ دوسرے لمحے وہ اس خطرناک وادی میں گرنے والے تھے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ وہ مادر زاد ننگے ہیں۔ لوگوں نے اپنے کپڑے اُتار کر انہیں قدرے ڈھانپا اور پھر تیز تیز کیمپ کی طرف لے چلے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے مظفر صاحب کے حواس ذرا بحال ہو گئے تھے۔ ٹینٹ میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ان کا انگریز مہمان ٹینٹ کے اندر بچھی ہوئی سفری میز کے نیچے گھسا اپنے کیمرے سے اس کارروائی کی تصاویر اُتار رہا ہے۔ وہ نہیں بتا سکے کہ آیا وہ برفیلے جھکڑ سے خوف کھا کر میز کے نیچے گھس گیا تھا اور پھر حواس بحال ہونے پر خفت مٹانے کے لیے وہیں سے تصویر کشی شروع کر دی تھی یا پھر تصویر کشی کے لیے محفوظ مقام سمجھ کر دانستہ وہاں جا بیٹھا تھا۔ بہرحال مظفر صاحب کے لیے یہ بات تعجب خیز تھی کہ باقی کسی شخص پر اس برفیلے بگولے کا اتنا اثر نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ شکاری پارٹی کی کوئی خاص چیز بھی ضائع نہ ہوئی تھی۔ کسی آدمی کا ہوا میں اُڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنا اور اس کے جسم سے تمام کپڑے غائب ہو جانا تو درکنار..... ہے کوئی جو اس واقعے کی عقلی توجیہہ کرے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھٹی

انسپکٹر نواز خان

ایک معصوم طالبہ کی لرزہ خیز داستان جو بدقسمتی سے
چھٹی کے بعد اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی!

چوہدری شجاعت اور اس کی بیوی پچھلے دو گھنٹے سے میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ جوں جوں شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے چوہدری شجاعت کی بیوی کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار دوپٹے سے اپنی سرخ آنکھیں پونچھتی پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتی۔ چوہدری شجاعت بھی بار بار کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ جونہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی یا کوئی اہلکار کمرے میں داخل ہوتا، ان دونوں کے چہروں پر رونق آ جاتی اور وہ اُمید بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتے۔ چوہدری شجاعت کی اکلوتی بچی آج دوپہر سے غائب تھی۔ بچی کا نام ریحانہ تھا اور اس کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ مقامی سکول میں شاید پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ یہ ایک فیشن ایبل علاقہ تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کوٹھیاں اور بنگلے اس علاقے میں دیکھے جا سکتے تھے۔ یہاں رہنے والے زیادہ تر لوگ صنعت کار اور تجارت پیشہ تھے۔ ایک محکمے نے اپنے اعلیٰ افسران کو بھی یہاں زمینیں الاٹ کر رکھی تھیں۔ ان لوگوں نے اپنی آبادی کو بہار کالونی کا نام دے رکھا تھا۔ بچی کا سکول بھی اس علاقے میں واقع تھا۔ چوہدری شجاعت نے بتایا تھا کہ لڑکی کو عموماً ان کا ایک خاص ملازم سکول سے لے کر آتا تھا۔ پرسوں اچانک اسے کوئی کام پڑ گیا تھا اور وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ ان دنوں چوہدری شجاعت فیکٹری جاتے وقت بچی کو سکول چھوڑ جاتے تھے۔ وہاں سے وہ خود ہی واپس آ جاتی تھی۔ سکول سے گھر کا فاصلہ تین فرلانگ سے زیادہ نہیں تھا۔

چوہدری شجاعت نے بتایا تھا کہ پہلے بھی کئی بار ریحانہ اکیلی ہی سکول سے واپس آ جاتی تھی۔ ہمسایوں کے ایک دو بچے بھی اسی سکول میں پڑھتے تھے۔ اس لئے انہیں اس کی کوئی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ اسے ایک بجے چھٹی ہوتی تھی۔ آج جب وہ ڈیڑھ بجے تک گھر نہیں آئی تو ریحانہ کی ماں کو فکر ہوئی۔ اس نے صفائی کرنے والی ملازمہ کو ہمسائے کے گھر بھیجا۔ ان کی ایک لڑکی بھی اسی سکول میں

پڑھتی تھی۔ وہ اکثر اکٹھی گھر آیا کرتی تھیں۔ ان کے گھر سے پتہ چلا کہ وہ لڑکی تو آ چکی ہے لیکن اسے ریحانہ کے بارے میں علم نہیں۔ ملازمہ بچی کی تلاش میں سکول تک گئی۔ تمام بچے گھروں کو جا چکے تھے۔ ریحانہ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے گھر آ کر ریحانہ کی ماں کو بتایا۔ اس کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ لڑکی کی ایک ہی سہیلی تھی جس کے گھر سے ملازمہ ہو آئی تھی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ تھوڑی دیر بعد ریحانہ کی ماں اور ملازمہ دونوں پھر سکول گئیں۔ ریحانہ کی استانی وہاں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ بچی چھٹی کے وقت تک سکول میں تھی۔ چھٹی کے وقت وہ ہم جماعت بچیوں کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ سکول کے باہر خوانچہ والوں سے بھی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ ریحانہ کی ماں اور ملازمہ، ریحانہ کی سہیلی کے گھر پہنچیں۔ اس لڑکی کا نام فوزیہ تھا۔ فوزیہ نے بتایا کہ چھٹی کے وقت اس کی چھوٹی بہن اس سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی سکول سے نکل آئی۔ اسے پتہ نہیں کہ ریحانہ کس وقت سکول سے نکلی۔ سہ پہر تین بجے کے قریب چوہدری شجاعت نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی۔ اس وقت سے میں لڑکی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عملے کے افراد اور مخبر علاقے کا چپہ چپہ چھان رہے تھے۔ باہر جانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ میں نے شہر کے تمام تھانوں میں اطلاع پہنچا دی تھی۔ چوہدری شجاعت علاقے کا ایک دولت مند اور بااثر آدمی تھا۔ غریب غربا کی دل کھول کر مدد کرتا اور مصیبت میں ہر کسی کے کام آتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے گھر میں چوری ہو گئی تھی۔ یہ کیس بھی میں نے ہی کیا تھا۔ اس وقت سے چوہدری شجاعت میرا زبردست مداح ہو گیا تھا۔ دو تین بار اس نے میری دعوت کی تھی اور یوں بھی گاہے بگاہے ملنے کے لئے آتا رہتا تھا۔ چوہدری شجاعت کی بیوی بڑی نیک اور سیدھی سادی عورت تھی۔ کئی بار وہ منہ پر ہی میری تعریف کرنے لگتی تھی لیکن اس کی تعریف میں کوئی بناوٹ یا چاپلوسی نہیں ہوتی تھی۔

اب جس وقت سے بچی گم ہوئی تھی میری جان مصیبت میں آ گئی تھی۔ چوہدری شجاعت کی بیوی میرے سامنے کرسی پر جمی بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب! میں نے آپ سے بچی لینی ہے جس طرح بھی ڈھونڈیں مجھے بچی چاہیے۔ چوہدری شجاعت بھی اپنے طور پر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد میرے پاس آ گیا تھا۔ چوہدری شجاعت ۳۵ سال کا صحت مند اور خوش پوش آدمی تھا۔ ایک زمانے میں اسے کشتیاں لڑنے اور دوڑ وغیرہ لگانے کا بڑا شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ ۳۵ سال میں بھی وہ ۲۸ سال سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا..... تھانہ بھی مصیبتوں کا ایک گھر ہوتا ہے۔ ہر لمحہ نت نئے فتنے کھڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جو بھی سائل بن کر آتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ شاید آج سارے شہر میں سے صرف وہی تھانے آیا ہے اور اس کا مسئلہ ہی سب سے سنگین ہے۔ اب یہ دونوں میاں بیوی بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ اگر اکیلا شجاعت ہوتا تو میں اسے کسی بہانے کب کا اُٹھا چکا ہوتا لیکن ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ اس کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ میں نے ایک بار جب اسے کہا کہ آپ گھر چلی جائیں تو وہ تڑپ کر بولی:

"نہیں انسپکٹر صاحب! میں ریحانہ کے بغیر گھر نہیں جاؤں گی۔ میں نے گھر جا کر کیا کرنا ہے! پلیز میری بچی مجھے دلا دیں۔"

اس وقت شام کے کوئی سات بجے تھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے ریسیور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُٹھایا۔ دوسری طرف میرا اے ایس آئی جہاں زیب بول رہا تھا۔

.....

''ہاں جہاں زیب، بچی کی کوئی خبر ملی؟''

دوسری طرف سے جہاں زیب کی آواز آئی۔

''ہاں سر! پاسپورٹ آفس کے ساتھ زیرتعمیر عمارت سے ایک بچی کی لاش ملی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی گمشدہ بچی ہے۔''

ایک لمحے کے لئے میں سناٹے میں آ گیا۔ میں نے سامنے بیٹھے میاں بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ امید و بیم میں ڈوبی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے چہرے کے تاثرات پر قابو پایا۔ جہاں زیب کچھ مزید تفصیلات بتا رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''اچھا ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں۔'' ریسیور رکھ کر میں نے چوہدری شجاعت کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ریحانہ کی ماں بھی اٹھنے لگی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ابھی آ رہے ہیں۔

کوئی دس منٹ کے بعد تھانے کی جیپ ہمیں زیرتعمیر عمارت کے سامنے اُتار رہی تھی۔ راستے میں میں نے چوہدری شجاعت کو کافی حد تک آنے والے لمحوں کے لئے تیار کر لیا تھا..... زیرتعمیر عمارت رہائشی تھی اور کوئی تین کنال میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کی چھت ڈالنے کے لئے لکڑی کے بالوں اور شہتیروں کو عمودی انداز سے کھڑا کیا گیا تھا۔ چاروں طرف ریت اینٹیں اور سریا وغیرہ بکھرا ہوا تھا۔ عمارت کے باہر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اے ایس آئی جہاں زیب نے ساتھ والی کوٹھی سے بجلی کی تار لا کر بلب روشن کر رکھا تھا۔ ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے اے ایس آئی کے پاس پہنچے۔ اس نے مجھے سلیوٹ کیا اور اپنے ساتھ لے کر لاش کی طرف چل دیا۔ چوہدری شجاعت نے لاش دیکھی۔ تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا۔ لگتا تھا اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ پھر وہ چیخ مار کر لاش کی طرف لپکا۔ میں نے اسے کمر سے تھام لیا۔ اے ایس آئی نے میری مدد کی اور ہم اسے بازوؤں سے پکڑ کر پیچھے لے گئے۔ اس مرحلے میں لاش کے قریب جانے سے ثبوت ضائع ہو سکتے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہوا لاش کے سرہانے پہنچا۔ بڑا وحشیانہ قتل تھا۔ معصوم بچی کا گلا کسی تیز دھار سے نرخرے تک کٹا ہوا تھا۔ وہ پہلو کے بل زمین پر پڑی تھی۔ وہ بڑی ہی پیاری بچی تھی۔ اس کے خوبصورت بال ربن میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سرخ رنگ کا فراک اور لمبی سفید جرابیں پہن رکھی تھیں۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا کھانے کا ڈبہ اور بستہ پڑا ہوا تھا۔ بڑا دلدوز منظر تھا۔ میں نے سوچا، کتنا سنگدل شخص ہو گا وہ جس نے اس معصوم کے گلے پر چھری چلائی ہو گی۔ میں نے بلب کی تار ہاتھ میں لی اور اسے تھامے ہوئے بچی کے عین اوپر آ گیا۔ فرشتہ صورت چہرے پر تکلیف اور حیرانگی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ بچی کے چمکدار بال ایک جانب سے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پولیس کے مخصوص انداز میں جائے وقوعہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بعض اوقات ایک چھوٹی سی چیز، ایک بٹن، ایک بال یا کپڑے کی ایک دھجی پولیس والے کو سیدھا مجرم کے دروازے پر لا کھڑا کرتی ہے لیکن یہ کام کوئی ایسا آسان نہیں ہوتا۔ شکوک کے انبار میں سے حقائق کی تلاش جان جوکھوں کا کام ہے۔ کہتے ہیں جس کی چیز گم ہو جائے اس کے لئے ہر کوئی چور ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تفتیش کرنے والے کو بے شمار چیزیں اور چہرے مشکوک نظر آتے ہیں۔ اب یہ اس کی قابلیت پر منحصر ہے کہ وہ اَن گنت راستوں میں سے کون سا راستہ تحقیقی سفر کے لئے منتخب کرتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے احتیاط سے بچی کا بستہ اٹھایا اور اسے روشنی کی طرف کر کے دیکھا۔ کاپیاں، کتابیں، پنسلیں، سلیٹی کے علاوہ ایک چھوٹی سی پڑیا نظر آئی۔ میں نے پڑیا کھولی، اندر کوئی سفوف سا تھا۔ میں نے سفوف سونگھا پھر تھوڑا سا سفوف زبان کی نوک سے چکھا۔ یہ چورن تھا۔ ایسے چورن سکولوں کے باہر خوانچہ فروش بیچا کرتے ہیں۔ میں نے پڑیا محفوظ کر لی۔ کھانے کے ڈبے میں روٹی کے چند ٹکڑے تھے۔ لڑکی کے فراک میں ایک جیب تھی۔ میں نے جیب ٹٹولی تو وہ کچھ بھاری نظر آئی۔ اندر ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ جیب میں خربوزے کے خشک بیج ہیں۔ خربوزوں کا موسم تھا۔ بعض لوگ خربوزے کے بیجوں کو صاف کر کے دھوپ میں سکھا لیتے ہیں اور بعد میں چھیل کر کھاتے ہیں۔ یہ کوئی آدھ مٹھی بیج تھے اور چھلے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو بھی محفوظ کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ گھٹنوں سے ذرا اوپر بچی کی ٹانگوں پر خراشیں تھیں۔ فراک بھی کندھے پر سے ادھڑا ہوا تھا۔ یہ تمام تفصیلات بھی میں نے ذہن میں محفوظ کر لیں۔

لاش اس عمارت کے چوکیدار نے دریافت کی تھی۔ یہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ چھتوں کی وجہ سے تعمیر کا کام کچھ دن کے لئے رُکا ہوا ہے۔ وہ یہاں نگرانی پر معمور تھا۔ دوپہر کے وقت وہ سو گیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے وہ اس طرف آیا تو لڑکی کی لاش دیکھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے لاش کو ہلایا جلایا نہیں بہرحال لاش دریافت ہونے کے بعد اردگرد کے لوگ آ کر لاش دیکھتے رہے تھے۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ جب وہ پہنچا تو لوگ لاش کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ایسی صورت میں جائے وقوعہ سے قدموں وغیرہ کے نشانات ملنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اردگرد کی زمین کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اچانک ایک چیز دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے نیچے جھک کر یہ چیز اٹھائی اور جیب میں ڈال لی۔

اے ایس آئی جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرانے میں مصروف تھا۔ پولیس کا فوٹو گرافر بھی پہنچ چکا تھا۔ میں نے عملے کو ضروری ہدایات دیں اور اردگرد کے مکینوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ لوگ ایسے مواقع پر گواہیاں دینے سے گھبراتے ہیں۔ جن چند ایک افراد نے بیان دیئے ان سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ صرف ایک کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ دوپہر کے وقت زیرِ تعمیر کوٹھی سے تھوڑے فاصلے پر ایک تانگہ آ کر رُکا تھا جس میں کچھ اجنبی افراد سوار تھے۔ ایک اور نوعمر لڑکے نے کہا کہ دوپہر کے وقت وہ گلی سے گزر رہا تھا تو اسے چیخوں کی آواز سنائی دی تھی۔ کوئی بچہ دو دفعہ زور زور سے چیخا تھا۔ اس نے سمجھا کہ سکول میں چھٹی ہوئی ہے اس لئے بچے کھیل کود رہے ہیں۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن لڑکے سے کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی۔ کچھ دیر موقع واردات پر ٹھہر کر میں ریحانہ کے باپ کے ساتھ تھانے واپس آ گیا۔ ریحانہ کا باپ رو رو کر نڈھال ہو چکا تھا۔ تھانے پہنچ کر میں نے اسے جیپ سے اُترنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ ریحانہ کی ماں کو اپنی شکل دکھاؤں۔ مجبوراً یہ ناخوشگوار فرض بھی مجھ کو ہی ادا کرنا پڑا۔ میں وہ منظر کبھی نہ بھول سکا۔ ریحانہ کی ماں مجھے قمیص سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی اور کہہ رہی تھی ”انسپکٹر صاحب! آپ کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے، آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔ انسپکٹر صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا..... کبھی نہیں ہو سکتا۔“

میں نے روتی چیختی عورت کو بمشکل خود سے علیحدہ کیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کا مجرم ہوں اور شاید واقعی میں مجرم تھا۔ میرے علاقے

میں دن دیہاڑے ایک بہیمانہ قتل ہوا تھا۔ ایک خوش رنگ پھول کو بے دردی سے کچل کر ایک آنگن کو ویران کر دیا گیا تھا۔

اگلے روز میں نے بچی کے ماں باپ سے طویل ملاقات کی۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا کام تفتیش کرنا ہے لیکن تفتیش کا رُخ آپ کو متعین کرنا ہے۔ آپ بتائیں اس سلسلے میں آپ کو کس کس پر شک ہے؟

چوہدری شجاعت نے فوراً کہا کہ خاندان کے اندر اور باہر کسی سے ان کی کوئی دشمنی نہیں۔ اگر خاندان میں کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا ہے بھی تو وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ایسا کوئی جھگڑا بچی کے قتل کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ خود سے کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش نہ کریں اور مجھے تمام حالات کھول کر بتائیں۔ چوہدری شجاعت میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا

”نواز صاحب! یقین کریں اس قسم کی کوئی بات نہیں بلکہ سرے سے کوئی بات ہے ہی نہیں۔ بچی کے بڑے اور چھوٹے ماموں میں اس کے رشتے پر ایک جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے دونوں کو یہ کہہ کر چپ کروا دیا تھا کہ ابھی تو ریحانہ نے سکول جانا شروع کیا ہے۔ ابھی سے ایسی باتیں مناسب نہیں۔ باقی رہی خاندان سے باہر کی دشمنی تو میری نظر میں کوئی ایسا معاملہ نہیں جس کا نتیجہ اس قدر المناک نکل سکتا ہے۔“ چوہدری شجاعت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی بیوی سسکنے لگی۔

میں نے کہا ”اچھا! آپ یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں قتل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

جواب میں ریحانہ کی ماں ایک بار پھر رو رو کر نامعلوم قاتل کو بددعائیں دینے لگی۔ اس کی گریہ زاری میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ چوہدری شجاعت کا ایک رشتہ دار اسے کندھے سے پکڑ کر باہر لے گیا۔ چوہدری شجاعت بولا

”انسپکٹر صاحب! ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ پتہ نہیں کون ہمارے گھر کی رونق کا دشمن تھا..... وہ تو ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔“ پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولا ”انسپکٹر صاحب! مجھے تو بار بار وہ چوری والا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ان لوگوں کے ساتھیوں کا کام ہو۔“

چوری کا واقعہ میری نظروں میں بھی گھوم گیا۔ کوئی سات مہینے پہلے چوہدری شجاعت کے گھر چور گھس آئے تھے۔ ابھی وہ تالے وغیرہ توڑنے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ چوہدری شجاعت کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے انہیں للکارا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ شجاعت بھی ایک جوشیلا آدمی تھا۔ اس نے تن تنہا ان کا پیچھا کیا (ایک زمانے میں وہ اتھلیٹ رہا تھا) اور کوئی دو فرلانگ بھاگ کر ایک شخص کو قابو کر لیا۔ بعد میں یہ کیس میرے پاس آیا۔ میں نے پکڑے جانے والے شخص کی مدد سے ان کے باقی تین ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا۔ یہ بڑے نامی گرامی چور تھے اور کئی مقدموں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ ان میں سے دو پر قتل کا الزام بھی تھا۔

چوہدری شجاعت جس شبے کا اظہار کر رہا تھا وہ میرے نزدیک زیادہ اہم نہیں تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ چاروں جیل میں تھے اور کوئی ایسی خاص وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کہ اس قتل میں ان کا ہاتھ ہو۔ بہرحال میں نے یہ شک ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اب میں نے چوہدری شجاعت سے بچی کی جیب اور بستے سے برآمد ہونے والی چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ پتہ چلا کہ خربوزے کے خشک بیج بچی گھر سے لے کر نہیں گئی تھی، وہ اس نے سکول میں کسی سے لئے تھے۔ یہ بیج بازار میں نہیں بکتے نہ ہی وہ کسی کے گھر گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیج اس نے کسی ہم جماعت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لئے ہوں گے۔ بچوں کو عموماً خربوزے اور تربوز وغیرہ کے بیج چھیلنے اور انہیں جمع کرنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ باقی رہا چورن تو وہ اس نے یقیناً چھٹی کے وقت خوانچہ فروش سے لیا تھا لیکن چوہدری شجاعت کی بیوی نے بتایا تھا کہ جب وہ اور ملازمہ بچی کو ڈھونڈنے کے لئے سکول گئیں تو انہوں نے خوانچہ فروشوں سے بچی کے بارے میں پوچھا، کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بچی نہایت خوبصورت اور ہوشیار تھی۔ وہ بڑی پیاری باتیں کرتی تھی۔ یوں بھی وہ ایک نہایت امیر باپ کی بیٹی تھی۔ گلی محلے اور سکول میں اسے اچھی طرح پہچانا جاتا تھا۔ اس کے سوگ میں سکول بند تھا۔ اگلے روز سکول کھلا تو میں تفتیش کی غرض سے وہاں پہنچا۔ میں نے فرداً فرداً ہیڈ مسٹریس اور استانیوں سے بچی کے بارے میں سوالات کئے۔ سب نے کہا کہ وہ بڑی پیاری اور لائق بچی تھی۔ میں نے اس کی ہم جماعت لڑکیوں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ پتہ چلا کہ خربوزے کے بیج جماعت کی کسی لڑکی نے اسے نہیں دیئے تھے۔ یہ بیج اس کی جیب میں کیسے آئے؟ چورن والا معاملہ بھی اُلجھا ہوا تھا۔ سکول میں آ کر ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ ریحانہ اس چورن والے سے اکثر چیزیں لیتی تھی۔ وہ اسے دوسری لڑکیوں سے زیادہ چیزیں دیا کرتا تھا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میں نے چورن والے سے ملنا چاہا تو پتہ چلا کہ وہ آج خوانچہ لے کر نہیں آیا۔ چورن والے کا کردار کچھ مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ قتل ہونے سے پہلے ریحانہ آخری بار جس شخص سے ملی تھی وہ چورن والا تھا۔ اس نے اس سے چورن لیا تھا لیکن چورن والے نے یہ بات چھپانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ کسی بچے نے اسے پرسوں چورن والے سے کچھ لیتے دیکھا تھا۔ ایک لڑکی نے ہاتھ اٹھایا، میں نے اسے پاس بلا کر پیار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ریحانہ کے ساتھ ہی سکول سے نکلی تھی۔ ریحانہ نے اس سے چورن اور چنے لئے تھے۔ پھر وہ خوانچے والے کے سٹول پر بیٹھ کر چنے کھانے لگی تھی۔ جب خوانچے والے کی بات چل نکلی تو ہیڈ مسٹریس نے بتایا کہ چورن والا بچوں سے بڑا پیار کرتا ہے۔ خاص طور پر اسے ریحانہ سے بہت اُنس تھا۔ چند ماہ پہلے ایک سائیکل والا ریحانہ کو ٹکر مار کر گزر گیا۔ ریحانہ کی ٹانگ سے خون بہنے لگا۔ چورن والے نے سائیکل سوار کا پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا اور خوب مارا۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس اپنے انداز سے بتا رہی تھی اور میں اپنے انداز سے سوچ رہا تھا۔ ہیڈ مسٹریس کے بیان کردہ واقعہ نے میرے شبے میں اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے سکول کے باہر آ کر خوانچہ فروشوں پر ایک نظر ڈالی۔ مختلف چیزیں بیچنے والے کوئی چھ خوانچہ فروش وہاں موجود تھے۔ چونکہ سکول اچھے علاقے کا تھا اس لئے خوانچہ فروش بھی نسبتاً صاف ستھرے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ایک خوانچہ فروش کا انتخاب کیا اور اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ اسے ساتھ لے کر اندر آ جائے۔ سکول کے ایک خالی کمرے میں بیٹھ کر میں نے خوانچہ فروش سے پوچھ گچھ کی۔ یہ پچیس تیس سال کا ایک دبلا سا شخص تھا اور آئس کریم بیچتا تھا۔ میں نے اس سے چورن فروش کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ چورن فروش کا نام رحمان ہے۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے، بال بچہ کوئی نہیں۔ اس شہر کی نواحی بستی میں اکیلا رہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ رحمان گم سم اور پراسرار سا آدمی ہے۔ بہت کم بات کرتا ہے۔ میں نے آئس کریم والے سے کرید کرید کر سوال پوچھے۔ اس نے بتایا کہ چچا اکبر خان والی

بچی (اکبر خان اس ملازم کا نام تھا جو ریحانہ کو سکول لاتا اور لے جاتا تھا) چورن فروش سے بڑی بے تکلف تھی۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ وہ چنوں پر ڈالنے والی مرچیں چمچ بھر بھر کر منہ میں ڈال رہی تھی اور وہ کھاتا جا رہا تھا۔ جلن کی وجہ سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا اور لڑکی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ وہ اکثر اس سے شرارتیں کرتی رہتی تھی۔ کبھی اس کی کوئی چیز لے کر بھاگ جاتی تھی اور کبھی اسے چھیڑنے کے لئے اس کا کوئی نام رکھ دیتی تھی۔ میں نے جب اس سے رحمان کے کردار کے بارے میں پوچھا تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ ویسے وہ میرا شک سمجھ گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی تھی اور وہ کچھ ڈر سا گیا تھا۔ میں نے پہلے نرمی سے بات کی پھر ڈرایا دھمکایا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے ورنہ مجھے سارے خوانچہ والوں کو تھانے لے جانا پڑے گا۔ کوشش کے باوجود وہ کوئی اور بات بتانے سے قاصر رہا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ یہاں ہونے والی باتوں کو صرف اپنے تک محدود رکھے ورنہ مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اسے روانہ کرنے سے پہلے میں نے عبدالرحمٰن کے گھر کا پتہ لے لیا تھا۔

.....

پولیس کو ہر انداز سے سوچنا پڑتا ہے۔ قتل کی ممکنہ وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ کسی جنونی نے بچی کو تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر ڈالا ہو۔ بچی کے جسم پر خراشیں تھیں اور لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ پھر خوانچہ فروش رحمان کا کردار جس طرح اُبھر کر سامنے آیا تھا اس سے اس شبے کو تقویت مل رہی تھی۔ میں نے اسی روز عبدالرحمان سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اس کے گھر بھیجا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد اے ایس آئی نے آ کر اطلاع دی کہ خوانچہ فروش کے گھر پر تالہ لگا ہوا ہے۔ پاس پڑوس والوں کا کہنا ہے کہ وہ بدھ کی شام سے گھر نہیں آیا۔ یاد رہے کہ ریحانہ کا قتل منگل کی دوپہر کو ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ خوانچے والا ایک کمرے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان ایک بیوہ عورت کا تھا جسے وہ چند روپے مہینہ کرایا دیتا تھا۔ لوگوں کو رحمان کے بارے میں زیادہ کچھ پتہ نہیں تھا۔ صرف یہ پتہ چلا کہ وہ پشاور کے نواحی علاقے کا رہنے والا ہے۔

تفتیش کا ایک راستہ وقتی طور پر بند ہو گیا تھا لیکن دوسرا ابھی کھلا تھا۔ یہ راستہ مجھے پتھر کے ایک چھوٹے سے منکے نے دکھایا تھا۔ یہ منکا میں نے مُردہ بچی سے چند گز کے فاصلے پر پڑا ہوا پایا تھا اور دیکھتے ساتھ ہی میں اس منکے کو پہچان گیا تھا۔ یہ منکا ایک تسبیح کا تھا اور تسبیح میرے لئے جانی پہچانی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اکثر تھانے میں آیا کرتی تھی۔ ہر وقت، حق ہو کے نعرے لگاتی اور تسبیح پھیرتی رہتی تھی۔ تھانے میں آ کر وہ میری کرسی کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ جاتی تھی۔ چائے کا ایک چھوٹا گلاس پی کر وہ بے تحاشا دعائیں دیتی تھی۔ میرے عملے کے کچھ ارکان اس کے بڑے زبردست مرید تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی انگلیوں میں تسبیح گردش کرتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ تسبیح مجھے یاد رہ گئی تھی۔ اگر یہ دانہ اس تسبیح کا تھا تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ عورت وہاں کیا کرنے آئی تھی۔ یہ ایک زیرِتعمیر عمارت تھی۔ بھیک وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے شام تک عورت کا اتہ پتہ دریافت کیا اور اسے تھانے بلا بھیجا۔ اس کا نام شب قدر تھا۔ سب اسے مائی شب قدر کہتے تھے۔ بہرحال عمر کے لحاظ سے وہ مائی نہیں تھی۔ یہی کوئی اڑتیس یا چالیس برس عمر رہی ہو گی۔ وہ اپنی طلبی پر

حیران تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ ایک دو بار پہلے بھی میں نے اسے اسی طرح تھانے بلوایا تھا۔ اس وقت میں نے اس سے ایک دو افراد کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے حسب معمول اس کے لئے چائے کا گلاس منگوایا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس نے ابھی تک مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ میں نے اسے کیوں بلوایا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں مسلسل تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ میں کن انکھیوں سے تسبیح کے منکے دیکھ رہا تھا۔ اس تسبیح کے منکے ہزاروں میں پہچانے جا سکتے تھے۔ سرخی مائل رنگ کے یہ بیضوی منکے کبوتر کے انڈوں سے کچھ ہی چھوٹے ہوں گے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جو منکا میرے پاس ہے وہ اس تسبیح کا ہے۔ میں نے باتوں کے دوران جیب سے منکا نکالا اور سامنے میز پر رکھ دیا۔ شب قدر نے ایک بار غور سے منکا دیکھا پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں تسبیح پر اور تیزی سے گردش کرنے لگی ہیں۔

''یہ منکا تمہاری تسبیح کا ہے شب قدر؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گئی ''نہیں پتر! نہیں۔'' وہ اپنی تسبیح میرے سامنے کرتی ہوئی بولی۔ اس کی آنکھیں جیسے کوئی گزرا ہوا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ''لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو، کہاں سے ملا ہے تمہیں یہ منکا؟''

''یونہی راستے میں ملا تھا۔ میں نے اُٹھا لیا۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا اور اس کی تسبیح ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ شب قدر اب گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا ''میرا خیال ہے تمہاری تسبیح کا ایک دانہ کم ہے۔''

''نہیں پتر! پورے سو ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''چلو ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور دانے گننے لگا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ شب قدر کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے..... میں نے تسبیح کے دانے گنے۔ وہ پورے سو تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تسبیح کو تھوڑا سا دُور رکھ کر دیکھا۔ اچانک میری نظر ایک دانے پر اٹک گئی۔ تمام دانے انگلیوں کی رگڑ سے بالکل ملائم اور چمکدار ہو گئے تھے لیکن یہ دانہ کچھ مدھم اور کھردرا سا نظر آ رہا تھا۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ دانہ تسبیح کے اندر بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ بہرحال میں نے شب قدر پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور تسبیح اسے لوٹا دی۔ جب میں اسے تسبیح لوٹا رہا تھا تو اچانک ایک چیز دیکھ کر چونک اٹھا۔ شب قدر کے گلے میں سیپوں کا ہار تھا اور ہار کے علاوہ اس نے گلے میں کوئی کپڑا بھی لپیٹ رکھا تھا۔ اس کپڑے میں دو جگہ پوٹلیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بھنے ہوئے چنے باندھ رکھے ہیں۔ ایسی پوٹلیاں میں ایک دو دفعہ پہلے بھی اس کے گلے میں دیکھ چکا تھا لیکن میں نے کبھی اس بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اس وقت میں چونکہ تفتیش کر رہا تھا اس لئے ہر چیز پر غور ضروری تھا۔ میں نے یونہی ایک پوٹلی کو دبا کر پوچھا

''اس میں کیا لئے پھرتی ہو؟''

''لو یہ بھی دیکھ لو۔'' وہ بولی ''تمہارے دل میں پتہ نہیں کیا شک ہے؟''

اس نے ایک پوٹلی کھول کر میرے سامنے کر دی۔ اس میں جو چیز نظر آئی وہ افیم یا چرس تو نہیں تھی لیکن میرے لئے اس سے زیادہ اہم تھی۔ میں ایک دم جیسے اچھل پڑا۔ مائی شب قدر نے دوپٹے میں خربوزے کے چھلے ہوئے خشک بیج باندھ رکھے تھے..... چند لمحے پہلے میرے دل میں جو شک پیدا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا تھا وہ ایک دم جوان ہو کر یقین کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔ ریحانہ کے قتل میں مائی شب قدر کا گہرا ہاتھ تھا۔ خربوزے کے بالکل ایسے ہی بیج ریحانہ کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مائی شب قدر کی گرفتاری اس وقت بھی عمل میں آ سکتی تھی لیکن جلد بازی ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس عورت کو آزاد چھوڑ کر اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کیا جائے۔ میں کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور اسے یہ تاثر دیا کہ میں نے اسے کسی دوسرے کام کے لئے بلایا تھا۔ یونہی علاقے کے ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل کر کے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میں نے ایک خاص مخبر کو بلایا اور اسے شب قدر کی نگرانی پر لگا دیا۔

مائی شب قدر میری نظروں میں بُری طرح مشکوک ہو چکی تھی۔ جس طرح تسبیح کا دانہ دیکھ کر اس کا رنگ اُڑا تھا اور اس نے اس بات کو چھپانے کی کوشش کی تھی میرا ماتھا فوراً ٹھنکا تھا۔ خربوزے کے خشک بیجوں نے میرے شک کو بڑی حد تک یقین میں بدل دیا تھا لیکن سب سے اہم سوال کا جواب ابھی باقی تھا۔ اگر شب قدر نے ریحانہ کو قتل کیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ اس قتل سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں جتنا سوچتا تھا ذہن اُلجھتا چلا جاتا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے شب قدر کے ماضی کے متعلق اور معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ ماضی کا خیال آتے ہی میرا دھیان شب قدر کے خاوند کی طرف چلا گیا۔ ایک روز شب قدر نے باتوں میں بتایا تھا کہ اس کے خاوند پر بچہ اٹھانے کا الزام لگا تھا جس پر اسے جیل ہوئی تھی پھر وہ جیل کے اندر ہی بیمار رہ کر مر گیا تھا۔ یہ بات شب قدر کی جوانی کی تھی۔ اس وقت میں نے اس بات پر اتنا غور نہیں کیا تھا۔ اب میرے دل میں اس بارے میں کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دوسرے روز میں نے اپنے مخبر سے کہا کہ وہ کسی ایسے شخص کی کھوج لگائے جس سے شب قدر کی پچھلی زندگی کے بارے میں پتہ چل سکے۔ اس دوران میرا دوسرا مخبر شب قدر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ عورت کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شہر کی ایک مضافاتی بستی میں رہتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ لڑکی ماں کی طرح بھیک مانگتی تھی، لڑکا آوارہ گردی کرتا تھا۔ مخبر نے بتایا کہ شب قدر رات کے وقت ایک پرانے کنویں کے منڈھیر پر بیٹھ کر کوئی چلہ وغیرہ کاٹتی ہے۔ وہ لوگوں کو تعویز گنڈے کر کے دیتی ہے اور غریب لوگ اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

اس اثناء میں میرے دوسرے مخبر نے اس بستی میں ایک ایسے شخص سے رابطہ قائم کر لیا جو شب قدر کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس شخص کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال کے قریب تھی۔ شب قدر کی بڑی بہن اس سے بیاہی گئی تھی۔ وہ مداری تھا اور ریچھ کا تماشہ دکھا کر روزی کماتا تھا۔ میرا مخبر اسے تھانے لے آیا۔ اس سے کافی طویل گفتگو ہوئی۔ اس سے پتہ چلا کہ شب قدر کے خاوند پر قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ شب قدر کے خاوند نے ایک بچے کو اٹھایا ہی نہیں تھا بلکہ اس سے پہلے وہ دو معصوم بچوں کو قتل بھی کر چکا تھا۔ دراصل وہ کالے علم اور جادوٹونے کا عمل کرتا تھا۔ سنا ہے کہ کسی کالے علم والے نے اسے بتایا تھا کہ اگر دو تین نوعمر بچوں کے خون سے نہا لے تو زبردست عامل بن جائے گا۔

میں اس شخص کی باتیں سن رہا تھا لیکن میرے ذہن میں ریحانہ کی لاش گھوم رہی تھی۔ کہیں ایسا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھا کہ مائی شب قدر ایک عرصے کے بعد اپنے خاوند کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لئے نکلی ہو..... سوچنے کی بات تھی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی ریحانہ کو قتل کرنے کی؟ مائی شب قدر کی اس سے کیا دشمنی تھی۔ پھر مخبر کی بتائی ہوئی بات میرے ذہن میں آئی کہ شب قدر آج کل ایک پرانے کنویں کے منڈھیر پر بیٹھ کر چلہ کاٹ رہی ہے۔ کہیں یہ وہی چلہ تو نہیں تھا جس کے لئے بچوں کے خون سے نہانا ضروری ہو جاتا ہے..... بہت کچھ واضح ہو چکا تھا لیکن ابھی بہت کچھ واضح ہونا باقی تھا۔ میں نے اس روز شب قدر سے سیدھی سیدھی باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ سہ پہر کے وقت میں نے دو سپاہی بھیجے اور وہ شب قدر کو تھانے لے آئے۔

وہ آج کچھ زیادہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی بات کی چغلی کھا رہی تھیں۔ آج تسبیح بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''آج تسبیح کدھر چھوڑ آئی ہو شب قدر؟''

وہ ذرا دیر میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی ''تھانیدار پتر! اگر تجھے پتہ چل ہی گیا ہے تو صاف صاف کہہ دے لیکن میں بیلی چھتری والے کی قسم کھاتی ہوں کہ وہ دل کا بُرا نہیں۔ بس حرامزادہ پاگل ہو گیا ہے، جان دیتا ہے اس پر۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی اور بات بتا رہی ہے۔ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی رو میں بہنے دیا۔ وہ کوئی دس منٹ بولتی رہی۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ شب قدر کا لڑکا ایک عورت سے عشق لڑا رہا تھا۔ یہ عورت کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھتی تھی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کا خاوند ایک سرکاری ملازم تھا اور شہر سے باہر رہتا تھا۔ ایک دفعہ اسے ان دونوں کے تعلقات کی بھنک پڑ گئی تھی اور اس نے شب قدر کے لڑکے کو آدمیوں سے پٹوایا بھی تھا۔ شب قدر کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس چکر میں پڑ کر اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اسے ہر وقت فکر رہتی تھی کہ اس عورت کا خاوند اسے مروا دے گا۔ وہ ہر وقت اسے منع کرتی رہتی تھی لیکن لڑکا کسی صورت اس عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ اس روز بھی شب قدر کا لڑکا اپنی محبوبہ سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے زیر تعمیر کوٹھی میں ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس پروگرام کی کسی طرح شب قدر کو خبر ہو گئی۔ وہ موقع پر پہنچی اور دونوں کو کوٹھی کے ایک تاریک گوشے میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو سخت سُست کہا اور طیش میں آ کر اسے تھپڑ مارے۔ اس دوران شب قدر کی تسبیح بھی ٹوٹ گئی۔ اتنے میں چوکیدار کی آواز آئی۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ لڑکا وہاں سے کھسک گیا۔ شب قدر نے جلدی جلدی تسبیح کے دانے اکٹھے کئے اور وہ بھی باہر نکل آئی۔ بعد میں نجانے عورت نے چوکیدار سے اپنی موجودگی کا کیا بہانہ بنایا۔

اب میری پوچھ گچھ پر شب قدر کو شک ہوا تھا کہ شاید مجھے اس روز کے واقع کا پتہ چل گیا ہے یا اس عورت نے پولیس کو کوئی بیان دیا ہے۔ شب قدر کی پوری بات سننے کے بعد میں نے اس کے مرحوم خاوند کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ انیس بیس سال پہلے اس نے دو قتل کئے تھے اور یہ کہ وہ کوئی چلہ وغیرہ کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بھی تو آج کل کوئی چلہ کاٹ رہی ہے۔ یہ چلہ کس قسم کا ہے؟ شب قدر کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں اس پر کس قسم کا شبہ کر رہا ہوں۔ شاید اسے اس بات کا پتہ ہی نہیں تھا کہ بچی کی لاش کس جگہ پائی گئی تھی اور یہ کہ بچی کے فراک سے ویسے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خشک بیج ملے تھے جیسے اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ اپنے لڑکے کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ اسے پتہ ہے کہ اگر وہ اس فاحشہ عورت کے چکر میں پڑا رہا تو ضرور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسی کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے وہ چلہ کاٹ رہی ہے۔ ویسے مخبر نے بھی بتایا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں بڑی فکرمند رہتی ہے اور محلے کی عورتوں کے سامنے اپنی پریشانیوں کا رونا روتی رہتی ہے۔

شب قدر کے بیان کے بعد میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ موقع واردات پر اس کی موجودگی ثابت ہوتی تھی لیکن اس کا بیان ظاہر کرتا تھا کہ وہ واردات سے بہت پہلے وہاں سے چلی آئی تھی۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے اسے آزاد رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اپنے بیٹے پر قابو پانے کی کوشش کرے ورنہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔ میں نے شب قدر سے یہ بھی کہا کہ وہ اگر شہر سے باہر جانا چاہتی ہو تو تھانے میں اطلاع دے کر جائے۔ وہ میری اس پابندی پر کچھ الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بہرحال اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا اور چلی گئی۔

.....

شب قدر کی طرف سے کوئی سراغ نہ پا کر میرا دھیان خود بخود عبدالرحمٰن کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی بہرحال میرے اے ایس آئی نے کسی طرح اس کا اتہ پتہ دریافت کر لیا تھا۔ پشاور کے ایک نواحی گاؤں میں اس کا چھوٹا بھائی رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ وہاں جایا کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی مسلسل غیر حاضری نے اسے اور بھی مشکوک بنا دیا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران مجھے بچی کی والدہ یعنی چوہدری شجاعت کی بیوی سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ عبدالرحمٰن خوانچہ فروش ان کی کوٹھی کے سامنے بھی آ کر کھڑا ہوتا تھا۔ ریحانہ اس کی آواز سنتے ہی بھاگ اٹھتی تھی۔ اسے کئی بار منع بھی کیا کہ اس سے کھٹی میٹھی چیزیں لے کر نہ کھایا کرلیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔ گھر میں کئی دفعہ اس نے ان شرارتوں کا ذکر بھی کیا تھا جو وہ خوانچہ فروش سے کرتی رہتی تھی۔ چوہدری شجاعت کی بیوی نے کہا کہ میں نے کچھ دن پہلے خوانچہ فروش سے کہا تھا کہ وہ گلی میں نہ آیا کرے۔ وہ ریحانہ سے اتنا لاڈ کرتا تھا کہ وہ خراب ہو رہی تھی۔ خوامخواہ کی شرارتیں اور ہنسی مذاق اس کی عادت بنتا جا رہا تھا۔

خوانچہ فروش عبدالرحمٰن کے بارے میں مجھے جو بھی معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک غیر شادی شدہ، تنہا اور پراسرار سا آدمی ہے۔ ایسے لوگ کسی معمے سے کم نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان کے اندر اور باہر میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں اندازہ کچھ لگایا جاتا ہے اور وہ نکلتے کچھ اور ہیں۔ میں اب جلد از جلد عبدالرحمٰن سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی جہاں زیب کو ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل کے ساتھ پشاور روانہ کر دیا۔ دوسرے روز شام کے وقت وہ واپس آ گئے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں کہ عبدالرحمٰن بھی ان کے ساتھ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل و صورت سے وہ تیس پینتیس سال کا نظر آتا تھا۔ لمبا جسم، چوڑے شانے اور سیدھے نرم بال جیسے عموماً سرحد کے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ میں اسے دیکھ کر سوچنے لگا کہ اگر اس شخص کو اچھے کپڑے پہنا کر کار میں بٹھا دیا جائے تو نہایت جاذب نظر شخص دکھائی دے لیکن اس وقت اس کا بُرا حال تھا۔ میلے کپڑے، ٹوٹی ہوئی جوتی اور چہرے پر گرد۔ مجھے سلام کر کے وہ سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں کچھ

آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں نے عبدالرحمٰن کو مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی عبدالرحمٰن! ہم نے تو سمجھا تھا کہ تمہارے بھائی نے تمہیں بارڈر پار کروا دیا ہوگا۔"

وہ حیرت سے منہ کھول کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھو عبدالرحمٰن!" میں نے سخت لہجے میں کہا "جو باتیں گدھے کی طرح مار کھانے کے بعد بتانی ہیں وہ ابھی بتا دو۔"

اس کا رنگ پہلے سے زیادہ زرد نظر آنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "سرکار! جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

حالانکہ اس نے یہ بات ہاتھ جوڑ کر کہی تھی لیکن لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ اس قسم کا ٹھہراؤ یا تو زندگی سے اکتائے آدمی کے لہجے میں ہوتا ہے یا پھر بہت خطرناک اور گہرے شخص کے لہجے میں۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوفزدہ لیکن گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے جس سکول کے سامنے تم خوانچہ لگاتے ہو اس سکول کی بچی کا قتل ہوا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"جی سرکار معلوم ہے۔" وہ غمگین سے لہجے میں بولا "میں جنازے میں شریک ہوا تھا جناب۔"

"منگل کے روز دوپہر ڈیڑھ بجے تم کہاں تھے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"میں روٹی کھانے کے لئے ایک تندور والے کے پاس گیا تھا حضور۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ فوراً آنے والے جواب بعض اوقات رٹے ہوئے ہوتے ہیں میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ڈری ہوئی آنکھیں بدستور مجھ پر جمی تھیں۔

میں نے کہا "عبدالرحمٰن کیا یہ سچ ہے کہ بچی کی والدہ نے تمہیں گلی میں خوانچہ لگانے سے منع کیا تھا اور تم نے اس کا بُرا منایا تھا؟"

"جناب! انہوں نے منع ضرور کیا تھا لیکن بُرا منانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم غریب لوگ بُرا منا کر کسی کا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"دیکھو عبدالرحمٰن! قتل ہونے والی بچی جس شخص سے آخری بار ملی وہ تم ہو لیکن تم نے جھوٹ بولا کہ وہ تم سے نہیں ملی۔ اس کی جیب سے تمہارا بیچا ہوا چورن نکلا۔ ایک لڑکی نے گواہی دی کہ وہ تمہارے پاس آئی تھی پھر منگل کے روز قتل ہوا اور بدھ کے روز تم گھر کو تالا لگا کر غائب ہو گئے..... تمہارے خلاف بہت شہادتیں اکٹھی ہو چکی ہیں۔ اگر چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے تو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔"

"سرکار مجھ پر یہ الزام نہ لگائیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ "سرکار مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ مجھ پر دس آدمیوں کا قتل ڈال دیں لیکن مجھ پر ریحانہ بی بی کے قتل کا الزام نہ لگائیں۔ میرا دل بڑا دُکھا ہوا ہے تھانیدار صاحب۔ میرا دل بڑا دُکھا ہوا ہے۔" وہ اب زاروقطار رو رہا تھا۔

"یہ دیکھئے صاحب..... یہ دیکھئے" اس نے روتے روتے اپنی پھٹی پرانی قمیص کی جیب سے ایک چھوٹا سا خوبصورت بٹوہ نکال کر دکھایا "یہ ریحانہ بی بی نے مجھے تحفہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا میرے ابو ایسے بٹوے میں پیسے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس میں پیسے رکھا کروں۔" اس نے بٹوے کو دو تین بار چوما۔ وہ اب ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا "بتاؤ ریحانہ بی بی میں نے تمہیں قتل کیا ہے؟ بتاؤ میں نے کیا ہے؟"

عبدالرحمٰن کے رونے کا منظر بڑا جذباتی تھا لیکن اگر پولیس والے ایسے مناظر سے متاثر ہونے لگیں تو قتل کا کوئی مجرم پکڑا نہ جائے۔ وہ جیسے کسی نے کہا ہے "عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔" اسی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنسو بھی عیار ہوتے ہیں۔ بات کوئی ہوتی ہے اور نکلتے کسی بات پر ہیں۔ جس طرح آنسو کے قطرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنسو خوشی میں گرا تھا یا غم میں، اسی طرح رونے والے کے دل کا حال بھی خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ بظاہر عبدالرحمٰن بڑا سوگوار دکھائی دے رہا تھا لیکن اس سوگواری کی بھی کئی تہیں ہوسکتی تھیں۔ میں نے ایک رائفل مین اس کی نگرانی پر مقرر کیا اور خود کسی کیس کے سلسلے میں چلا گیا۔ شام کو واپسی ہوئی۔ میں نے عبدالرحمٰن سے ایک بار پھر پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ریحانہ کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ شاید اس کی اپنی بچی بھی ہوتی تو وہ اسے اتنا پیار نہ کرتا۔ اس نے بتایا کہ ریحانہ کی موت نے اسے سخت سوگوار کر دیا تھا۔ اس کی اتنی ہمت نہیں پڑی کہ وہ ایک بار پھر خوانچہ سجائے اور اسی سکول کے سامنے جا کھڑا ہو جس کے گیٹ سے ریحانہ چہکتی ہوئی نکلتی تھی۔ اسے یہ ماحول کاٹنے کو دوڑ رہا تھا اسی لئے وہ کچھ دنوں کے لئے اپنے بھائی کے پاس چلا گیا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے اعتراف کیا کہ واردات کے روز چھٹی کے بعد ریحانہ اس کے خوانچے پر آئی تھی۔ اس نے چنے اور چورن لیا تھا۔ چنے اس نے وہیں بیٹھ کر کھائے تھے۔ وہ اس بات پر بڑی خوش تھی کہ اکبر خاں ابھی گاؤں سے نہیں آیا تھا۔ جب اکبر خاں اسے لینے آتا تھا تو وہ خوانچے پر نہیں رُک سکتی تھی۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ جب دو بجے کے قریب ریحانہ کی والدہ اور ان کی ملازمہ ریحانہ کا پوچھنے سکول آئیں تو وہ روٹی کھا کر واپس آ چکا تھا۔ ابھی بڑی کلاس کو چھٹی ہونا باقی تھی اس لئے وہ اور دوسرے خوانچہ فروش وہیں کھڑے تھے۔ اس نے ریحانہ کی والدہ سے جھوٹ بولا کہ ریحانہ اس کے خوانچے پر نہیں آئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی والدہ اسے چورن وغیرہ کھانے پر ڈانٹے گی۔

عبدالرحمٰن سے پوچھ گچھ کے دوران بچی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق اس کی موت سانس کی نالی کسی تیز دھار آلے کے ساتھ کٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ مقتولہ کے جسم پر خراشوں کے نشانات موجود تھے لیکن کسی قسم کے جنسی تشدد کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔ موت کا وقت وہی تھا جس کا ہم نے اندازہ لگایا تھا یعنی ایک اور دو کے درمیان بچی کے معدے میں ناشتے کے کچھ اجزاء کے علاوہ خربوزے کے کچھ بیج بھی موجود تھے۔ میں نے بچی کے فراک سے برآمد ہونے والے بیجوں کا الگ سے تجزیہ کروایا تھا۔ ان میں کسی قسم کی نشہ آور چیز نہیں تھی۔ پوسٹمارٹم رپورٹ سے بھی پتہ چلتا تھا کہ بچی کو قتل سے پہلے بیہوش نہیں کیا گیا۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں ایک چیز ایسی بھی تھی جس سے مجھے الجھن ہو رہی تھی، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ابھی میں رپورٹ کا مطالعہ ہی کر رہا تھا کہ میرے ایک اے ایس آئی نے ریحانہ کیس کے بارے میں ایک اہم اطلاع دی۔ کسی موہوم شک کی بناء پر میں نے ان چوروں کا پتہ کروایا تھا جنہوں نے چند ماہ پہلے چوہدری شجاعت کی کوٹھی میں واردات کی تھی۔ وہ ڈسٹرکٹ جیل میں بند تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ کل چار آدمی تھے اور چاروں نامی گرامی چور اور خطرناک مجرم تھے، اے ایس آئی نے جو اطلاع دی اس نے میری سوچوں کا رُخ ایک بار پھر موڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ سوموار کے روز یعنی قتل کی واردات سے صرف ایک روز پہلے چوروں کے اس گروہ کے دو آدمی جیل سے فرار ہوئے ہیں۔ پہلے پہل جب چوہدری شجاعت نے ان لوگوں پر شک کا اظہار کیا تھا تو میں نے اس شک کو اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ میرے تجربے کی بات ہے اور ہے بھی حقیقت کہ اس طرح

گھروں میں چوریاں کرتے ہوئے پکڑے جانے والے انتقامی کارروائیاں نہیں کرتے لیکن چوہدری شجاعت والا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ چوروں کا جو آدمی چوہدری شجاعت کی گرفت میں آیا تھا وہ ان کا بزرگ تھا۔ شاید کوئی چچا تایا تھا۔ چوہدری شجاعت نے نہ صرف اسے پکڑا تھا بلکہ مار پیٹ بھی کی تھی۔ مار پیٹ کے دوران اس شخص کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ یہ باتیں مدنظر رکھتے ہوئے بدلے کی کارروائی کو بالکل خارج از امکان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ قتل سے ایک روز پہلے متعلقہ گروہ کے دو آدمی جیل سے فرار ہوئے تھے۔ بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے بچی کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس دوران بچی نے مزاحمت کی ہو اور انہوں نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا ہو۔ جس کوٹھی کے اندر یہ واردات ہوئی وہ سکول کے راستے میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو گز لمبی گلی تھی۔ آمد و رفت بہت کم تھی۔ صرف مقامی کوٹھیوں کے مکین ہی یہاں سے گزرتے تھے۔ اگر گلی کے سروں پر دو آدمی کھڑے ہو کر راہگیروں پر نظر رکھیں تو اس قسم کی کارروائی بآسانی کی جا سکتی ہے۔ پھر مجھے اس گواہ کا بیان یاد آیا جس نے کہا تھا کہ واردات سے ایک گھنٹہ پہلے ایک تانگہ سڑک کے موڑ پر آ کر رُکا تھا۔ اس میں کچھ اجنبی افراد سوار تھے۔ تانگہ ڈیڑھ بجے تک وہاں رُکا رہا تھا۔ گواہی دینے والا ایک کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ ایک دکاندار نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی۔ میں نے چوکیدار سے ایک بار پھر رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں نے اسے تھانے بلوا بھیجا۔ چوکیدار ایک ادھیڑ عمر پٹھان تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر بیان دہرانے کو کہا۔ اس نے پشتو نما اردو میں جو تفصیل بتائی وہ یوں تھی: ساڑھے بارے بجے کے قریب ایک تانگہ گلی کے موڑ پر رُکا۔ کوچوان کے علاوہ اس پر دو افراد سوار تھے۔ دونوں لحیم شحیم اور شکل و صورت سے دیہاتی لگتے تھے۔ ایک شخص کے چہرے پر زخم کا نشان بہت نمایاں تھا۔ زخم کے نشان والا شخص تانگے میں بیٹھا رہا اور دوسرا اُتر کر کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد چوکیدار نے ڈیڑھ بجے کے قریب تانگہ دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا لیکن اب اس میں صرف کوچوان بیٹھا ہوا تھا۔ کوچوان اور اس کا تانگہ بھی کسی دیہاتی علاقے کے لگتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں افراد گلی سے نمودار ہوئے اور تانگے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ چوکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ بوقت ضرورت کوچوان اور زخم والے شخص کو بآسانی شناخت کر سکتا ہے۔

یہ زخم والا شخص پتہ نہیں کون تھا۔ میں نے اسی روز اے ایس آئی کو ڈسٹرکٹ جیل بھیجا تا کہ وہ فرار ہونے والے دونوں قیدیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ دوسری طرف میں نے اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش کی کہ تانگے والے تانگے سے اُتر کر کس کوٹھی میں گئے تھے۔ اس سلسلے میں اردگرد کی کوٹھیوں کے مکین ہی کچھ مدد کر سکتے تھے۔ میں نے دو تین مخبروں کو اس کام پر لگا دیا۔ اے ایس آئی نے ڈسٹرکٹ جیل سے واپس آ کر رپورٹ دی کہ قیدی سوموار کے روز جیل سے فرار ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر زخم کا نشان موجود تھا۔ متعلقہ پولیس ان کی گرفتاری کے لئے مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی تھی لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں تھی۔ صورتحال کسی حد تک واضح ہو رہی تھی۔ چوہدری شجاعت کے گھر گھسنے والے افراد میں سے کسی کے چہرے پر زخم کا نشان نہیں تھا۔ یہی بات تھی جو مجھے اب تک الجھن میں مبتلا کر رہی تھی لیکن اے ایس آئی کی اطلاع نے الجھن کافی حد تک رفع کر دی تھی۔ یقیناً جیل میں جانے کے بعد ان میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کسی کے چہرے پر زخم آیا تھا۔ جیل کے ریکارڈ میں ان افراد کی تصاویر موجود تھیں۔ میں نے اے ایس آئی کے ہاتھ ان تصاویر کی کاپیاں منگوائیں۔ پٹھان چوکیدار نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ تانگے والے افراد کو پہچان سکتا ہے۔ میں نے اسے تھانے بلایا اور تصاویر اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہ کافی دیر ان تصاویر کو دیکھتا رہا۔ ان تصاویر میں زخم والے آدمی کا چہرہ صاف تھا۔ کوشش کے باوجود وہ کوئی تصویر پہچاننے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ جیل سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ایک مفرور شخص کے جبڑے پر زخم کا نشان تھا جبکہ چوکیدار نے بیان دیا تھا کہ زخم کا نشان گال پر تھا۔ میں نے اس سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ہوسکتا ہے نشان جبڑے پر ہی ہو لیکن چونکہ وہ کچھ فاصلے پر تھا اس لئے زخم کی صحیح نوعیت اور مقام نہیں جان سکا۔ صورتحال کچھ عجیب طرح سے الجھی ہوئی تھی۔ تفتیش کے تمام راستے ایک مقام تک پہنچ کر مسدود ہو جاتے تھے۔ لڑکی کو قتل ہوئے دس روز سے زائد ہو چکے تھے لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ مائی شب قدر اور عبدالرحمٰن خوانچے والے کو میں نے پابند کر رکھا تھا۔ میں اپنے ذرائع سے مائی شب قدر کے بیان کی تصدیق کر چکا تھا۔ واقعی اس کے بیٹے کا ایک عورت سے چکر چل رہا تھا اور واردات کے روز وہ دونوں زیر تعمیر عمارت میں ملے تھے جہاں بعد میں مائی شب قدر پہنچ گئی تھی اور اس نے بیٹے کو لعن طعن کی تھی۔ واردات کے وقت مائی شب قدر کی موقع سے غیر موجودگی بھی ثابت ہوگئی تھی۔ باقی عبدالرحمٰن کے سلسلے میں بات ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں اب بھی کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ عین موقع واردات کے وقت وہ سکول کے گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ روٹی کھانے کے لئے تندور پر گیا تھا۔ تندور والے سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ عبدالرحمٰن روز تندور پر روٹی کھانے کے لئے آتا ہے۔ اسے یاد نہیں کہ منگل کی دوپہر وہ آیا تھا یا نہیں۔ کسی اور شخص سے بھی اس کی آمد کی تصدیق نہیں ہوئی۔

جن مخبروں کو میں نے تانگے کی چھان بین پر لگا رکھا تھا، انہوں نے رپورٹ دی کہ واردات کے روز دوپہر کے وقت کئی افراد نے اس تانگے کو دیکھا ہے۔ سکول کے اردگرد بچوں کو لے جانے کے لئے کچھ تانگے کھڑے رہتے تھے لیکن یہ تانگہ ایک تو سکول سے کافی ہٹ کر کھڑا تھا دوسرے شہری تانگوں سے قدرے مختلف تھا۔ سکول کے سامنے کھڑے کئی خوانچہ فروشوں نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ قتل کے روز ایک تانگہ چھوٹی گلی کے سرے پر مڑا تھا۔ علاقے کے کچھ مکینوں نے بھی ایک تانگے اور اس پر سوار اجنبی افراد کا ذکر کیا تھا۔ کچھ نے کہا کہ وہ کوچوان سمیت چار افراد تھے، کچھ نے تین افراد بتائے۔ سکول آنے والے دو تانگہ بانوں نے کہا کہ تانگہ شہری طرز کا تھا لیکن بہت پرانا تھا۔ اسی طرح وقت کے بارے میں بھی اختلاف تھا۔ دو تین افراد کا خیال تھا کہ یہ تانگہ ساڑھے بارہ بجے کی بجائے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سے وہاں کھڑا تھا۔ بہرحال اس بات پر سب متفق تھے کہ قتل کے روز دوپہر کے وقت گلی کے سرے پر ایک تانگہ موجود تھا جس پر اجنبی افراد سوار تھے۔ اب تفتیش کے آگے بڑھنے کے دو راستے تھے...... یا تو تانگے اور اس کی سواریوں کا پتہ چلتا یا جیل توڑ کر فرار ہونے والے قیدی پولیس کی گرفت میں آتے۔

....

چند روز بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا جس نے میری سوچ کا رُخ ایک بار پھر موڑ دیا۔ اس کیس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلسلے میں، میں نے خوانچہ فروش عبدالرحمٰن کو پابند کر رکھا تھا کہ وہ روز صبح کے وقت تھانے میں حاضری دے۔ میرا ایک مخبر بھی اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک روز صبح کے وقت عبدالرحمٰن تھانے نہیں آیا۔ دوپہر کے وقت مخبر نے بتایا کہ عبدالرحمٰن غائب ہے اور اس کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ اس نے اڑوس پڑوس میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا اور چپکے سے نکل گیا ہے۔ اگلے روز بھی اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میرا سب انسپکٹر مجھے کئی بار کہہ چکا تھا کہ مجھے عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لینا چاہیے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے اس کی بات نہ مان کر غلطی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معقول وجوہات ہونے کے باوجود میں نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ عبدالرحمٰن کا پتہ پانچویں چھٹے روز چلا۔ دوپہر کے وقت میں تھانے میں بیٹھا ایک مقدمے کی فائل دیکھ رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ گرمی سے اس کا بُرا حال تھا۔ کپڑے پسینے میں شرابور تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ لگتا تھا کہ بہت دُور سے چلتا ہوا یا بھاگتا ہوا آیا ہے۔ میں نے سپاہی کے ہاتھ ایک گلاس پانی منگوایا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ وہ کہنے لگا ”سرکار جلدی چلیں ورنہ وہ لوگ نکل جائیں گے۔ میں نے تانگے والوں کا پتہ لگا لیا ہے۔“

میں نے اسے پوری بات بتانے کا کہا۔ وہ بولا ”سرکار میں ہفتہ کے روز پچھلے ٹائم بازار سے گزر رہا تھا تو مجھے وہ کوچوان نظر آیا جس کا تانگہ ریحانہ بی بی کے قتل والے دن گلی میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے سوچا کہ اسے اسی وقت پکڑ کر آپ کے پاس لے آؤں۔ میں نے اپنا خوانچہ وہیں چھوڑا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ لاری اڈے کی طرف جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ وہ ایک بس میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ ہرہنس پورہ (اس شہر کے نواحی قصبے کا نام) جا رہا تھا۔ شہر سے کچھ سامان لینے آیا تھا۔ میں نے راستے میں اس سے یاری گانٹھ لی۔ میں نے اسے بتایا کہ بیروزگار ہوں اور مزدوری ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ دیہات میں آج کل گندم کی کٹائی ہو رہی ہے اور مزدوروں کی بڑی مانگ ہے۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں کٹائی کر لوں گا؟ میں نے کہا کہ کر لوں گا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہرہنس پورہ لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے ایک کاشتکار کے پاس کٹائی پر لگوا دیا۔ قصبے کا چوہدری ”حیات“ نام کا ایک شخص ہے۔ اس کے چار پانچ بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹا وہی ہے جو اس روز تانگے میں سوار تھا۔ چہرے کے زخم والا شخص بھی وہیں کا رہنے والا ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ اس کا نام مولا ہے اور وہ قصبے کا سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ ایک لمحہ رُک کر عبدالرحمٰن نے اپنی سانسیں درست کیں۔ جذبات کی شدت سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں بتا دینا چاہتا ہے۔ ”سرکار مجھ سے غلطی ہوئی کہ آج میں کرمو (اس کوچوان کا نام) سے پوچھ بیٹھا کہ کیا وہ کچھ روز پہلے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ شہر گیا تھا۔ میری بات سن کر مولا کا رنگ بدل گیا۔ اس نے مجھے گول مول سا جواب دیا اور چلا گیا۔ میں اسی کے گھر کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کرمو کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میں نے اس سے یہ سوال پوچھ کر غلطی کی ہے۔ اگر ان لوگوں نے واقعی کوئی جرم کیا ہے تو اب ہوشیار ہو جائیں گے۔ میں جب باہر نکلنے کے لئے دروازے کے پاس پہنچا تو پتہ چلا کہ کرمو جاتے جاتے مجھے کمرے میں بند کر گیا ہے۔ میں نے بہت دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی تک آواز نہیں پہنچی۔ شاید کرمو نے اپنے بیوی بچوں کو بھی

کہیں اور بھیج دیا تھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوہدری کے بیٹے کو میرے بارے میں بتانے گیا تھا..... میں نے سوچا مجھے جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کمرے میں ایک ٹوٹا ہوا بل پڑا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوکروں سے دروازے کی کنڈی توڑ دی۔ باہر نکل کر پتہ چلا کہ کرمو نے دروازے کو تالا لگا رکھا تھا۔ میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ہرہنس پورے سے پیدل چلتا اور بھاگتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔“

عبدالرحمٰن کی کہانی دلچسپ اور کارآمد تھی۔ اگر واقعی اس نے تانگے والے افراد کا سراغ لگا لیا تھا تو کیس کی تفتیش آگے بڑھ سکتی تھی۔ عبدالرحمٰن کی یہ بات بھی قابل غور تھی کہ جب اس نے تانگہ بان سے شہر آنے کا ذکر کیا تو وہ گھبرا گیا اور اس نے عبدالرحمٰن کو کمرے میں بند کر دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ کسی نہ کسی جرم میں ملوث تھے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ جرم ریحانہ کا قتل ہی ہو۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ ہرہنس پورہ روانہ ہو گیا۔ ہرہنس پورہ چوکی کا انچارج مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اسے کیس کے بارے میں ضروری تفصیلات بتائیں۔ ہم نے عبدالرحمٰن کی نشاندہی پر چھاپہ مارا اور تانگہ بان کے علاوہ چوہدری کے بیٹے اور مولا کو بھی گرفتار کر لیا۔ تینوں میں سے کسی نے روپوش ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنی گرفتاری پر سخت حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ چوہدری حیات کے بیٹے کا نام طفیل تھا۔ وہ ایک خوبرو اور صحت مند نوجوان تھا۔ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ مولا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ پٹھان چوکیدار کے بیان کے عین مطابق اس کے بائیں گال پر زخم کا نشان تھا۔ وہ اور تانگہ بان کرمو طفیل کے خاص چمچوں میں شمار ہوتے تھے۔ میں ان تینوں کو لے کر بذریعہ بس شام کے وقت تھانے واپس آ گیا۔

.....

تھانے میں تینوں افراد سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ انہوں نے اس بات کا فوراً اعتراف کر لیا کہ پچھلے منگل کو وہ تانگے پر سوار بہار کالونی کے علاقے میں آئے تھے۔ طفیل نے کہا کہ یہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے۔ اس دوست نے اپنا پتہ دیا تھا۔ وہ کوئی ایک گھنٹہ اس کی کوٹھی ڈھونڈتے رہے لیکن کوٹھی نہیں ملی۔ تھک ہار کر وہ ڈیڑھ بجے کے قریب واپس چلے گئے۔ طفیل وضع قطع اور لباس سے تو دیہاتی نظر آتا تھا لیکن خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے میٹرک کر رکھا ہے۔ میں نے جب تانگہ بان کرمو سے پوچھا کہ اس نے عبدالرحمٰن کو کمرے میں کیوں بند کیا تو وہ اس بات سے صاف مکر گیا۔ اس نے کہا ”جناب! مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ بعد میں میری بیوی نے بھی کہیں جانا تھا۔ شاید وہ جاتے جاتے باہر سے تالا لگا گئی ہو۔ اسے پتہ نہیں ہو گا کہ کمرے میں کوئی ہے..... بعد میں جب میں گھر آیا تو کمرے کی کنڈی اکھڑی ہوئی تھی اور عبدالرحمٰن غائب تھا۔“

میں کافی دیر ان تینوں افراد سے پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن ریحانہ کے قتل سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکا۔ دراصل جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ دولت، زمین، عورت، انا یا وقتی اشتعال۔ کوئی نہ کوئی سبب ایسا ضرور ہوتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی جان لینے پر اکساتا ہے۔ وجہ کے بغیر صرف جنونی یا پاگل ہی قتل کر سکتے ہیں..... اور ان تینوں افراد میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کوئی جنونی یا پاگل نظر نہیں آتا تھا۔ پھر انہوں نے ایک معصوم بچی کو قتل کیوں کیا۔ میں نے بہت کھوج لگایا لیکن بچی کے والدین یا ان کے عزیزوں کے ساتھ ان تینوں افراد کا کوئی تعلق ثابت نہ ہوا۔

چوہدری شجاعت نے کہا کہ میں ان تینوں آدمیوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ ان تینوں افراد نے بھی کہا کہ وہ چوہدری شجاعت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کوئی دولت وغیرہ کا معاملہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سوچا جا سکتا تھا کہ لڑکی کو کسی نے رقم ہتھیانے کے لئے اغوا کرنے کی کوشش کی ہو لیکن طفیل ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ لڑکی پر مجرمانہ تشدد کا خیال میں پہلے ہی رد کر چکا تھا۔

اگلے روز طفیل کا باپ چوہدری حیات چند بڑی بڑی سفارشیں لے کر آ گیا۔ ملزموں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ صرف اس بات پر کہ قتل کے روز وہ ایک جگہ تانگہ لئے کھڑے تھے ان پر فرد جرم عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ تمام سراغرسانی پر لعنت بھیجوں۔ عبدالرحمن سیدھا سیدھا مجرم ثابت ہو رہا ہے۔ لڑکی کی والدہ کا بیان اس کے خلاف ہے۔ وہ موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی بھی ثابت نہیں کر سکا اور واردات کے فوراً بعد روپوش بھی ہو گیا تھا۔ کیوں نہ اسے گرفتار کر کے چالان مکمل کروں اور اس وبال جان سے نجات پاؤں لیکن پھر میرے اندر کا پولیس انسپکٹر جاگ اُٹھا اور اس نے اپنے وزنی بوٹ سے اس خیال کی چنگاری کو بجھا دیا۔ میری نگاہوں میں خاک وخون میں لتھڑا ہوا ایک معصوم چہرہ گھوم گیا اور کانوں میں ایک دکھیاری ماں کی آہ و پکار گونجنے لگی۔

"انسپکٹر صاحب! ایک بار کہہ دیجئے کہ آپ نے جھوٹ بولا ہے میری بچی زندہ ہے....."

میں نے بارہا آزمایا ہے کہ کامیابی اور ناکامی کے درمیان ایک لکیر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات آدمی جس جگہ کھڑا ہو کر اپنے نصیب کو کوستا ہے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا گلہ کرتا ہے، اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کامیابی اس کی منتظر ہوتی ہے۔ ناکام لوگ ایک قدم کے فاصلے سے واپس لوٹ آتے ہیں اور کامیاب بچی کھچی قوت جمع کر کے ایک قدم اور اُٹھا لیتے ہیں۔ شاید یہ قدم خدا نے کامران لوگوں کے امتحان کے لئے رکھا ہوتا ہے۔ میں ذکر کر رہا تھا طفیل اور اس کے ساتھیوں کا۔ جس وقت شخصی ضمانت نامے تیار ہو چکے تھے اور میں ان لوگوں کو رہا کرنے والا تھا، اچانک میری نگاہ مولا بخش عرف مولا کے دائیں ہاتھ پر پڑی۔ اس ہاتھ کی شہادت کی ساتھ والی انگلی آدھی کٹی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مندرجات میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا رپورٹ میں ایک چیز مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ پولیس سرجن نے ایک جگہ واضح طور پر لکھا تھا "لاش کے بائیں بازو اور ٹانگ پر جو خراشیں ہیں وہ ایک ہی انسانی ہاتھ کی وجہ سے آئی ہیں۔ ٹانگ پر جو خراشیں ہیں وہ نہایت واضح ہیں اور ان کے معائنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ٹانگ پر جس ہاتھ کی گرفت تھی اس کی بڑی انگلی دباؤ نہیں ڈال رہی تھی۔ بازو والی خراشوں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس ہاتھ کی بڑی انگلی کٹی ہوئی ہو۔"

میں چوہدری حیات وغیرہ کو کمرے میں بیٹھا چھوڑ کر باہر تھانے کے صحن میں آ گیا۔ نیم کے درخت کے نیچے ہیڈ کانسٹیبل محبت خان ستا رہا تھا۔ محبت خان اپنے نام کے بالکل برعکس ایک نہایت گرم مزاج اور سنگدل شخص تھا۔ پولیس کے حلقوں میں اسے "عقوبت خاں" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

بڑے بڑے سخت جان اور اکھڑ مجرم اس کے سامنے پانی کی طرح بہہ جاتے تھے۔ میں نے کہا "محبت خاں! تم بڑے دنوں سے سستی کی شکایت کر رہے ہو۔ آج میں نے تمہارے ہاتھ پیر کھولنے کا موقع فراہم کیا ہے۔"

"جو حکم سرکار کا۔" اس نے کھٹاک سے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

میں کمرے میں واپس آیا۔ چوہدری حیات بیٹے کی رہائی کا منتظر تھا۔ میں نے اسے کہا کہ کاغذات میں کچھ فرق ہے۔ اسے رہائی کے لئے کل تک انتظار کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی بحث وتمحیص کے بعد وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی روانگی کے بعد میں نے تینوں افراد کو کمرے میں بلایا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک سے ایک بڑھ کر گھاگ اور ہوشیار ہیں، آسانی سے کچھ نہیں بتائیں گے۔ پھر بھی حجت پوری کرنے کے لئے میں نے سوچا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں جلد سے جلد اس کیس کو نمٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے صاف صاف بتا دو کہ لڑکی کو کس نے کیسے اور کیوں قتل کیا۔ وہ تینوں میرے رویے کی اس اچانک تبدیلی پر ششدر رہ گئے۔ ذرا دیر بعد چوہدری کا لڑکا طفیل تنک کر بولا

"تھانیدار جی! آپ تھوڑی دیر صبر کریں اور ابا جی کو آ لینے دیں۔"

"ابا جی اب تمہاری ہڈیاں ہی اکٹھی کرنے آئیں گے بیٹے۔" میں نے غصے سے کہا اور محبت خان کو اشارہ کیا۔ وہ تین کانسٹیبلوں کے ساتھ ان لوگوں کو ہانکتا ہوا باہر نکل گیا..... صرف دس منٹ بعد جب ان لوگوں کو میرے سامنے لایا گیا تو ان کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اپنی تاریخ اور جغرافیہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ محبت خاں نے ان پر اپنے مخصوص داؤ آزمائے تھے۔ بظاہر ان کے جسموں پر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اندرونی چوٹوں نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا۔ طفیل اور مولا ابھی تک اپنے موقف پر قائم تھے۔ وہ کافی ڈھیٹ ہڈی کے معلوم ہوتے تھے لیکن تانگہ بان کرمو کچھ بدلا ہوا تھا۔ محبت خاں کی شکل دیکھ کر وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

کوشش کامیاب رہی۔ وعدہ معاف گواہ بننے کے بعد کرمو نے جو طویل بیان دیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

منگل کے روز صبح کے وقت مولا بخش اس کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ چوہدری طفیل نے شہر جانا ہے اس لئے تانگہ لے کر آ جاؤ۔ کرمو تانگہ لے کر نو بجے کے قریب چوہدری کی حویلی پہنچا۔ طفیل اور مولا تانگے پر سوار ہو گئے۔ طفیل خوب بنا سنورا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا تھا۔ شہر میں ایک عورت سے اس کا یارانہ تھا۔ یہ عورت ایک بچی کی ماں تھی اور کھاتے پیتے کاروباری شوہر کی بیوی تھی۔ شوہر یوں تو مالدار تھا لیکن شکل وصورت میں عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عورت بے حد خوبصورت تھی جبکہ شوہر جسمانی طور پر کمزور اور سانولا تھا۔ یوں بھی عورت کے مقابلے میں اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ چوہدری طفیل سے اس عورت کی ملاقات ایک شادی میں ہوئی تھی۔ چوہدری طفیل بڑا رنگین مزاج تھا۔ اس کا دل اس عورت پر ریجھ گیا۔ عورت نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ دونوں چپکے چپکے ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ روز روز کی ملاقاتوں نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ دونوں شادی شدہ تھے لیکن دونوں اپنے اپنے شریک زندگی کو دھوکہ دے رہے تھے۔ ایک روز عورت جس کا نام ثریا تھا، طفیل سے ملی اور اسے کہا کہ وہ اسے گھر پر ملے۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا کہ وہ اس روز اپنے خاوند اور بچی کو شہر سے باہر بھیج دے گی۔ اس کے علاوہ گھر میں اس کا سُسر تھا لیکن وہ صبح کو نکلتا تھا اور شام کو لوٹتا تھا۔ میدان بالکل صاف تھا۔ وہ پکڑ دھکڑ سے بے خطر ہو کر رنگ رلیاں منا سکتے تھے۔ اپنے منصوبے پر عمل کے لئے انہوں نے منگل کا دن چنا تھا۔ منگل کے روز کرمو ساڑھے بارہ بجے کے قریب چوہدری طفیل اور مولا کو لے کر بہار کالونی پہنچا۔ پروگرام کے مطابق کرمو اور مولا تانگے میں بیٹھے رہے جبکہ طفیل تانگے سے اُتر کر ثریا کے گھر چلا گیا۔ کوئی آدھ پون گھنٹے بعد مولا کو ثریا کا سُسر گھر کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ بوڑھے کو دیکھ کر مولا پریشان ہو گیا۔ کرمو سے کہنے لگا کہ یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتا رہا پھر کرمو کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر تانگے سے اُترا اور گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا..... اس کے بعد کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد مولا اور چوہدری طفیل تیز قدموں سے تانگے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ دونوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر کرمو سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ تانگے میں بیٹھتے ہی مولا نے کرمو سے کہا کہ جلدی چلو۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر انہوں نے کرمو کو بتایا کہ انہوں نے ثریا کے سُسر کو سیڑھیوں سے نیچے دھکا دے دیا ہے اور وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔ کرمو کو شک ہو رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ اس کے بار بار پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ثریا کا سُسر مر گیا ہے۔ کرمو کو اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ جب خوانچہ فروش عبدالرحمٰن نے اس سے شہر میں تانگہ لے کر جانے کے بارے میں پوچھا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی کچھ اور بھی جانتا ہو۔ اس نے اسے کمرے میں بند کر دیا اور خود چوہدری طفیل وغیرہ کو بتانے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ چوہدری طفیل اور مولا کو لے کر واپس آیا تو عبدالرحمٰن دروازہ توڑ کر نکل چکا تھا۔

کیس اب ایک عجیب موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ ریحانہ کا قاتل ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک نئی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ میں نے اے ایس آئی جہانزیب کو معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ پچھلے منگل نو بہار کالونی کے ساتھ والی گلی میں ایک موت ہوئی تھی۔ ایک بوڑھا شخص جس کی نظر کمزور تھی دوسری منزل کی سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ کسی شخص کو اس کی موت پر قتل کا شبہ نہیں تھا۔ یہ واقعہ اس زیرتعمیر کوٹھی سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہوا تھا جہاں چوہدری شجاعت کی معصوم بچی بے دردی سے قتل کر دی گئی تھی۔ ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ پر دو قتل ہوئے تھے۔ مقتول بچی کے جسم پر خراشوں کے نشان جو کہانی سنا رہے تھے وہ میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ معصوم بچی اور عمر رسیدہ شخص کے قاتل ایک ہی تھے۔ اب قتل کی ان دونوں وارداتوں کے درمیان رشتہ جوڑنا باقی تھا..... اور پھر میرے لئے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اچانک ذہن میں جھماکہ سا ہوا اور سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔

تانگہ بان نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ ثریا کی ایک بچی بھی ہے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ بچی ریحانہ کی ہم عمر اور ہم جماعت تھی۔ زیادہ امکان تھا کہ وہ دونوں آپس میں سہیلیاں تھیں اور حال ہی میں ان کی دوستی ہوئی تھی۔

.....

اگلے چند گھنٹوں میں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ ثریا کی بچی طلعت مقتولہ ریحانہ کی ہم جماعت تھی۔ ثریا لاکھ ہوشیار چالاک سہی لیکن ایک عورت تھی۔ پوچھ گچھ کے دوران زیادہ دیر اپنا آپ نہ چھپا سکی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ قتل سے

تھوڑی دیر پہلے ریحانہ ان کے گھر آئی تھی۔ ایک بار ثریا کی زبان پھسلی تو پھر پھسلتی چلی گئی۔ ایک ایک کر کے تمام پردے کھل گئے۔ وہ مان گئی کہ طفیل کی باتوں میں آ کر اس نے اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے وہ کچھ اس طرح تھے۔

ثریا نے منصوبے کے مطابق شوہر اور بچی کو شہر سے باہر ایک عزیز کے ہاں بھیج دیا تھا۔ ان کو اگلے روز واپس آنا تھا۔ رہا سُسر تو دوپہر کے وقت اس کے گھر آنے کی توقع نہیں تھی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب طفیل نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اسے لے کر اوپری منزل پر آ گئی۔ ایک بجے سکول میں چھٹی ہوئی۔ طلعت چونکہ سکول نہیں گئی تھی، ریحانہ اس کا پوچھنے کے لئے ان کے گھر آئی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ثریا نے دروازہ کھولا۔ اس نے بچی کو دروازے سے ٹالنا چاہا لیکن شاید اس بدنصیب کی موت اسے آواز دے رہی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے طلعت کی انگریزی کاپی چاہیے۔ ثریا بچی کو لے کر اوپر گئی۔ طفیل اس وقت کمرے کے اندر تھا۔ ثریا نے بچی کو صحن میں بٹھایا۔ اس نے اسے کاپی دی (خربوزے کے خشک بیج بھی بچی نے یہیں سے حاصل کئے) اس اثناء میں ثریا کا سُسر گھر پہنچ گیا۔ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا اوپر آ گیا۔ جس کمرے میں طفیل چھپا ہوا تھا یہ ثریا کے سُسر کا کمرہ تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ثریا نے اسے روکنا چاہا۔ بوڑھے کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ثریا کو ہٹا کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ شور مچاتا، طفیل نے لپک کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ اتنے میں مولا بھی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر آ گیا۔ دونوں نے بوڑھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ثریا نے عقب سے ایک وزنی چیز بوڑھے کے سر پر ماری۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ طفیل اور ثریا نے فوری طور پر فیصلہ کیا اور وہ بوڑھے کو گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں تک لے آئے۔ پھر انہوں نے اسے سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا۔ بچی حیرت اور خوف سے بت بنی یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے اسے ہوش آیا اور وہ چیختی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے بھاگی۔ مولا اس کے پیچھے لپکا۔ طفیل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بچی کی بدقسمتی کہ اس نے جلدی گھر پہنچنے کے خیال سے زیرتعمیر کوٹھی کے اندر سے گزرنا چاہا۔ مولا نے اسے پکڑ لیا اور مضبوطی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنے میں طفیل بھی پہنچ گیا۔ اس کے سر پر پہلے ہی خون سوار تھا۔ اس نے جیب سے گراری والا چاقو نکالا۔ مولا نے قربانی کے بکرے کی طرح معصوم بچی کو زمین پر لٹایا۔ وہ تڑپی مچلی لیکن ان سنگدلوں کو رحم نہ آیا اور چاقو سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی..... اور پھر ابو امی کہنے والے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ خوبصورت آنکھیں کچھ سوچتے سوچتے بے نور ہو گئیں۔ ننھے منے قدم زندگی کا مختصر سفر ختم کر کے بے جان ہو گئے.....

مجرموں کی گرفتاری کے بعد عدالتی کارروائی کا طویل دور شروع ہوا۔ عدالت میں پیش کرتنیوں مجرم یعنی طفیل، ثریا اور مولا اپنے اقبالی بیانوں سے منحرف ہو گئے۔ بہرحال میں نے چالان تیار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اگر میں عدالتی کارروائی کی تفصیل میں گیا تو قارئین کو کئی صفحات اور پڑھنے پڑیں گے۔ قصہ مختصر یہ کہ سیشن کورٹ سے تینوں مجرموں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ بعد میں ہائیکورٹ نے ثریا کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا لیکن باقی دونوں مجرموں کی سزائے موت برقرار رکھی۔ اپنے وحشیانہ جرم کے کوئی دو سال بعد دونوں درندہ صفت افراد تختۂ دار پر جھول گئے۔

.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

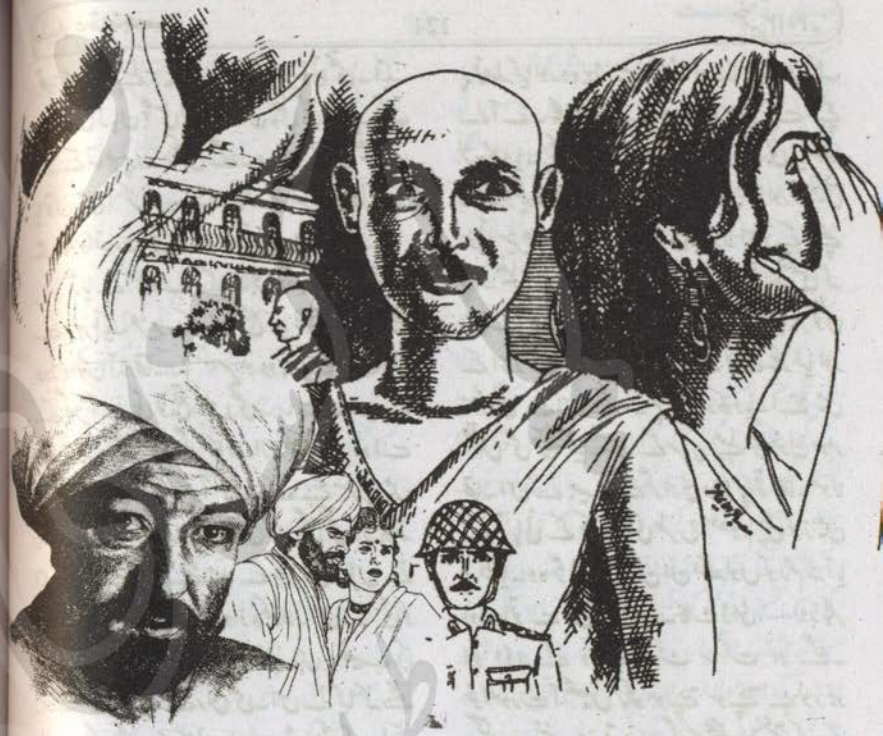

رنجیت سنگھ اور شعلے

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

"سردار پٹیل نے سکھ لیڈروں کو یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح کے پاکستان کی تو "پے" بھی نہیں بننے والی بلکہ یہ "پے" تو پنجاب کی ہی رہے گی اور پنجاب سکھوں کا ہے! پیسہ اور اسلحہ ہم دیں گے! مسلو کا قتل عام کر کے انہیں اقلیت میں بدلنا سکھوں کا کام ہے! لاہور تو ایک بار پھر واہ گرو کے خالصہ کا پایہ تخت ہوگا.....!"

تقسیم ہند کے دنوں کی کہانی جب ہر طرف آگ اور شعلے پھیلے ہوئے تھے

سکول کے سب لوگ اسے ماسٹر غوری کہتے تھے، دراصل ماسٹر عبداللہ ارسلان غوری ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس کا مورث اعلیٰ مشہور مسلمان فاتح محمد غوری کی سپاہ میں شامل تھا، لاہور کے جس محلے میں وہ رہتا تھا اسے بھی محلہ غوریان اور غوری کی بستی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، باہمی تعاون، محنت، ہمدردی، امن اور صفائی کے لئے یہ بستی مشہور تھی مگر اپنے دور زوال میں سکھ حکمران اپنا رعب قائم رکھنے اور دہشت پھیلانے کے لئے مجرم اور بے گناہ اور چور اور سادھ میں کوئی فرق نہیں کیا کرتے تھے بلکہ بے گناہ کو سزا دینے اور سادھ کو چور قرار دینے میں سکھ حکمرانوں نے اپنے دور زوال میں "بڑے بڑے کمالات" دکھائے ہیں۔ شاید وہ چاہتے ہوں گے کہ زوال حکومت میں زیادہ دیر نہ لگے اور "غوری کی بستی" کی بربادی اس پر گواہ ہے۔ سکھوں نے اس بستی کو لاہوریوں کے لئے عبرت کا نمونہ بنا دیا تھا، سوتے میں ہی پوری بستی کو موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ صرف ماسٹر عبداللہ کا دادا بستی سے باہر ہونے کے سبب زندہ بچ گیا تھا!

لاہور کے لوگ اس ظلم کا مقابلہ اس منصفانہ روش سے کیا کرتے تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے بیٹوں نے اختیار کی تھی! یہاں تک کہ مہاراجہ کی ایک پوتی نے تو اپنی ایک منت پوری ہونے پر حضرت داتا صاحب کی مسجد اور مزار کی مرمت بھی اپنے جیب خرچ سے کروائی تھی۔ ماسٹر عبداللہ اور اس کے والد ارسلان غوری نے اپنی شاندار غوری روایات کو زندہ رکھتے ہوئے انسانی خدمت کو اپنا مشغلہ بنایا ہوا تھا جس کی بہترین صورت جہالت کو مٹانا اور علم کی روشنی کو عام کرنا ہے، یوں گویا تدریس کا پیشہ ماسٹر عبداللہ ارسلان غوری کو ورثے میں ملا تھا چنانچہ اپنے سکول میں وہ اسلامی تاریخ اور تحریک پاکستان کا بہترین استاد مانا جاتا تھا۔

ایک روز دسویں کے ایک طالبعلم نے ماسٹر غوری سے سبق کے ضمن میں یہ سوال کیا:

"جناب استاد صاحب! ہماری کتاب معلومات عامہ میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم برصغیر کے موقع پر تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت یا انتقال آبادی کا واقعہ پیش آیا تھا جو ہولناک بھی تھا، المناک بھی اور شرمناک بھی۔ جناب اس کا کیا مطلب ہے؟"

"میرے عزیزو یہ بے حد اہم اور بہت ہی مناسب سوال ہے جو اس نوجوان نے پوچھا ہے اور اس کا جواب آپ سب پاکستانیوں کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے اور اسے یاد بھی رکھنا چاہیے۔ تاریخ میں بادشاہتیں اور حکومتیں تو ہمیشہ بدلتی رہی ہیں مگر آبادی یا رعایا کبھی نہیں بدلی جیسے اس موقع پر آبادی کا تبادلہ ہوا۔ اس عجیب و غریب انتقال آبادی کے لئے ہندو نے تو پہلے سے باقاعدہ تیاری اور منصوبہ بندی کر رکھی تھی مگر مسلمان اس قیامت صغریٰ سے تقریباً بے خبر تھے۔ اس لئے سب سے زیادہ نقصان بھی مسلمانوں کا ہی ہوا۔ سامراجی حکمران انگریز کا جانا تو طے تھا! مگر ہندو نے بھی یہ طے کر رکھا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی مسلمان اقلیت کا ایک ہزار سالہ حساب چکانا ہے اور ان کو ہر حال میں نقصان پہنچانا ہے، انگریز نے بھی چونکہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے ہی چھینی تھی اس لئے وہ بھی انہی سے عداوت رکھتا تھا اور اس نقصان میں وہ بھی ہندو کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ انگریز نے بھی ہمیشہ ہندو کو ناجائز فائدہ پہنچایا اور مسلمانوں سے ہمیشہ جان بوجھ کر ناانصافی کی۔ ہندو اور انگریز دونوں برصغیر کی تقسیم بالکل نہیں چاہتے تھے مگر وہ مسلمانوں کو ان کے آئینی حقوق بھی دینے کے لئے تیار نہ تھے، دونوں چاہتے تھے کہ مسلمان انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی میں آ جائیں اور ہندو نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ وہ مسلمانوں سے ایک ہزار سالہ غلامی کا انتقام لیں گے، جو بھاگ سکتے ہیں بھاگ جائیں گے، جو قتل ہو سکتے ہیں وہ مار دیئے جائیں گے اور جو بچ جائیں گے انہیں بدھوں اور جینیوں کی طرح "متحدہ ہندو قومیت" میں ضم کر لیا جائے گا۔"

"مگر جناب مسلمان اس قیامت خیز حادثہ سے بے خبر کیوں تھے؟" ایک اور شاگرد نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھئی! اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اپنے ایک ہزار سالہ اقتدار کے خاتمہ کے صدمہ سے دوچار ہونے والے مسلمان کافی عرصہ تک ہوش ہی نہ سنبھال سکے تھے۔ انگریز نے مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبر ایک اور اصل مدمقابل سمجھا اور ہمیشہ انہیں ہی نقصان پہنچاتا رہا جبکہ ہندو کو اس نے اپنا معاون اور دوست سمجھا اور تمام فوائد ہندو کی جھولی میں ڈالتا رہا۔ اس طرح مسلمان جاہل اور پسماندہ ہو کر رہ گئے۔ مسلمانوں کا باہمی اختلاف اس کے علاوہ تھا۔ دراصل برطانیہ کو روس کی یلغار کا ڈر تھا اور وہ چاہتا تھا کہ پورا برصغیر ہندو کے ماتحت متحد رہے۔ روس کے لئے ایک دیوار بنا رہے اور مسلمان بھی ہندو کے لئے رکاوٹ نہ بن سکیں بلکہ انہیں اسلامی دنیا کے مسائل میں دلچسپی لینے کے قابل بھی نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ متحدہ بھارت پر تو کسی ایک ہندو کو بھی اختلاف نہ تھا جبکہ قیام پاکستان کے بارے میں تمام مسلمانوں میں شدید اختلافات تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ مسلمان ہندو کو سمجھ سکے نہ انگریز کو بلکہ وہ تو اپنے کسی انجام سے ہی غافل تھے۔"

"مگر جناب! انتقال آبادی کا یہ حادثہ ہولناک، المناک اور شرمناک کیونکر تھا؟" ایک لڑکے نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

"دیکھو بیٹا! یہ بڑا ہی بھیانک اور قیامت خیز حادثہ تھا۔ اسے لفظوں میں بیان کرنا تو کسی کے بس میں ہی نہیں ہے بلکہ الفاظ میں ان کی ہولناکی اور قیامت خیزی کو سمویا ہی نہیں جا سکتا..... میں تو اس وقت چھوٹا سا بچہ تھا لیکن والد کی صحبت اور تربیت نے میری سمجھ بوجھ کو بہت بڑھا دیا تھا۔ میں اس قیامت صغریٰ کا عینی شاہد ہوں، واقعات اور مناظر آج بھی میرے دل و دماغ میں اسی طرح تازہ اور پختہ ہیں، آج بھی جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو لرز جاتا ہوں اور میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے والد گرامی ارسلان غور تحریک پاکستان کے سرگرم اور پرجوش کارکن تھے اور مہاجرین کی بحالی میں انتھک محنت کرتے رہے تھے۔ میں بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لٹے پٹے آنے والے مسلمان قافلوں کی مقدور بھر خدمت کرتا رہا تھا۔ میں اس وقت آپ کو اس سلسلے کے دو تین ایسے واقعات سناتا ہوں جن سے آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ حادثہ کس قدر ہولناک، المناک اور شرمناک تھا!

"عزیزو! میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان بھی انسان کی جان لے سکتا ہے، اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ شیطانی کھیل انسان کا بچہ آخر کیوں اور کیسے شروع کرتا ہے! مگر ایک دن میں نے عجیب اور دل دہلا دینے والا منظر دیکھا کہ کچھ نوجوان مسلمانوں کی ایک ٹولی محلے سے نکلی اور لاہور ریلوے سٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ نوجوان مسلمانوں پر سکھوں کی درندگی اور بربریت کی خبریں سننے کے بعد اس کے ردعمل کے طور پر بدلہ لینے کے لئے گھر سے نکلے تھے، میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا تھا، وہ ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تھے، دور بنچ پر ایک بوڑھا سکھ اکیلا بیٹھا ہوا تھا، وہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے، ہتھیار بھی ان کے پاس موجود تھے مگر ان میں سے کسی میں یہ حوصلہ اور ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اس بوڑھے سکھ کے پاس خود چل کر جائیں اور اسے قتل کر دیں اس لئے انہوں نے بوڑھے کو اپنے پاس بلایا اور جب وہ چل کر ان کے قریب آ گیا تو سب نے اسے زمین پر گرایا پھر تلوار سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس نے جان دیتے وقت ایک خوفناک چیخ ماری اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ گویا اس بوڑھے کو قتل کرنے کے بعد اب یہ

ٹولی بھی انسانوں کو قتل کرنے میں شیر ہو گئی تھی مگر بوڑھے کی چیخ سن کر کچھ ہندو سکھ بھی وہاں دوڑے چلے آئے تھے پھر کیا تھا تمام پلیٹ فارم خون سے لت پت ہو گیا اور یہ فساد اس وقت تک جاری رہا جب تک امرتسر جانے والی ٹرین نہیں آ گئی! پھر ہندو اور سکھ ٹرین میں سوار ہو گئے اور پولیس کی نگرانی میں وہ ٹرین امرتسر کے لئے روانہ ہو گئی۔ میں تو ایک طرف دبکا کھڑا تھا مگر میں نے دیکھا کہ ان نوجوانوں میں سے کوئی زخمی تھا، کوئی گرا پڑا تھا اور کچھ یونہی بیٹھے ہوئے تھے مگر اب وہ پکے بلوائی اور فسادی بن چکے تھے۔

اور میں اگرچہ چھوٹا بچہ ہی تھا مگر میں روزانہ سویرے سویرے ریلوے سٹیشن پر پہنچ جاتا تھا اور پھر شام کو واہگہ کی سرحد پر بھی پہنچ جاتا تھا، گرمی کے دن تھے اس لئے میں ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی چھاگل اپنے پاس رکھتا تھا۔ ایک دن سٹیشن پر کچھ قلی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور پانی مانگا۔ انہیں پانی پلا کر میں ان کے پاس ہی ایک طرف بیٹھ گیا اور ان کی باتیں سننے لگا۔ ان میں سے ایک قلی نے دوسرے سے کہا:

"یار آج صبح جو ٹرین امرتسر سے لاہور پہنچی ہے اس کے ہولناک اور دردناک منظر نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میرے لئے تو کچھ بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ تمام ڈبے خون ہی خون تھے یا کٹے ہوئے انسانی اعضاء..... معصوم بچوں کی مسخ شدہ لاشیں، عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں، مسخ شدہ چہروں کے ساتھ کٹے ہوئے سر..... میں تو کسی ڈبے کو ایک دو منٹ سے زیادہ دیکھ بھی نہیں سکا! بیان کیا کروں؟"

پھر ایک اور بولا: "اُف! یار یہ کیا کہہ رہا ہے تُو؟ یہ نہیں ہو سکتا! یہ ظلم کوئی انسان نہیں کر سکتا!"

"ہاں مگر ڈاکو اور لٹیرے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اب ایسے بہادر لوگ کہاں؟ اب تو سب ایک جیسے ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ ہندو سکھ مسلمان عیسائی سب ایک جیسے ہیں۔ کل ہی کی تو بات ہے کہ لاہور میں گوالمنڈی کے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کل رات جو ٹرین امرتسر سے آئی ہے اس میں صرف ٹرین چلانے والے ہی زندہ تھے اور وہ بھی زخمی۔ باقی سب لاشیں ہی تھیں، کٹے ہوئے اعضا، ننگی عورتوں کے اعضاء، معصوم بچوں کی مسخ شدہ لاشیں، یہ سب کچھ سکھوں اور ہندوؤں نے کیا ہے؟ کیا فرق ہے ان سب میں! یار سب ہی درندے ہیں۔" پہلا بولا۔

"مگر تجھے شاید یہ پتہ نہیں کہ گوالمنڈی کا خونی ڈرامہ ایک ہندو پنڈت نے کرایا ہے۔ بانساں والے بازار میں اسی پنڈت نے خود ایک مندر کو آگ لگائی اور جب آگ بھڑک اٹھی اور وہ بھاگنے لگا تو بھاگتے ہوئے اسے دو مسلمانوں نے پکڑ لیا اور اس کی خوب پٹائی کی۔ پنڈت کی فریاد پر بعض ہندو سکھ بھی جوش میں آ گئے۔ کئی مارے گئے۔ اس لئے جو کچھ گوالمنڈی میں ہوا وہ تو ایک ردعمل تھا۔" دوسرے نے پہلے کو سمجھایا۔

"اسی طرح عمل اور ردعمل سے دنیا میں تباہی آتی ہے کیونکہ ہر عمل کا ردعمل یا جواب تو ہوتا ہے! کم یا زیادہ کی اور بات ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جو کچھ تاراگڑھ میں ہوا وہ بھی کسی عمل کا ہی ردعمل ہو گا!" پہلے نے رائے دی۔

"تُو ٹھیک ہی کہتا ہے یار! ہو سکتا ہے یہ بھی کسی پنڈت کی خفیہ شرارت کا ردعمل ہو یا ممکن ہے ماسٹر تارا سنگھ کے کرپان لہرانے اور سکھ جتھوں کو اکسانے کا نتیجہ ہو یا ہو سکتا ہے سکھوں کو مزید جوش دلانے کے لئے کسی ولبھائی پٹیل، میرا مطلب ہے، کسی متعصب سرمایہ دار ہندو کا اس میں ہاتھ ہو!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے قلی نے کہا۔

''ہندو کا ہاتھ ہو؟ کیا مطلب ہے تیرا؟ ہر برائی میں ہندو ہی کا ہاتھ کیوں؟'' پہلے قلی نے سوال کے انداز میں تعجب سے کہا۔

''یاد رکھ! اس برصغیر کی زیادہ تر بیماریوں اور خرابیوں کا سرچشمہ گھمنڈی ہندو برہمن اور اس کا تحقیر آمیز طبقاتی نظام ہے۔ یہ نسل پرست گھمنڈی برہمن اس انسانی برابری اور برادری کے تصور کو اپنے اقتدار کی موت تصور کرتا ہے جو اسلام نے دیا ہے۔ اس لئے وہ مسلمان کو اور اس کے اسلام کو یہاں کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔'' دوسرے قلی نے کہا۔

''یار فرید! آج صبح جو ٹرین دلی سے لاہور آئی ہے اس کے بھی تمام ڈبے انسانی خون سے لت پت اور مسخ شدہ لاشوں سے اٹے ہوئے تھے، عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر، پھر ان کے ناک اور کان کاٹ کر کے ان کے ہار بنائے گئے اور پھر وہ لاشوں پر سجا دیئے گئے تھے اور ساتھ ہی ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا کہ ''یہ ہے پاکستان کا تحفہ'' عورتوں کی ننگی لاشوں پر مرے ہوئے ننگے مردوں کو ڈال دیا گیا تھا! لاشوں کو ڈھانپنے کے لئے کوئی مردانہ کپڑا تھا نہ زنانہ! معلوم ہوتا تھا کہ کسی جنگل میں ٹرین کو روک کر یہ بزدلانہ کارروائی کی گئی تھی!''

''ہاں یار اسلم! کل شام جو ٹرین امرتسر سے لاہور پہنچی ہے اس کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔''

''لیکن پرسوں دوپہر کو جو ٹرین فیروز پور کے راستے لاہور پہنچی تھی اس کا دردناک منظر بھی ناقابل بیان ہے! اس قدر ہولناک اور شرمناک منظر کہ میری زبان میں بیان کرنے کی نہ سکت ہے نہ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ ہی کانوں میں سننے کی تاب ہے!'' ایک اور قلی نے دوسرے کو بتایا۔

''ہاں یار! بہت افسوسناک بات ہے! اب تو ہر طرف مار دھاڑ کے ہی مناظر ہیں، ہر طرف ہنگامے اور خوف کی فضا ہے! آج صبح جو ٹرین یہاں سے امرتسر کے لئے روانہ ہوئی ہے اسے بھی مسلح پولیس نے مسلمان بلوائیوں سے بڑی مشکل سے بچا کر روانہ کیا ہے!'' دوسرے قلی نے گھبراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''ہاں بھائی! مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں لیکن جو کچھ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں مسلمانوں میں اس کا ردعمل تو ضرور ہونا تھا، مسلمانوں نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہن رکھیں نا! سکھوں نے تو وحشت اور درندگی کی انتہا کر دی ہے!'' پہلے قلی نے کہا۔

''اور کیا تجھے پتا ہے یہ سب کچھ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کروا رہا ہے! اس نے تو اپنی کرپان لہراتے ہوئے اعلان کر دیا ہے کہ میں پاکستان نہیں بننے دوں گا! پنجاب کے تمام دریا ان مسلوں کے خون سے سرخ ہو جائیں گے! سنا ہے پورے پنجاب میں تارا سنگھ نے مسلح سکھ جتھے پھیلا دیئے ہیں اور انہوں نے تباہی مچا رکھی ہے! ہر ایک سکھ کی زبان پر ہے کہ ہم پنجاب سے مسلوں کی نسل ہی ختم کر دیں گے! اس کے لئے انہیں ہندو سیٹھ سرمایہ اور اسلحہ مہیا کر رہے ہیں!'' دوسرے قلی نے بتایا۔

''تو ٹھیک ہی کہتا ہے بھائی! ہندو کا تو کام ہی یہی ہے مگر ہندو کی اس بدفطرتی کا اندازہ نہ سکھوں کو ہے نہ مسلمانوں کو! وہ تو مغلوں کے زمانے میں بھی سکھوں کو مسلمانوں سے لڑانے کی سازشیں کرتا تھا، اب بھی کر رہا ہے اور کرتا ہی رہے گا! یہ تو سکھوں سے مسلمانوں کو اور مسلمانوں سے سکھوں کو ختم کروا کر انتقام بھی لینا چاہتا ہے اور تماشا بھی دیکھنا چاہتا ہے!'' پہلے نے کہا۔

''ہاں یار! لیکن لائل پور، راولپنڈی اور گجر خان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں مسلمانوں نے بھی ہندو سکھ پناہ گزینوں کا حشر کر دیا ہے! میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ گجر خان کی تحصیل میں ماسٹر تارا سنگھ کا گاؤں ہے تارا گڑھ جہاں مسلمانوں نے تارا سنگھ کی ماں کو قتل کر کے اس کی لاش کو درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا دیا ہے! بھلا یہ بھی کوئی بہادری کی بات ہے؟ عورت ذات پر تو ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں!'' دوسرا بولا۔

''ہاں مگر ڈاکو اور لٹیرے کسی بھی اخلاقی ضابطہ اور قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ اب بھلا اس آج کی دنیا میں وہ مسلمان کہاں جو عظیم اخلاقی قدروں اور اصولوں کے پابند ہوتے تھے۔'' پہلے قلی نے کہا۔

پھر ماسٹر غوری نے کہا ''بچو! یہ تو وہ باتیں ہیں جو میں نے اس وقت ان قلیوں سے سنی تھیں مگر سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ تو ایک جوشیلا اور بے عقل سکھ تھا! سکول ماسٹری چھوڑ کر سیاسی لیڈر بن گیا تھا، اس کا ایک بچپن کا دوست اور جگری یار تھا۔ تارا گڑھ کا راجہ افضل خان، جسے تارے کی ماں نے منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا! اس عظیم سکھ خاتون کی کہانی مجھے اسی راجہ افضل نے سنائی تھی، جس روز ماسٹر تارا سنگھ اپنے اس تاریخی اعلان کے بعد تارا گڑھ پہنچا تھا اور اپنی ماں کی لاش راجہ کے گھر دیکھ کر رویا تھا اس کا دردناک منظر بھی مجھ سے راجہ نے ہی بیان کیا تھا اور اس سے ہونے والی اپنی گفتگو بھی سنائی تھی۔ راجہ نے تارا سے گلہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''یار تاریا! یہ تو بتا کہ تُو بدل کیوں گیا ہے؟ تُو نے پہلے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ اکالی دل والوں نے مسٹر جناح کی بات مان لی ہے اور اب سکھ بھی پاکستان میں شامل ہو رہے ہیں! پھر اچانک یہ خبر آئی کہ تُو نے پنجاب اسمبلی کے دروازہ پر خنجر لہراتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ میں پاکستان نہیں بننے دُوں گا! یہ کیا ہے؟''

''بس یار میں بھی دغاباز برہمن اور بنیا کے فریب میں آ گیا تھا! مجھے ولبھائی پٹیل نے یہ یقین دلایا تھا کہ محمد علی جناح کانگریس اور انگریز کے چکر میں آ چکا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اب ہم نے جناح کا پاکستان نہیں بننے دینا۔ اچھوت لیڈر امبید کر بھی جناح کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس کا ہمنوا بن چکا ہے اس لئے اب سکھ بھی کانگریس کا ساتھ دیں، ہم بھی انہیں خوش کر دیں گے! بلیچھ مسلمانوں کے لئے اب برصغیر میں کوئی جگہ نہیں ان سے تو بھارت ماتا کو پاک کرنا ہے! سکھوں کو روپیہ اور اسلحہ ہم دیں گے! پنجاب میں لاہور سے پشاور تک کوئی بلیچھ زندہ نہ بچے جو بھاگتے ہیں انہیں بھاگنے دو، جو مار سکتے ہو وہ مار دو جو بچ رہے انہیں زبردستی شدھ کر لیا جائے گا! یوں مہران، پشاور اور پنجاب سب خالصہ کے پاؤں میں ہو گا۔ رنجیت سنگھ کا لاہور ایک بار پھر سکھوں کی راجدھانی اور خالصتان کا دارالحکومت ہو گا! اسی لئے میں نے خنجر لہرا کر وہ اعلان کیا تھا مگر پھر دغاباز ہندو نے تو تقسیم کو بھی مان لیا ہے اور قیام پاکستان پر بھی راضی ہو گیا ہے۔ اب شاید مجھ سے کئے گئے اس کے باقی وعدوں کا بھی یہی حشر ہو گا!'' تارا سنگھ نے اپنے بچپن کے جگری یار اور منہ بولے بھائی راجہ افضل خان کو بتایا تھا!

''اچھا تو کانگریسی برہمن..... بنیا گٹھ جوڑ کی اتنی سی بات پر بابے جناح کو تُو نے جواب دے دیا اور مسلمانوں کے بجائے برہمن..... بنیا کی مان لی ہے اور اپنے خنجر کا رُخ بھی تُو نے مسلمانوں کی طرف کر دیا ہے؟ یہ دغاباز برہمن اور فریب کار بنیا تو وہی ہے نا جس سے گرونانک جی مہاراج نے بھی بغاوت کی تھی اور جو تین چار سو سال سے مسلمان، سکھ دشمنی کو پکا کرنے کے لئے کیا کیا کرتا چلا آتا ہے!'' راجا نے اپنے سکھ دوست سے گلہ کرتے

ہوئے کہا تھا۔

''راجیا! تو سچ کہتا ہے مگر اب کے جو کچھ برہمن بنیا سکھوں سے مسلمانوں کے خلاف کروانے جا رہا ہے اس کی شاید ماضی اور مستقبل میں کبھی بھی کوئی مثال نہ مل سکے گی! جو مسلمان، سکھ دشمنی اب جنم لینے والی ہے اسے شاید زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے اور پنجاب کے پانچوں دریا بھی اس کے داغوں کو نہ دھو سکیں گے!'' تارا سنگھ نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے بتایا تھا۔

''کیا کہتا ہے تاریا؟ کیا ہونے والا ہے! کچھ تو بتا دے یار!'' راجا نے ہانپتے ہوئے پوچھا تھا۔

''سردار پٹیل نے سکھ لیڈروں کو یہ یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح کے پاکستان کی تو ''پے'' بھی نہیں بننے والی بلکہ یہ ''پے'' تو پنجاب کی ہی رہے گی اور پنجاب سکھوں کا ہے! پیسہ اور اسلحہ ہم دیں گے! مسلو کا قتل عام کر کے انہیں اقلیت میں بدلنا سکھوں کا کام ہے! لاہور تو ایک بار پھر واہ گرو کے خالصہ کا پایہ تخت ہو گا.....!'' سکھ لیڈر نے ہندو سازش سے پردہ اٹھاتے ہوئے بیان کیا تھا۔

''اور ہندو کے اسی وعدہ پر تُو نے مسلمانوں کے خلاف اپنا خنجر لہرا دیا؟ مگر مسٹر جناح کا پاکستان تو بن گیا ہے اب کیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں یار! رونا تو یہی ہے! ہندو کا پہلا جھوٹ اور دغابازی تو سامنے آ ہی گئی ہے مگر اکالی دل والوں نے پٹیل کا دیا ہوا پیسہ اور اسلحہ پورے پنجاب کے سکھ جتھوں میں بانٹ دیا ہے! اب جو قیامت آنی ہے وہ تو آئے گی ہی مگر دھوکے باز ہندو نے سکھوں کو کچھ بھی نہیں دینا! باقی سب وعدے بھی فریب کے جال تھے! اب تو بابا نانک اور راجا رنجیت کا خالصہ مجھے بھی نہیں بخشے گا! سکھڑے بھی قیامت تک ہی ہاتھ ملتے رہیں گے! لیکن چھوڑ یار اس کہانی کو! سب اکالی شرمار ہے ہیں اور میں تو اب حرف غلط کی طرح مٹ جاؤں گا ''میرا تے لکھ نہیں رہ گیا!'' پر ان مسلوں نے میری شاناں والی ماں کے ساتھ کیا نہیں کیا.....!'' ماسٹر نے غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں تاریا نہیں! سُنے گا تو تجھے لگ پتہ جائے گا! سیٹھ ہردیال تیرا کانگریسی دوست تھا نا؟ اس سارے شیطانی کھیل کا کرتا دھرتا وہی تھا! اسی نے چار آدمی ڈاکوؤں کے روپ میں تیرے گھر بھجوائے تھے۔ سورگی ماں جی نے جب نقاب پوش ڈاکو اندر آتے دیکھے تو اس نے تیرے ملازم ہڑبونگ سنگھ کو پچھلے دروازے سے بھیجتے ہوئے کہا تھا ''جا میرے بیٹے راجو کو فوراً خبر کر'' مگر میں اس وقت گھر پر نہ تھا۔ چار میں سے دو ڈاکو ہندو تھے اور دو مسلمان۔ انہوں نے گھر لوٹا پھر اسے آگ لگا دی۔ ماں جی کو صحن میں پھینکا، کپڑے پھاڑے اور وہ کچھ کیا جو میری زبان پر نہیں آ سکتا! ماں جی کی لاش کو پیپل کے درخت پر اُلٹا لٹکا دیا۔ یہ کام دونوں ہندوؤں نے کیا۔ ہردیال بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہندوؤں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اور لوٹا ہوا مال بھی ان سے لے لیا تھا۔ دونوں مسلمان ڈاکو درخت کے اوپر چھپے ہوئے تھے اور سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تب انہوں نے ہردیال کا کام تمام کیا اور وہ بھاگنے ہی لگے تھے کہ انہیں پولیس نے آ لیا اور اتنے میں میں بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ دونوں ڈاکو تھانے میں بند ہیں۔ وہ بندھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ جب تمام کہانی سناتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چل تجھے بھی اپنے کانوں سے سب کچھ سننا چاہیے!'' میں نے اس المیہ کی تفاصیل تارا سنگھ کو دیں۔

''مگر مجھے واقعہ کی اطلاع ہردیال نے ہی بھجوائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پنڈی ڈویژن کے تمام اضلاع کے سکھوں کو بھی اسی نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں نے تارا سنگھ کے گھر اور اس کی ماں کا یہ حشر کیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی پورے پنجاب کے سکھ جتھوں کو خبر پہنچا دی ہے..... مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ میری شاناں والی سورگی ماں تو واپس نہیں آئے گی نا۔"

"بھائی تارا سنگھا! میں نے جب ماں جی کے پوتر جسم کو دُور سے درخت پر لٹکتے دیکھا تو میری آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہو گئے! اور یوں لگا جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو مگر پھر جب میں نے دیکھا کہ سیٹھ ہردیال پستول لئے قریب ہی کھڑا ہے، وہ بھاگنے والے دونوں ہندو ڈاکوؤں کو موت کی نیند سلا چکا ہے اور نقدی اور زیور (جس میں سورگی ماں جی کی چوڑیاں بھی شامل تھیں) اپنی جیبوں میں بھر رہا ہے تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دو آدمی درخت کی ٹہنیوں میں موجود ہیں مگر بدبخت ہردیال ان سے غافل ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے دو مسلمان ڈاکوؤں کے روپ میں یہاں ہیں جو جسم کو درخت سے باندھ رہے ہیں۔ میں بھی دوسرے درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ وہ ان مرے ہوئے دو ہندوؤں سے اپنی زبان میں کہہ رہا تھا کہ شاید تم یہ سمجھتے تھے کہ ہردیال یہاں نہیں آئے گا اور تم بھاگ کر یہ سب کچھ بچا جاؤ گے مگر سیٹھ ہردیال کو تم نہیں جانتے! تارا سنگھ کو اکسانے کے لئے یہی کافی ہے! اب جو آگ بھڑکے گی وہ سب کو بھسم کر دے گی مگر ہاں وہ مسلے کدھر گئے! شاید لوٹ مار کرتے ہوئے مکان کے اندر ہی بھسم ہو چکے ہیں!" اسی اثناء میں درخت پر سے ایک آدمی ہردیال کے اوپر یوں گرا کہ اس کے ہاتھ سے پستول بھی گر کر دور جا پڑا اور اس آدمی کا خنجر بھی ہردیال کے پیٹ کو پھاڑ چکا تھا۔ پھر دوسرا آدمی یوں گرا کہ اس کی تلوار نے ہردیال کا

وغیرہ، وغیرہ.....

☆ یہ دنیا بھی عجیب شے ہے، آپ چپ رہتے ہیں تو وہ آپ کو جاہل سمجھتی ہے اور جب آپ بولتے ہیں تو ان کا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

☆ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جلد اعتبار کر لیتی ہے۔

☆ سب سے پسندیدہ کام یا تو غیر اخلاقی ہیں یا غیر قانونی۔

☆ عورت کے آنسو اور مرد کے بازو دنیا میں کیا نہیں کر سکتے۔

☆ خشک روٹی کھاؤ مگر خشک مزاج نہ بنو۔

☆ الفاظ روتے اور آنسو بولتے ہیں۔

☆ ایک ایسی غلطی جو تم میں عاجزی پیدا کر دے، اس کارنامے سے بہتر ہے جو تم میں غرور پیدا کر دے۔

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤ۔

☆ لوگوں کے واقعات سے سبق حاصل کرو ورنہ لوگ کل تمہارے واقعات سے سبق حاصل کریں گے۔

مرتب: ایس۔ امتیاز احمد (کراچی)

سر تن سے جدا کر دیا۔ میں یہ سب کچھ پاس والے گھنے درخت کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں گارڈ سمیت تھانیدار بھی وہاں پہنچ گیا جسے میں خبردار کر آیا تھا۔ سپاہیوں نے ان دونوں آدمیوں پر بندوقیں تان لیں پھر انہیں غیر مسلح کر کے گرفتار کر لیا۔ ان دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور یہ تمام کہانی تجھے ان کی زبانی سنوائی جا سکتی ہے۔" تارا سنگھ کو میں نے بتایا اور پھر روتے ہوئے اسے مزید بتایا کہ

"پھر میں ماں جی کی طرف لپکا اور ان کے وہ ہاتھ چومنا چاہے جو کبھی مجھے اور تجھے چوری کھلایا

کرتے تھے مگر..... مگر وہاں تو خون کے فوارے جاری تھے! میں نے ان کی لاش اُتار کر اسے اپنی خاکی چادر میں لپیٹ دیا پھر گھر سے کفن والی سفید چادر منگوائی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی سورگی ماں جی کو اپنے قبرستان میں دفن کر دوں اور ان کی قبر اتنی اونچی اور نمایاں بناؤں کہ دنیا دیکھتی رہے مگر پھر تیرا خیال آیا کہ شاید تجھے اچھا نہ لگے اس لئے میت کو گھر لے آیا ہوں۔"

"یار اگر تُو دفن کر دیتا تو تیرا بھی حق تھا! اچھا ہوتا۔ یار تم مسلمان تو مر کر بھی زمین کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو اس کے اوپر بھی ہو اندر بھی۔ جیتے مرتے تم تو اپنی اس زمین کے ساتھ ہی ہوتے ہو!" تارا سنگھ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اس سے کہا

"تاریا! مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ مجھے بھابھی صاحبہ اور جوان بچیوں کی حفاظت کرنا ہے اس لئے میں احتیاطی طور پر انہیں اپنے گھر لے آیا تھا، اب انہیں بھی منزل پر پہنچانا ہے اور تجھے بھی، اس لئے میں نے تم سب کے لئے چار پانچ کالے برقعوں کا انتظام کر رکھا ہے۔"

"یہ برقعے کس کام کے؟ یہ تو صرف مسلم خواتین کی ضرورت ہوتی ہے!" تارا سنگھ حیرت سے بولا مگر میں نے اسے سمجھایا:

"تُو نہیں سمجھے گا تاریا! خود ہی تو بتا رہا ہے کہ رستے میں کئی جگہ تجھے مسلمانوں نے پہچاننے اور تجھے ٹھکانے لگانے کا ارادہ بھی کیا ہے اس لئے اب تم سب نے یہ کالے برقعے پہننا ہیں تاکہ تمہیں باپردہ مسلمان عورتیں سمجھا جائے۔ بھابھی صاحبہ چہرہ ننگا کر کے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھیں گی اور تُو میری اس جاپانی ویگن کے پچھلے کونے میں سیٹ پر اس طرح بیٹھے گا کہ تجھے ایک بھاری بھرکم "اناج دشمن" بوڑھی عورت سمجھا جائے!" میں نے اسے جلد تیار ہونے کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"تارا گڑھ سے واہگہ کی سرحد تک میں نے اپنی پرانی جاپانی ویگن کو اس طرح چلایا جیسے ایک پنجاب کا بڑا زمیندار اپنے گھرانے کی عورتوں کو کسی پیر فقیر کی زیارت کے لئے لے جا رہا ہو، یہ پانچ افراد کا قافلہ جب واہگہ پہنچا تو میں نے سب کو آرام سے اُتر کر پناہ گزین کیمپ میں جانے کو کہا اور تارا سنگھ سے کہا کہ برقع فوراً اُتار دے اور اسے سیٹ پر چھوڑ کر اُتر جائے۔"

"تو یہ گڈیاں برقعے نہیں اُتاریں گی؟" تارا سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں بھائی! ہم لوگ اپنی مہمان بہنوں اور بیٹیوں کے سر ڈھانپتے ہیں، ننگے نہیں کرتے۔ جو کچھ ان کے سروں پر اوڑھوایا گیا ہے وہ اب ان کا ہے، انہی کے کام آئے گا۔"

"یار راجیا! تجھے تو میری جگہ سکھوں کا لیڈر ہونا چاہیے تھا۔ کم سے کم دغاباز برہمن کے فریب میں تو نہ آتا۔ مجھے تو کمبخت پٹیل نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میرے اعلان پر جو سکھ مشتعل ہو گئے ہیں اب انہیں تو پٹیل کا باپ بھی نہیں روک سکے گا۔ میں نے گرونانک جی مہاراج اور رنجیت سنگھ کے خالصہ کا کیا حال کر دیا ہے؟ یہ طوفان اب کہاں جا کر رُکے گا؟ یہ بے گناہوں کا خون تو میری ہی گردن پر ہو گا۔" تارا سنگھ نے کہا مگر میں نے غصہ سے زور دے کر اس سے کہا تھا:

"قوم کے لیڈر کو چنگاری پھینکنے سے پہلے اس کے نتیجے میں اُبھرنے والے شعلوں کی شدت اور مدت کا اندازہ بھی پہلے ہی کر لینا چاہیے، تارا سنگھا!!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انوکھی مسرت کے لمحے

قیوم راہی

آج نہ جانے کیوں اسکو محسوس ہو رہا تھا جیسے دُور دُور تک سازشوں کے جال پھیلے ہیں۔ جو بھی چہرہ سامنے آتا، مشکوک نظر آتا اور اشتعال کی ایک تیز رو دوڑا دیتا چنانچہ بیوی پر بھی اس کو غصہ آنے لگا جو آئے دن اس کو طعنے دیتی رہتی تھی کہ لوگ کما کما کر گھروں کو سجا رہے ہیں، ہر طرح عیش کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ لکیر کا فقیر.....

ایک شخص کا فسانہ، کسی کے میٹھے بول نے اسکی سوچ کا رُخ بدل دیا

''اب اُٹھیے بھی نا آٹھ بج چکے ہیں۔'' اس کی بیوی نے اس کا شانہ ہلا کر صبح ہونے کی اطلاع دی۔

''اُٹھتا ہوں۔'' اس نے کروٹ بدل کر بے دلی سے جواب دیا۔ ''تم ناشتہ تیار کر لو۔'' اس کی بیوی دبے پاؤں باورچی خانے میں چلی گئی۔

جاگ تو وہ خاصی دیر سے رہا تھا محض کسل مندی کے باعث اور اس تصور کے زیر اثر آنکھیں میچے لیٹا تھا کہ آج جمعہ ہے۔

اس نے دیکھا کہ سورج کی شعاعیں دریچے کے شیشے سے چھن چھن کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اب اس روشنی میں انسان اُٹھ کر رات گئے تک نہ جانے کتنے لبادوں میں اپنا آپ چھپا کر

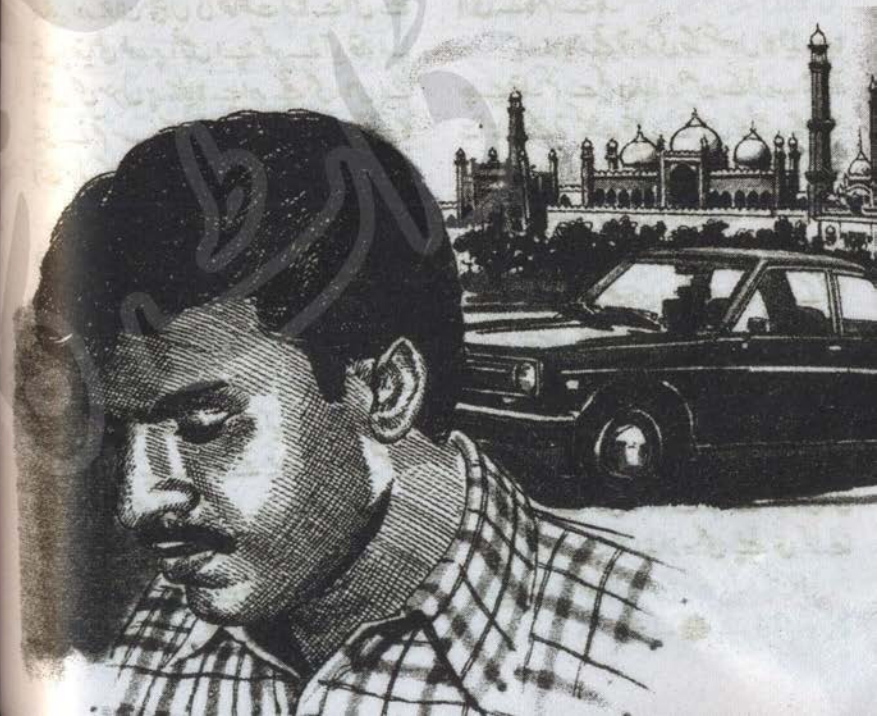

بہروپ دھارتا پھرے گا۔ لوٹ کھسوٹ، مکر و فریب اور منافقت کا بازار گرم کرے گا۔ ساری رات جاگتے اور سوتے میں انہی سوچوں کا زہر بوند بوند اس کے پیمانۂ احساس میں گرتا رہا تھا۔

کچھ عرصے سے اس کے نظریات میں جو ایک انقلابی قسم کی تبدیلی آتی جا رہی تھی اب نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں اردگرد بسنے والے لوگوں، عزیز و اقارب اور احباب کے ناطوں سے ماحول اور معاشرے کے خلاف ایک شدید نفرت کا لاوا پھٹ پڑا تھا جس کی تپش میں وہ ہر لحظہ سلگتا رہتا تھا۔

اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، پراسرار، بے اماں، بے کراں اندھیرا۔ کوئی راستہ نہیں، کوئی منزل نہیں، کوئی آرزو نہیں۔ جیون سونا اور بے رنگ ہو کر رہ گیا تھا جیسے مسرت و رامنگوں کے سارے سوتے خشک ہو گئے ہوں۔

اس رات وہ خاصی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ ساتوں بچے سو چکے تھے اور بیوی کی آنکھوں میں نیند کا خمار امنڈ رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ حسب معمول ایک تیز بدبو اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ کپڑے تبدیل کئے، کھانا کھایا، بیوی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور بتی بجھا کر سونے لیٹ گیا لیکن نیند تو ایسی اُڑی کہ آدھی رات تک نہ آئی۔

گزشتہ شام جب وہ اپنے دوست ہاشم کے دفتر سے بے آبرو ہو کر لوٹا تھا، اس کے اندر ایک آگ سی دہکی ہوئی تھی۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہاشم ایک چھوٹی سی فرم کا منیجر بننے کے بعد اس قدر مغرور اور کم ظرف ہو جائے گا کہ اپنی برتری منوانے کے لئے اس کی غیر معمولی توہین کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ جب وہ ہاشم کے دفتر میں پہنچا تو چپراسی نے بتایا تھا کہ منیجر صاحب اکاؤنٹنٹ صاحب سے بات کر رہے ہیں۔ تب اس نے دوستی کے زعم میں اپنے نام کی چٹ بھیجی تھی لیکن اس کے بعد بھی چپراسی نے اس کو میٹنگ ختم ہونے تک باہر بیٹھ کر انتظار کرنے کی ہدایت کی اور اس نے سوچا تھا اول تو اکاؤنٹنٹ سے بعد میں بھی باتیں ہو سکتی تھیں۔ دوسرے اگر کوئی ایسی بے حد ضروری بات تھی بھی جسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا تب بھی ہاشم کا یہ فرض تھا کہ خود باہر آ کر اس سے کچھ دیر کی مہلت لیتا..... چنانچہ تب اسے محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی اس نے توہین کا سب سے بڑا کڑوا گھونٹ پی لیا ہو..... منافق..... کم ظرف، کمینے..... میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔

پھر ایک ایک کر کے کتنے ہی مسخ شدہ چہرے اس کے روبرو آتے گئے۔ محلے والوں کے چہرے جو طرح طرح سے اسے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتے تھے۔ متعدد بار احتجاج کے باوجود اس کے کمرے کے سامنے مستقل طور پر گھوڑا باندھا جاتا تھا جس کی لید اور پیشاب کی بدبو سے بعض اوقات اسے متلی ہونے لگتی۔ چھت پر اور دروازے کے سامنے گلی میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ چوسی ہوئی ہڈیاں، پھلوں اور ترکاریوں کے چھلکے بکھیرے جاتے تھے..... اس عمل میں ایسے لوگ بھی شامل تھے، بلکہ پیش پیش تھے جو سارے محلے میں پرہیزگار، سیدھے سادے اور شرافت کے پتلے مشہور تھے..... دوستوں کے چہرے جو بے وفا، ریاکار، منافق اور مطلب پرست تھے..... عزیزوں کے چہرے جو عزیز کم اور بیگانے زیادہ تھے جو اپنی دولت کے نشے میں چور تھے اور اس کی ذات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

دُور سے رکشہ گزرنے کی آواز آئی تو اسے اچانک وہ ٹیکسی ڈرائیور یاد آ گیا جس سے اس کا دو دن قبل واسطہ پڑا تھا۔ انارکلی سے واپسی پر وہ بیوی بچوں سمیت اس کی ٹیکسی میں بیٹھا تھا، گھر سے تھوڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دُور اُتر کر جب اس نے میٹر دیکھا تو کھول کر رہ گیا تھا۔ اصل کرایہ سے چند روپے زیادہ بن گئے تھے۔ جب نوبت تلخ کلامی تک پہنچی تو ٹیکسی ڈرائیور بدمعاشی اور غنڈہ گردی پر اُتر آیا۔ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا..... ''جس کا جہاں بس چلتا ہے پتہ مار دیتا ہے، میں نے آخر کون سا نیا کام کیا ہے۔ سیدھی طرح پیسے نکال دے بابو.....'' ٹیکسی ڈرائیور اسے گھورتے ہوئے خاصے کرخت لہجے میں بولا۔

اس نے دیکھا کہ کئی لوگ دُور ہی سے یہ تماشا دیکھتے رہے..... لڑائی جھگڑے سے وہ ویسے بھی ہر ممکن گریز کرتا تھا، ادھر اس وقت بیوی بچے ساتھ تھے، اس لئے غنڈہ گردی سے بچنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ پیسوں کا نقصان برداشت کر لیا جائے۔ سو اس نے دانت پیستے ہوئے مطلوبہ رقم اسے ادا کر دی اور آس پاس کے لوگوں کو گھورتا ہوا اپنی گلی میں مڑ گیا۔ یہاں تو مطلب اور غرض کے بغیر کوئی کسی سے ملتا تک نہیں، نہ رشتہ دار، نہ دوست..... تو پھر یہ لوگ میرا ساتھ کس لئے دیتے، کیوں میری خاطر اس غنڈے ٹیکسی ڈرائیور سے لڑائی مول لینے کا خطرہ لیتے..... اس نے خود ہی لوگوں کی بے اعتنائی اور بے حسی کا تجزیہ کر لیا۔

رات گئے جب اس کی بیوی نے اچانک سوتے میں کروٹ بدلی، اس کی نفرت کے تیروں کا رُخ اس کی طرف ہو گیا، آج نہ جانے کیوں اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں دور دور تک سازشوں کے جال پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں جو بھی چہرہ اس کے سامنے آتا، مشکوک نظر آتا اور اس کے اندر اشتعال کی ایک تیز رو دوڑا دیتا چنانچہ بیوی پر بھی اس کو غصہ آنے لگا جو آئے دن اس کو طعنے دیتی رہتی تھی کہ لوگ کما کما کر گھروں کو سجا رہے ہیں، اچھا پہن رہے ہیں، اچھا کھا رہے ہیں۔ ہر طرح عیش کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ لکیر کا فقیر..... بس تنخواہ پر ہی قناعت کئے جا رہا ہے۔

تم بیوی ہو کر میری جائز کوششوں کا یقین نہیں کرتی..... سمجھتی ہو جیسے میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہی نہیں۔ کوئی جتن نہیں کرتا۔ بس جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح مطلبی ہو، میرے دل کو گھائل کرتی رہتی ہو تو کیا یہ رشتہ بھی اعتماد کے قابل نہیں رہا.....؟ سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو گیا..... اور اسی دوران کسی لمحے اس کی آنکھیں مند گئی تھیں۔

ناشتے کے بعد دوبارہ اپنے بستر پر آن لیٹا۔ رات نیند پوری نہ ہونے کے باعث وہ کچھ سُست سُست سا ہو رہا تھا اور اُداس بھی۔ لیکن اُداس تو وہ اب اکثر رہتا ہی تھا..... خالی خالی..... کھوکھلا سا۔

''آٹا ختم ہو گیا ہے۔'' اچانک بیوی نے اس کی یکسوئی کی ساکن جھیل میں ایک کنکر پھینکا۔

''جی۔'' وہ چونکا۔ بیوی کو یوں دیکھا جیسے اس نے پوری بات سنی ہی نہ ہو۔

''میں نے کہا آٹا لے آیئے راشن کی دکان سے۔ ختم ہو گیا ہے۔''

یہ آٹا نہ جانے اتنی جلدی کیوں ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے ناگواری کے ساتھ سوچا۔ بُرا سا منہ بنا کر اٹھا۔ الماری میں سے راشن کارڈ اور روپے نکالے اور صحن میں کھڑی سائیکل کی طرف جاتے ہوئے بولا ''کپڑا دے دو۔''

''کنستر میں لے آیئے..... باقی جو بچے وہ تھیلے میں بھر لیجئے۔''

''نہیں..... کپڑے میں آسانی رہے گی..... کنستر گرنے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس دن بھی گرتے گرتے بچا تھا۔''

اس کی بیوی نے یونہی ادھر ادھر دیکھا اور میز پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محبت نامہ

ایک نوجوان کا محبت بھرا خط اپنی محبوبہ کے نام۔

ڈیئرسٹ!

میں تمہارے قرب کے لئے وسیع وعریض سمندر پار کرسکتا ہوں۔ میں تمہارے لئے بلند ترین پہاڑ سر کرسکتا ہوں۔ گرم ترین صحرا کو پار کرسکتا ہوں۔ جنگلوں کی خطرناک دلدلوں کو چیر سکتا ہوں۔

اپنی تمام تر محبت کے ساتھ "ڈینس"

نوٹ: اگر بارش نہ ہوئی تو ہفتے کے روز تم سے ملنے آؤں گا۔

☆☆☆

بچھا ہوا رنگین میز پوش اس کے آگے بڑھا دیا۔

"ہفتے بھر کا آٹا اس میں آجائے گا۔ کتنی بار کہا کہ کوئی بڑا تھیلا ہی لے لو۔"

"اس وقت تو اسی میز پوش میں لے آیئے۔ آئندہ انتظام کردوں گی کچھ نہ کچھ۔"

اس نے میز پوش سائیکل کے کیریئر میں پھنسایا اور سائیکل لے کر باہر چلا گیا..... راشن کی دکان سے آٹا خریدنے کے بعد اس نے آٹے کی پوٹلی سائیکل کے کیریئر میں پھنسائی اور سائیکل پر سوار ہوگیا.....

ایک کشادہ گلی سے جب اس کی سائیکل مین روڈ پر چڑھی تو ایک بلند آواز کے تند جھونکے نے اس کے تخیل کے دریچے کو بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا: "بابو جی آٹا گر رہا ہے۔"

اس نے دیکھا، وہ ایک کالا بھجنگ نوجوان تھا جو موٹر رکشہ ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے فوراً سائیکل کی بریک لگائی۔ پیچھے دیکھا تو پوٹلی کی گانٹھ ڈھیلی ہوجانے کے باعث کچھ آٹا سڑک پر گر چکا تھا۔ وہ فوراً سائیکل سے اُتر پڑا اور سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کر کے اس توقع پر گردوپیش پر نظریں دوڑانے لگا کہ کوئی اس کی مدد کرنے آئے گا۔ کیونکہ پوٹلی کیریئر کے سخت اسپرنگ میں بُری طرح پھنسی ہوئی تھی اور سپرنگ اوپر کئے بغیر پوٹلی میں دوبارہ گانٹھ نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی آکر سپرنگ اوپر اٹھا دے تاکہ وہ خود پوٹلی کی ڈھیلی گرہ کو کس کر باندھ دے لیکن مہذب لوگ، اُجلے لوگ اپنے آپ میں مگن اسے دیکھتے ہوئے گزرتے چلے جارہے تھے۔

دفعتاً اس کے عقب سے ایک آواز ابھری "یہ آٹا ہے بیٹے..... کتنی بھوسی ہے اس میں۔"

اس نے مڑ کر دیکھا، یہ ایک بوڑھی دیہاتن تھی۔ صحتمند، جس کے چہرے پر بے انداز معصومیت تھی اور جو اپنی چنگی میں سڑک پر سے اُٹھایا ہوا آٹا مسل مسل کر دیکھ رہی تھی۔

پھر یہ بوڑھی عورت اس کے اور نزدیک آگئی اور بولی "لایئے میں باندھے دیتی ہوں پوٹلیا۔"

اس کے لہجے میں بلا کی مٹھاس تھی اور اس کی شفاف آنکھوں میں مامتا کے ستارے جھلملا رہے تھے۔

اس بار بھی وہ کچھ نہ بول سکا لیکن اس کے جذبات کا سارا تموج اس کی آنکھوں میں امنڈ آیا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے سائیکل کے کیریئر کا سپرنگ اوپر اُٹھایا اور تب بوڑھی عورت نے آٹے کی پوٹلی نیچے اُتاری اور جلدی جلدی اس میں نئی گرہ لگا کر کیریئر پر رکھتے ہوئے بڑے ہی پیار کے ساتھ بولی "گانٹھ ہمیشہ کس کر لگایا کر بیٹے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کا دل ایک انوکھی مسرت سے معمور ہوچکا تھا۔

"شکریہ اماں....." اس نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ بوڑھی عورت کے روبرو اپنا سر جھکا لیا۔

پھر وہ سائیکل پر بیٹھ کر ایک سرشارانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

مصالحہ میں جوانی

یہ بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات کم کرنے کا موثر طریقہ ہے

غذا میں غذائیت کی کمی جوانی میں بڑھاپے کا سبب بن جاتی ہے!

حکیم محمد عثمان

بڑھتی ہوئی عمر ہر شخص کو پریشان کرتی ہے لیکن اس فطری عمل کو روکنا ممکن نہیں کیونکہ بالآخر قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس قدرتی عمل کی رفتار کم کرنے کے لیے قدرت نے ہی ہمیں بعض جڑی بوٹیوں اور مصالحہ جات سے نوازا ہے۔ تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ توازن اور اعتدال ہی وہ دو خصوصیات ہیں جو انسان کو ہر عمر میں صحتمند اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جسمانی ضرورت سے کم کھانا بڑھاپے کو دعوت دینے کے مترادف ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی انسان پر جوانی میں بڑھاپا طاری کر دیتا ہے۔ آج ہماری خوراک اکثر ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے لیکن اس میں غذائیت معدوم ہوتی ہے۔ اس بات سے کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرق نہیں پڑتا کہ آپ سبزی خور ہیں یا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کی غذا میں غذائیت کتنی ہے اور آپ کھانے پینے میں کس حد تک اعتدال پر کاربند رہتے ہیں۔

غذا میں غذائیت پوری کرنے کا بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں قدرتی مصالحہ جات استعمال کئے جائیں۔ ہم یقیناً بہت زیادہ مرچ مصالحوں والی غذا کی بات نہیں کررہے۔ یا ہم پروسیسڈ فوڈ کی بات نہیں کررہے بلکہ ہم ان قدرتی مصالحہ جات اور جڑی بوٹیوں کی بات کررہے ہیں جنہیں با آسانی کھانے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

جڑی بوٹیوں اور مصالحوں میں قدرت نے ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ یہ جسم سے فاسد مادوں کے اخراج کو یقینی بناتے ہیں۔ ان میں اینٹی آکسیڈنٹس کی بھرپور مقدار موجود ہوتی ہے۔ ان میں معدنی اجزاء اور بہت سے وٹامن پائے جاتے ہیں۔ آپ جب بھی اپنے کھانوں میں مصالحہ جات یا جڑی بوٹیاں شامل کرتے ہیں تو آپ اپنی غذا میں غذائیت کی مناسب مقدار کو یقینی بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کھانے کا ہر لقمہ محض پیٹ نہیں بھرتا بلکہ ہماری غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔ کھانوں کے ذائقے خوشبو اور رنگت میں بہتری مفت میں مل جاتی ہے۔

مصالحے اور جڑی بوٹیاں غذائی اجزاء سے بھرپور ہونے کی وجہ سے ہمارے نظام انہضام کو فعال اور متحرک بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ غذا کے ہضم ہونے کے عمل کے فعال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غذائیت توانائی کی صورت استعمال ہو جاتی ہے اور فاضل چربی کی صورت جسم پر نہیں چڑھتی۔ کھانے کے اختتام پر دارچینی والی چائے یا کافی پینے سے غذا کو مکمل طور پر ہضم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے برعکس کولڈ ڈرنکس وغیرہ غذاء اور جیسا کہ ہمارے ہاں عام لیکن غلط تاثر پایا جاتا ہے کہ گوشت کو ہضم کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ اُلٹا یہ کولڈ ڈرنک دو طرح سے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں موجود شکر موٹاپے کا باعث بنتی ہے اور کیفین کی وجہ سے دماغ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بھوک لگی ہوئی ہے حالانکہ درحقیقت بھوک نہیں لگی ہوئی ہوتی بلکہ محض بھوک کا احساس ہوتا ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ کولڈ ڈرنک پینے کی وجہ سے کھانا ہضم ہو گیا ہے یہ صورتحال موٹاپے کو جنم دیتی ہے اور موٹاپا وقت سے پہلے بڑھاپے کا باعث بن جاتا ہے۔

ماہرین غذائیات کی متفقہ رائے ہے کہ اگر کھانے سے قبل کوئی اشتہا انگیز سوپ لیا جاتا ہے تو اس پر چائے کا چوتھائی چمچ موٹی کٹی ہوئی سرخ مرچ چھڑک کر استعمال کرنے سے کیلوریز کی طلب 10 سے 16 فیصد کم ہو جاتی ہے۔

ہمارے کھانوں میں نمک کا استعمال بہت عام اور زیادہ ہے۔ اس سے بچنے کے لیے اگر نمک کی بجائے دیگر مصالحہ جات کا استعمال کیا جائے تو صحت کے حوالے سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھانے میں نمک کی زیادتی جسم میں پانی کے جمع ہونے اور ریح کا باعث بنتی ہے۔ نمک کا استعمال دراصل ایک عادت ہے اور جیسے جیسے ہم نمک استعمال کرتے ہیں ویسے ویسے یہ عادت پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے لیے کم نمک استعمال کرنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ ہم زیادہ نمک کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ کھانے میں نمک کی زیادتی بلڈ پریشر میں اضافے کا سبب بنتی ہے جو ایک خاموش قاتل ہے۔

کھانے میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں اور مصالحہ جات کے طبی خواص ثابت شدہ ہیں۔ سب

سے پہلے ہم دارچینی کی بات کرتے ہیں۔ ماہرین کے خیال میں اگر ذیابیطس کے مریض ہر روز کھانے میں ایک سے دو چائے کے چمچ دارچینی کا سفوف استعمال کرتے ہیں تو 6 ہفتے کے اندر اندر ان کے خون میں شکر کی مقدار اعتدال پر آجاتی ہے کیونکہ دارچینی انسولین کی حساسیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح ذیابیطس کے مریض کا ایلوپیتھک ادویات پر انحصار بہت کم ہو جاتا ہے۔ دارچینی خون میں ٹرائی گلائسرائیڈز (کولیسٹرول کی ایک قسم) کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسولین کا اخراج بہتر ہو جاتا ہے جو خون میں شوگر کی مقدار کو درست رکھنے کے ساتھ ساتھ کولیسٹرول اور دیگر چکنائیوں کو قابل استعمال بنانے کے لیے بھی ضروری ہوتی ہے۔

تلسی کے پتوں کو بطور مصالحہ استعمال کیا جائے تو یہ جسم میں سوزش کے عمل کو روکتے ہیں۔ زیرہ ضعف نظر، دماغ اور یادداشت کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ سرخ مرچ اور دارچینی موٹاپے کو کم کرتی ہیں۔ خشک و سبز دھنیا اور دارچینی ذیابیطس کے علاج میں بہت موثر پائی گئی ہیں۔ لیمن گراس کا قہوہ کھانے کے بعد پینے سے گرانی کی شکایت نہیں رہتی اور مزاج پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے کھانوں میں ہلدی کا استعمال عام ہے۔ ہلدی کی وجہ سے ایک تو سالن کی رنگت بہت خوشنما ہو جاتی ہے۔ کھانے کی غذائیت میں اضافہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہلدی مسلمہ طور پر سرطان کے مرض سے بچاؤ کا باعث بنتی ہے۔ کھانے میں اوریگانو کا استعمال پھپھوندی کی وجہ سے پیدا ہونے والے امراض سے حفاظت فراہم کرتا ہے اور پھپھوندی کے خلاف قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔ لہسن روائی اور تخم کاسنی کا پیسٹ بنا کر سالن میں شامل کرلیا جائے تو یہ دل کے جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے اور دل کے خون کو پمپ کرنے کی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے۔

بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات سب سے زیادہ انسانی جلد پر مرتب ہوتے ہیں۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی چمک دمک اور خوبصورتی سے محروم ہونے لگتی ہے۔ جلد پر اس طرح کے اثرات کو کم کرنے کے لیے کھانے میں تلسی اور جنگلی پودینے کی چٹنی استعمال کرنے سے جلد صاف ستھری، ملائم اور جاذب نظر رہتی ہے۔ ہلدی، تلسی، دارچینی، سرخ مرچ، زعفران اور ادرک بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت میں اضافے کے لیے بہترین تصور کئے جاتے ہیں۔ دھنیا، سرخ مرچ، فلفل شیریں اور کالی مرچ کا استعمال ڈپریشن جیسے نفسیاتی عوارض پر قابو پانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

ہر گزرتا لمحہ عمر میں اضافہ کرتا ہے اور اس عمل کو روکنا کسی طور ممکن نہیں۔ آج کا بچہ کل جوان ہو گا اور پھر بڑھاپے کی راہ لے گا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے انسانی جسم پر پڑنے والے اثرات کی رفتار کم کی جا سکے تو اس کی وجہ سے جوانی اور خوبصورتی کو تادیر قائم رکھا جا سکتا ہے تاہم ہر خوراک کے باوجود اعتدال اور توازن کی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ قرآن حکیم میں سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جس کا مفہوم ہے ''اور ہم نے انسان کو بہترین توازن پر پیدا کیا اور یہ انسان بتدریج اسفل ترین حالت کو پہنچ گیا'' (یعنی اعتدال کو ہاتھ سے گنوا بیٹھا) گویا۔ خداوند عالم نے خود طے کر دیا کہ توازن اور اعتدال ہی انسان کو اسفل حالت تک پہنچانے سے روک سکتے ہیں۔ متوازن انداز زندگی کی وجہ سے زندگی کا ہر دور خوبصورت ہو جاتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

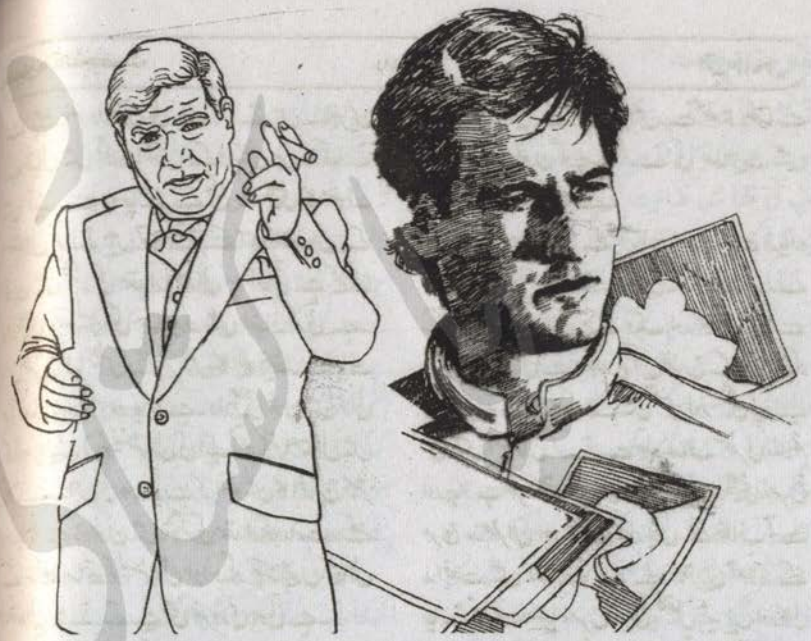

افسرِ اعلیٰ

عرفان جاوید

چونکہ شاہانی صاحب طبعاً عاجز واقع ہوئے تھے اس لئے بہت جلد تکبر کے احساس سے چھٹکارا پا لیتے۔ بس کبھی کبھار صفیہ بیگم کو چھیڑ دیتے ''ارے بھئی ہم تو ٹھہرے ضلع کے مالک، تو کیوں نہ اپنی رعایا میں سے کوئی حسین نازنین حرم میں داخل کر لیں۔ تمہاری خوب خدمت کرے گی۔'' پھر دیر تک ہنستے رہتے۔

ایک افسرِ خاص کی کہانی جو خوشامد کو سچائی تصور کرتا تھا

شاہانی صاحب وفورِ جذبات میں بولتے چلے گئے۔ ''صفیہ! دیکھو ابھی مجھے آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا، سامان سے پیکنگ بھی نہیں کھلی اور میرا سٹاف ابھی سے ہی مجھے کہتا ہے سر آپ جیسا افسر ہم نے پہلے نہیں دیکھا اور صرف میرا سٹاف ہی نہیں کہتا بلکہ شہر سے جو بھی ملنے آتا ہے اسی طرح سے تعریف میں لتھڑا ہوتا ہے۔''

صفیہ بیگم شاہانی صاحب کی نکٹائی کی گرہ کھولتے کھولتے ہنس پڑیں۔ ''جانے بھی دیں۔ یہ سب چاپلوسیاں چڑھتے سورج کو سلام ہیں۔ اس سے پہلے جب آپ کھڈے لائن لگے ہوئے تھے تو کتنے لوگ آپ کو ملنے آتے تھے؟''

شاہانی صاحب جھنجھلا گئے۔ ''تم سب بیویاں ایک سی ہوتی ہو۔ شوہر کی کوئی تعریف تو برداشت ہی نہیں ہوتی۔ جذبی میاں نے تو اس روز کیا خوب کہا کہ حضور جان کی امان پاؤں تو ایک گستاخی سرزد کرنے کی اجازت چاہوں گا۔'' شاہانی صاحب نے آواز بدلتے ہوئے اپنے سیکرٹری کے انداز کی نقل اُتاری۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے ''اس پر میں شرمندہ ہو گیا۔ ایک تو جذبی میاں اتنے وفادار اور تابعدار ہیں کہ انسان اپنے آپ کو خود ہی میں بہت بڑا بڑا محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''کیا بکا جذبی نے؟'' صفیہ بیگم پھنکاریں۔

''بے چارے نے کیا کہنا تھا بس اتنا کہا عالیجاہ! میرا تمام عمر کا تجربہ ایک بات کی گواہی دیتا ہے اور وہ یہ کہ تمام بیویاں اپنے شوہروں کو کہتی ہیں کہ یہ میں ہی تھی جو اب تک آپ کے ساتھ گزارا کر گئی۔ کسی اور عورت میں نہ تو اتنی ہمت ہوتی اور نہ ہی اتنی برداشت کہ آپ کے ساتھ گزارا کرتی۔ پھر بات کر کے شوہر کے سر پر آن بیٹھتی ہیں۔'' شاہانی صاحب ہنس پڑے۔

صفیہ بیگم تیوری چڑھاتے ہوئے بولیں ''جذبی نے یہ تو بکنا ہی تھا۔ بے چارے کی پہلی بیوی ایک نمبردار کے ساتھ جو بھاگ گئی تھی۔ دوسری نے ویسے ہی خلع لے لیا اور تیسری دو سال سے ایسی اپنے میکے گئی ہے کہ آج تک واپس نہیں لوٹی۔''

شاہانی صاحب لباس بدلتے بدلتے رُک گئے۔ ''تمہیں ان سب تفصیلات کا کیسے پتہ ہے؟''

''مجھے اس مردود کے اور بھی کارنامے پتہ ہیں۔ بھنگن نے تو نہ صرف جذبی کے کارنامے سنائے ہیں بلکہ اس مسینے مالی نے جو شکل سے اتنا مسکین لگتا ہے اور ہر وقت سر جھکا کر باڑھ کو تراشنے میں لگا رہتا ہے، اس کے کرتوتوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہائے اللہ یہ مرد اندر سے کتنے پکے ہوتے ہیں۔'' صفیہ بیگم بناوٹی غصے سے بولیں۔ پھر میاں کے تیور بدلتے دیکھ کر کہنے لگیں ''سوائے آپ کے۔''

شاہانی صاحب اس پر مصنوعی خفگی سے بولے ''اب بناؤ مت اور جا کر کھانا لگواؤ۔ آج کا سارا دن تو اپنی تعریفیں سننے میں کٹ گیا۔''

.....

باہر بھنگن اور مالی کانا پھوسی میں مصروف تھے۔

''بشیراں! صاحب کا اتنا سامان آیا ہے، اتنا آیا ہے کہ لگتا ہے انہوں نے اس سے پچھلی بدلیوں میں اچھا مال پانی بنایا ہے۔'' یک چشم مالی گویا دانائی کی کوئی بات کہتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

''نئیں نئیں۔ بیگم صاحب نے مجھے خود بتایا ہے کہ پیچھے صاحب کے مربعے ہیں۔ ایک تو ٹوٹ ہر بات میں کوئی نہ کوئی غلط چیز نکال لیتا ہے۔'' بشیراں نے صفائی پیش کی۔

''تُو کتنی بھولی ہے بشیراں۔ یہ مربے شربے سب جھوٹ باتیں ہوتی ہیں۔ بھلا رب کو سب مربعے صاحب لوگوں کو ہی دینے تھے اور ہمیں کھو کھوتی ملنا تھی۔''

''او جیرے، یہ کھوتی سے تیرا مطبل کیا ہے۔'' بشیراں غصے سے بولی۔

''ایک تو تُو ہر بات اپنی طرف لے جاتی ہے۔ تم اَن پڑھ لوگوں میں عقل مت اتنی کم ہوتی ہے اور پھر تُو میری ہوئی ہی کب ہے۔'' دو جماعت پاس جیرا بشیراں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

بشیراں شرما گئی۔ ''اب کے میرے اوپر لائن ماری نا، تو تیرے بابے کو بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر بشیراں پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

جیرا واہیات انداز میں زیرِلب مسکراتا رہا۔

.....

اتنے میں اندر کوٹھی میں کھانا لگ چکا تھا۔ شاہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب تازہ دم ہو کر میز پر آ بیٹھے تھے اور صفیہ بیگم سے محوِ گفتگو تھے۔ ''صفیہ! ضلع پہلی مرتبہ ملا ہے۔ اس سے پہلے ساری زندگی بس دفتروں میں ہی گزار دی۔ انسان کے لیے تو یہ افسری بھی ایک امتحان ہے۔ اگر سر کو چڑھ جائے تو نشے کی لت ہے اور اگر نہ چڑھے..... پر کیسے نہ چڑھے۔ جب سب شہر افسر کے اشاروں کا منتظر ہوتا ہے، ہر دوسرا صاحب حیثیت آدمی آپ کو اپنے گھر کھانے پر بلانے میں عزت محسوس کرتا ہے، تمام سرکاری محکموں کے سربراہ ضلع افسر کے پاس آتے ہیں تو اپنی اہمیت کا احساس نہ چاہتے ہوئے بھی ہو ہی جاتا ہے۔''

''مگر وہ پہلے والی بات تو نہیں۔'' صفیہ بیگم نے اعتراض کیا۔

''ہاں وہ پہلے والی بات تو نہیں جب تمام اختیارات افسرِ اعلیٰ کے پاس ہوتے تھے بلکہ پولیس والے بھی اسی کو جوابدہ تھے۔ وہ والے کروفر تو نہ سہی مگر پھر بھی دوسری نوکریوں سے بہت بہتر ہے۔'' شاہانی صاحب نے توجیہہ پیش کی۔

اس پر صفیہ بیگم بولیں ''مگر یہ جو سیاستدان ہیں، مجھے تو زہر لگتے ہیں یہ۔''

''دیکھو صفیہ! نشیب و فراز تو نوکری کا حصہ ہیں۔ یہ لوگ کون سے مستقل ہیں، یہ آج ہیں کل نہ ہوں گے، پھر حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی پالیسیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ آخر سرکار کا حکم سرکاری افسر کے سہارے کے بغیر اس پسماندہ معاشرے میں کیسے کارگر ہو سکتا ہے۔'' شاہانی صاحب بات کی گہرائی میں گم ہو گئے۔

''چیف صاحب کی بیوی اس روز شام کی چائے پر کہہ تو رہی تھیں کہ پرانے نظام کو اس حد تک بگاڑ دیا گیا ہے کہ یہ ناقابلِ اصلاح ہو گیا ہے۔ اس کی مستقبل میں جگنی بھی پلاسٹک سرجری کر لی جائے یہ واپس اپنی تازگی دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔'' صفیہ بیگم افسردگی سے بولیں۔

''کہتی تو وہ سچ ہیں مگر جو ہاتھ میں ہے کم از کم اس کی تو قدر کرنا چاہیے۔ بے وجہ پریشانیاں تو ویسے بھی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔'' شاہانی صاحب نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

جذبی میاں کہنے کو تو شاہانی صاحب کے سیکرٹری تھے مگر تھے گرگ بارہ دیدہ۔ اگر اکبر کے دور میں پیدا ہوتے تو یقیناً نورتنوں میں جگہ پاتے۔ اپنے افسر کے سامنے تو وہ بچھ بچھ جاتے۔ اتنے فرشی سلام کرتے کہ بعض اوقات ان کی حرکات و سکنات مضحکہ خیز ہوتیں۔ شاعری کا شوق رکھتے تھے اور بے وزن اشعار بھی کہتے تھے مگر ثقیل تراکیب و الفاظ کا زیادہ تر استعمال افسرانِ بالا کو رجھانے میں ہوتا تھا ''حضور کی شان کے کیا کہنے۔'' وہ دہرے ہوئے جاتے۔ ''حاکمِ ضلع کے حکم سے انکار کس کافر کو ہے۔ آپ جناب تو ٹھہرے ضلع کے مالک۔'' وہ کورنش بجالاتے۔

یہ ضلع کے مالک کی ترکیب کا استعمال اس کثرت سے ہوتا کہ شاہانی صاحب کبھی کبھار اپنے آپ کو واقعی ضلع کا مالک سمجھ بیٹھتے اور خلقت کو رعایا۔ اس تمام تخیلاتی نظام میں جذبی میاں بھی ایک خلعت پہنے منصب دار پر نظر آتے۔

مگر چونکہ شاہانی صاحب طبعاً عاجز واقع ہوئے تھے اس لئے بہت جلد تکبر کے احساس سے چھٹکارا پا لیتے۔ بس کبھی کبھار صفیہ بیگم کو چھیڑ دیتے ''ارے بھئی ہم تو ٹھہرے ضلع کے مالک، تو کیوں نہ اپنی رعایا میں سے کوئی حسین نازنین حرم میں داخل کر لیں۔ تمہاری خوب خدمت کرے گی۔'' پھر دیر تک ہنستے رہتے۔

ایسے میں صفیہ بیگم جل بھن کر کباب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جاتیں۔

شاہانی صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو قابل ستائش تھا۔ وہ واقعی دل سے ضلع کی ترقی کے خواہاں تھے۔ گرانٹ تو مقرر کر دی گئی تھی۔ ترقیاتی منصوبے ایک حد سے بڑھ کر نہیں ہو سکتے تھے مگر انتظامی امور میں اصلاح کی بہت گنجائش تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے کام عدم توجہی کے باعث تعطل میں پڑے تھے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں متنازعہ امور کے باعث پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پائی تھیں۔ شاہانی صاحب نے رات گئے تک میٹنگیں بلانی شروع کر دیں۔ اداروں کے باہمی تعاون کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے کام کا آغاز کیا۔ مختلف گروہوں میں رنجشیں ختم کرا کے زیر التواء امور کو نمٹانا شروع کیا۔ ٹھیکیداروں کے مسائل کی جانب توجہ کی تاکہ ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد زیادہ تندہی سے ہو سکے۔ ان اقدامات سے جہاں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا وہیں جذبی میاں دوہرے ہو ہو کر گویا کمر درد کے مستقل مریض بن گئے۔

اسی دوران شاہانی صاحب کو ایک ذاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ بچے دادی کے پاس ہی صوبائی دارالحکومت میں بغرض تعلیم مقیم تھے۔ ان دنوں وہ بیٹے کے پاس آئی ہوئی تھیں کہ دورۂ دل برداشت نہ کر پائیں۔ والدہ کی وفات پر پورا شہر تعزیت کے لیے امڈ آیا۔ چھوٹا شہر تھا۔ خبر بھی جلد پھیل گئی تھی۔ جذبی میاں کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ ہچکیاں لے کر ان کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

جنازے میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ شدت غم سے نڈھال شاہانی صاحب کے دل میں ایک چور سا شگوفہ مسرت بھی کھل اُٹھا تھا۔ کتنے لوگ ان کے غم میں شریک ہونے اتنی دور سے صوبائی دارالحکومت آئے تھے۔

دفناتے وقت جذبی میاں خود قبر میں اُترے۔ قبر میں لیٹ کر اس کی لمبائی چوڑائی کا حساب لگایا۔ پھر روتے ہوئے اس احتیاط سے جسد خاکی کو قبر میں اُتارا کہ شاہانی صاحب کے دل میں ان کا مقام کئی درجے بڑھ گیا۔ 'وقت سب سے بڑا مرہم ہے، بہت سے زخموں کو بھر دیتا ہے اور پھر دنیا کے لیے جینا بھی تو پڑتا ہے۔' یہ سوچ کر شاہانی صاحب بجھے دل کے ساتھ ضلع میں لوٹ آئے اور روزانہ مصروفیات میں اپنے آپ کو مگن کر لیا۔

لمحے دنوں میں اور دن ہفتوں میں بدلنے لگے۔ ضلع کا کام معمول کے مطابق چلتا رہا۔ شاہانی صاحب نے ضلعی عملے کے لیے چند منصوبوں پر عملی کام شروع کرایا۔ ان میں سرفہرست ان کی رہائشی کالونی کا منصوبہ تھا جو مدتوں سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ منصوبے کے اجراء کی دیر تھی کہ شاہانی صاحب کو گویا پھولوں میں تول دیا گیا۔ عملے کا ہر رکن ان کے گن گانے لگا۔ ان تک ستائش کی خبریں نمک مرچ لگا کر پیش کی جاتیں۔ خوشی سے ان کا دل پھول کر کپا ہو جاتا۔ ''دیکھو بیگم! میں ایک تاریخ رقم کر رہا ہوں۔ ہاؤسنگ پروگرام کی افتتاحی تختی پر میرا نام لکھا گیا ہے اور رسم آغاز بھی مجھ سے کروائی گئی ہے۔ چلو کل کو کہیں اور تبادلہ ہو جاتا ہے تو بھی ایک نشانی تو رہے گی اور پھر نشانی سنگ مرمر کا پتھر نہیں بلکہ وہ ہے جو عملے کے ہر فرد بلکہ ضلع بھر کے لوگوں کے دلوں پر نقش ہے۔'' شاہانی صاحب اپنی عظمت کے احساس سے مخمور جذبے میں سرگوشی کرتے۔

وہ سمجھاتیں ''میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن ایسی کتنی ہی تختیاں پہلے بھی لگیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ آپ نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کیا۔ سرکاری ملازم ہیں، ذمہ داری دی گئی تھی، احسن طریقے سے کر رہے ہیں۔ اور بس۔''

وہ جل جاتے۔ ''ایک تو تم سے میری تعریف برداشت نہیں ہوتی۔ ارے بھئی یہ خوشامد نہیں ہے۔ ایک شخص نہیں کہتا، دو تین کی بات بھی نہیں، ہر زبان کہتی ہے۔ اب سب مل کر جھوٹ بولنے سے تو رہے۔ اور تم اپنی یہ مایوسی کی باتیں دل ہی میں رکھا کرو۔''

ایک مرتبہ وہ بہت مسرور تھے۔ رات کو مطالعہ کے بعد لیمپ کی روشنی گل کرتے ہوئے بیگم سے کہنے لگے ''آج ایم این اے آیا تھا۔ بہت مضبوط آدمی ہے۔ ہر کابینہ میں اس کے گروپ کا کوئی ایک وزیر ضرور ہوتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کسی طرح اپنا ڈومیسائل اور ووٹ یہیں کا بنوا لوں۔ کل کو الیکشن لڑنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آخر کو علاقے کے لوگ مجھے اس طرح یہاں سے جانے تو نہیں دیں گے۔ پھر سرکاری نوکری بھی کوئی نوکری ہے۔ وہی لگی بندھی زندگی۔ میں تو سوچتا ہوں کہ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر یہیں سے الیکشن لڑ لوں۔ آخر مقبولیت اور عوامی پسندیدگی کو درست وقت پر کیش کرانا ہی تو اچھے سیاستدان کی خوبی ہوتی ہے۔''

صفیہ بیگم کے مدھم خراٹوں کی آواز میں ان کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔

.....

بہت دنوں کی بات ھے

بہت دنوں کی بات ہے
فضا کو یاد بھی نہیں
یہ بات آج کی نہیں
بہت دنوں کی بات ہے
ہوا بھی خوشگوار تھی
فضا بھی پر بہار تھی
نجانے کیوں مچل پڑا
میں اپنے گھر سے چل پڑا
کسی نے مجھ کو روک کر
بڑی ادا سے ٹوک کر
کہا تھا لوٹ آیئے
میری قسم نہ جایئے نہ جایئے
میں پھر شہر سے آ گیا
خیال تھا کہ پا گیا
وہ جو مجھ سے دور تھی
مگر میری ضرور تھی
پھر اک حسین شام کو
میں چل پڑا اسلام کو
گلی کا رنگ دیکھ کر
نئی ترنگ دیکھ کر
مجھے بڑی خوشی ہوئی
میں کچھ اسی خوشی میں تھا
کسی نے جھانک کر کہا
پرائے گھر سے جایئے
میری قسم نہ آیئے، نہ آیئے
وہیں حسین شام ہے
بہار جس کا نام ہے
چلا ہوں گھر کو چھوڑ کر
نجانے جاؤں گا کدھر
کوئی نہیں جو روک کر
کوئی نہیں جو ٹوک کر
کہے کہ لوٹ آیئے
میری قسم نہ جایئے، نہ جایئے

بشیر بدر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک گرم رات تھی۔ پشاور خان جسے اس کے یار دوست ذومعنی انداز میں دل پشوری خان بھی کہتے تھے، نے ٹرک کو ڈرائیور ہوٹل پر کھڑا کیا اور تھکاوٹ دُور کرنے کے ارادے سے اس سے اُتر آیا۔ وہ صبح سے پہاڑی علاقے سے پتھر لے کر چلا تھا۔ پتھر بھاری تھا، اس لیے ٹرک پر بوجھ بھی زیادہ تھا۔ رستے کی سڑک بھی ہموار نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ سڑک پر موڑ بھی بہت تھے۔ وہ ٹرک کو چیونٹی کی رفتار سے چلاتا لایا تھا۔ اس اعصاب شکن سفر سے اس کا دماغ چیخ گیا تھا۔ اب اسے آرام کی ضرورت تھی اور آرام کا انتظام اس دلبر ہزارہ ہوٹل سے زیادہ بہتر کہیں اور نہ تھا۔

چائے کا گرم گرم کڑک دار کپ پینے کے بعد پشاور خان نے اپنے جانے پہچانے لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آرام کا مکمل ''انتظام'' اس کی جیب میں تھا۔ انتظام کو جلا اور ریزہ ریزہ کر کے تمباکو کے ساتھ پشاور خان نے خالی کی ہوئی سگریٹ میں بھر لیا۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے نعرۂ کوچ بلند کیا اور چھلانگ لگا کر ٹرک پر سوار ہو گیا۔

ایک گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ٹرک سٹارٹ ہوا اور رینگنے لگا۔

.....

شاہانی صاحب کی صبح ضروری میٹنگ تھی اور انہیں ہر حال میں ضلع واپس پہنچنا تھا لیکن گاڑی کا ٹائر بھی رات کے اسی لمحے پنکچر ہونا تھا۔ ڈرائیور ٹائر بدل رہا تھا اور وہ بے چینی میں سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گاڑی سے کافی دُور نکل گئے۔ انہیں کسی ان دیکھے خطرے کا سا احساس ہوا تو وہ تیزی سے واپس مڑے، پھسلے اور ہلکی گڑگڑاہٹ سے ڈھلوان پر پھسلتا ٹرک ان کے اوپر سے گزر گیا۔ ٹرک کے اندر گانے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور لہر میں تھا۔ یکدم اس نے گھبرا کر ساتھ میں دیکھا۔ کلینر گہری نیند میں تھا۔ ڈرائیور نے خوف کے زیر احساس ایکسیلیٹر پر دباؤ اور بھی بڑھا دیا۔

جب تک شاہانی صاحب کی لاش علاقائی ہسپتال پہنچی تب تک سب ڈاکٹر چھٹی کر چکے تھے۔ ویسے بھی جب وہاں زندوں کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا تو لاش کا کوئی کیا کرتا۔

اگلی صبح ضلع بھر میں یہ اطلاع بہت دُکھ سے سُنی گئی۔ اخبار میں ایک بکس میں یہ خبر شائع کی گئی۔ صفیہ بیگم کو بھی پچھاڑیں کھاتے کھاتے صبر آ ہی گیا۔ قریبی احباب سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ایک روز کے وقفے سے صوبائی دارالحکومت میں والدہ کے پہلو میں دفنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکے۔ اسی دوران نہ صرف نئے ضلعی افسر کی تعیناتی کا نوٹیفکیشن جاری ہو گیا بلکہ اس نے فوری جوائن کرنے کا عندیہ بھی عملے کو دے دیا۔

ادھر جب مٹھی بھر افرادِ میت کو لے کر جنازہ گاہ پہنچے تو وہاں درجن دو درجن افراد منتظر تھے۔ تھوڑی دیر انتظار کیا گیا۔ پھر صفیں باندھ لی گئیں۔

اور ادھر جذبی میاں عملے کو ہدایات دے رہے تھے۔ ''دیکھنا بھائی۔ وہ تختی تو فوراً اُتروا دو۔ ابھی تو بنیادوں کی کھدائی بھی شروع نہیں ہوئی۔ پھر سُنا ہے کہ نئے صاحب طبیعت کے بہت تیز ہیں۔ کہیں بُرا نہ مان جائیں۔ مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے مگر تھے بہت خوشامد پسند اور ہاں دفتر کے باہر وہ استقبالی بینر لگوانا نہ بھولنا۔''

اور عمائدین شہر نئے افسر کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

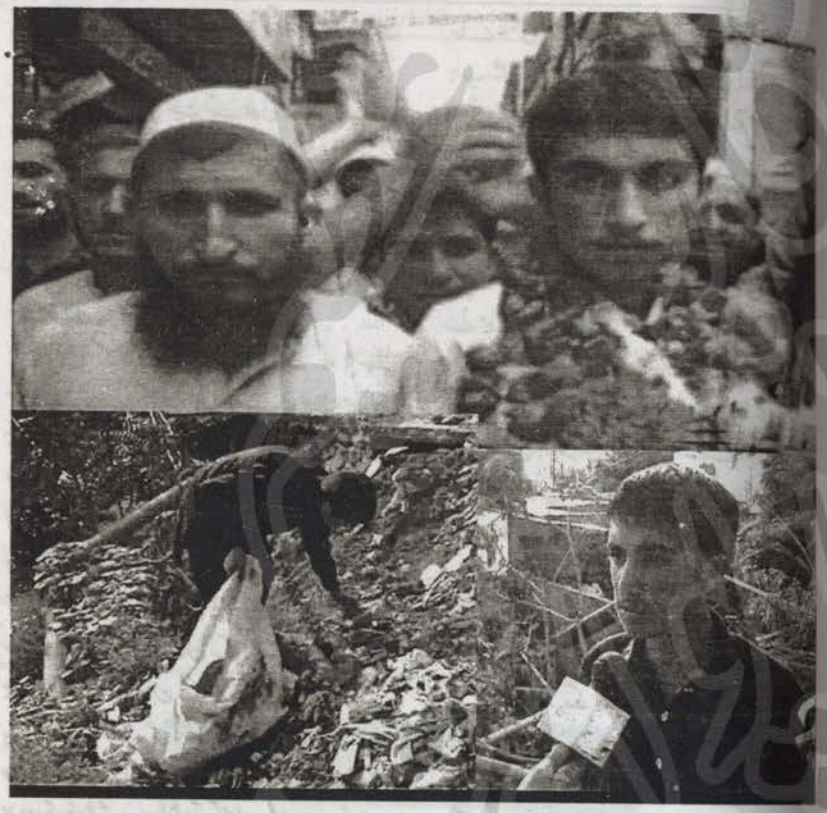

زاہد آصف سلطان

قیانوس خان

کچرا چننے والا نوجوان جو آزاد کشمیر بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر گیا

''علم'' کو نبیوں کی میراث کہا جاتا ہے اسی لیے مسلمانوں کے لیے یہ اولین فرائض میں سے اہم ترین فرض ہے۔ جدید معاشرے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جدید تقاضوں کے مطابق سہولتوں اور آسائشوں سے مزین ماحول کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کا جذبہ اور اس جذبے میں خلوص ہی تعلیمی عمل کی جان ہے۔ آپ بچے کو لاکھ سہولیات دے دیں، جدید ترین سکول میں داخل کرا دیں لیکن آپ جب تک اس کے دل اور دماغ میں حصولِ علم کے جذبے کو اُبھارتے نہیں آپ کا بچہ تعلیمی مدارج سر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا جذبہ اور ساری کوشش خداداد ہوا کرتی ہے۔ انہیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ پیٹ بھرا ہے یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خالی، سکول میں چارٹ، کمپیوٹر اور دیگر جدید سہولیات میسر ہیں یا نہیں، وہ علم کی دولت سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور چونکہ ان کی نیت نیک ہوتی ہے اس لیے وہ آسمانِ علم پر ایک درخشاں ستارے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو اپنی روشنی سے دوسروں کو بھی راستہ دکھاتا ہے اور منزل کے تعین میں سنگ میل بن جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک ستارہ قیانوس خان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

کوٹلی آزاد کشمیر میں رہنے والے 14 سالہ قیانوس خان نے آزاد کشمیر انٹرمیڈیٹ بورڈ، میرپور سے (آرٹس گروپ) میں آزاد کشمیر بھر میں دوسری اور ضلع کوٹلی میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پاکستان اور آزاد کشمیر بھر کے عوام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نوجوان کے پوزیشن لینے پر لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا اور اس کی وجہ قیانوس خان کے حالات ہیں۔ قیانوس خان کے والد معلم خان اپنے بڑے بھائی نوشاد خان کے ہمراہ تقریباً 20 سال قبل پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کے شہر پشاور کے علاقے شاہین آباد نمبر 2 مسلم ٹاؤن سے محنت مزدوری کی غرض سے کوٹلی آ گئے اور یہاں پر ردی اور سکریپ کا کام شروع کر دیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات بھی تبدیل ہوتے رہے۔ معلم خان کی سکریپ کی دکان (کباڑ خانہ) ہے، وہ اپنے مالی حالات تو مستحکم نہ کر سکا مگر اس نے اپنے بچوں کو عزت کی روٹی ضرور فراہم کی۔ یہاں تک کہ معلم خان کی شادی ہوگئی اور وہ اپنی اہلیہ کو بھی کوٹلی لے آیا۔ معلم خان کے 9 بچے ہیں، جن میں قیانوس خان دوسرے نمبر پر ہے۔ قیانوس خان کی پیدائش بھی کوٹلی میں ہوئی۔ قیانوس خان نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا، وہ کوٹلی شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر ردی اکٹھی کرتا اور اپنے کباڑ خانے کو بھی بھرپور وقت دیتا۔ قیانوس خان نے بتایا، جب میں بچپن میں شہر کی گلیوں میں روزی روٹی کی تلاش میں گھوم پھر رہا ہوتا تو صبح سویرے حصولِ علم کی غرض سے اپنے ننھے اور کمزور کندھوں پر بیگ لگائے سکولوں کی جانب جاتے بچوں کو دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ میں بھی علم حاصل کروں۔ ایک دن میں نے اپنے والد سے اپنے دل کی خواہش بیان کی تو انہوں نے میرا شوق دیکھ کر نامساعد حالات میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ گھر کے قریب ہی ایک پرائیویٹ سکول (آئیڈیل پبلک سکول) میں داخلہ بھی کروا دیا۔ تعلیم کے شوق کی وجہ سے میں جلد ہی سکول کے اچھے طلباء میں شامل ہوگیا اور اساتذہ کی نظروں میں بھی آ گیا جس کا یہ فائدہ ہوا کہ اساتذہ نے خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔

قیانوس خان نے کہا، میں سکول داخل ہونے اور علم حاصل کرنے پر بہت خوش تھا مگر یہ بھی احساس تھا کہ میرے والد کے کندھوں پر بہت بوجھ ہے، یہی احساس مجھے سکول سے چھٹی کے بعد والد کا ہاتھ بٹانے کی طرف راغب کرتا اور میں جتنی محنت تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتا، اس سے کہیں زیادہ محنت کر کے شہر بھر میں گھوم کر ردی اکٹھی کرتا اور اپنی دکان کو بھی وقت اور توجہ دیتا۔

قیانوس خان کا کہنا تھا کہ وقت گزرتا گیا اور میں مڈل کلاس تک پہنچ گیا مگر روز بروز بڑھتی مہنگائی نے میرے سر پر خوف کی تلوار لٹکائے رکھی کہ کب والد صاحب تعلیم کا خرچ برداشت نہ کر سکنے کا کہہ کر سکول سے پکی چھٹی کا اعلان کر دیں گے مگر میرے والد نے میرا بھرپور ساتھ دیا اس لیے میں نے جو پوزیشن لی ہے اس سے ملنے والی عزت اور وقار کا سب سے زیادہ کریڈٹ والد محترم کو دیتا ہوں۔ قیانوس خان نے کہا کہ میرے والد کے بعد میری

کامیابی کا سارا کریڈٹ میرے اساتذہ کو جاتا ہے۔ مڈل تک تعلیم میں نے آئیڈیل پبلک سکول دھڑا ندی سے حاصل کی، وہاں پر سکول کے پرنسپل عبدالرحمن چوہدری نے مجھ پر بھرپور توجہ دی اور جب کرایہ کا مکان تبدیل کرنے کے باعث مجھے وہ سکول چھوڑنا پڑا تو میری خوش قسمتی تھی کہ جموں کشمیر ہائر سیکنڈری سکول ڈھنگروٹ کے پرنسپل نے میرے حالات اور تعلیم کا شوق دیکھتے ہوئے مجھے خصوصی توجہ دی۔ سکول ٹائم کے بعد بھی وقت دینے کے ساتھ ساتھ رات کو ادارہ ہذا کے ہاسٹل میں بلا کر اپنے دو تین قیمتی گھنٹے میری تعلیم کے لیے وقف کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عمل ایسا تھا جس نے میرے ٹیلنٹ میں نکھار پیدا کیا۔ مجھے آج اللہ کے کرم سے جو مقام حاصل ہے وہ والدین کی دعا، سرپرستی اور اساتذہ کی محنت کے بغیر کبھی حاصل نہ ہو پاتا۔ میں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہوں کہ مجھے دوسرے بچوں کی نسبت اَن پڑھ ہونے کے باوجود اپنے والدین کی مثبت سوچ اور محنتی اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی اور یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسرے بچوں کی نسبت بہتر اعزاز سے نوازا۔

قیانوس خان کا یہ بھی کہنا تھا کہ میں آزاد کشمیر میں تعلیم کے معیار سے مطمئن ہوں اور یہاں سے ہی مزید تعلیم حاصل کرنے کا خواہاں ہوں۔ مجھے اپنے ٹیلنٹ اور اساتذہ کی محنت پر پورا یقین تھا کہ میں بورڈ میں پوزیشن حاصل کر سکتا ہوں مگر ایک خدشہ بھی ساتھ تھا کہ رشوت اور سفارش کے اس دور میں میرے جیسے غریب بچے کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جائے تو وہی کافی ہوتا ہے، پوزیشن کا حصول تو دُور کی بات ہے مگر آزاد کشمیر انٹرمیڈیٹ بورڈ میرپور نے میرے اس خدشہ کو غلط ثابت کیا اور

گوادر میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

البدر بک سینٹر

ایئرپورٹ روڈ گوادر سے رابطہ کریں۔ GAWADAR.Ph.211043/2110625

Email:sayyaradigest@gmail.com

پتہ لاہور آفس: 240، مین مارکیٹ ریواز گارڈن ۔ ☎ : 042-7245412

ان کا یہ عمل ادارہ کی نیک نامی اور میرٹ کی دلیل بن گیا۔ میں آج فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آزاد کشمیر انٹرمیڈیٹ بورڈ میرپور جیسے ادارے سے میٹرک کی سند لی۔ میری خواہش ہے کہ میں I.COM کروں اور پھر اس کے بعد جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم حاصل کروں۔ تعلیم میرا شوق ہے اور اب تو بورڈ میں دوسری پوزیشن کے حصول کے بعد علم کی پیاس پہلے سے بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔ حکومت کو چاہیے کہ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دے تاکہ میری طرح کے غریب طلباء و طالبات بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ملک و قوم کی خدمت کر سکیں اور جن مشکلات کا سامنا مجھے کرنا پڑا دوسرے طالب علموں کا نہ کرنا پڑے۔ قیانوس خان کا کہنا تھا کہ تعلیم نے مجھے جو عزت دی ہے وہ میں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے ٹیچر بنوں گا اور اپنے جیسے علم کے شوقین اور غریب بچوں کو مفت تعلیم دوں گا۔

قیانوس خان کا کہنا تھا کہ تعلیم کے حوالے سے میرے بہت سے خواب ہیں جو اس وقت پورے ہوں گے جب میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں گا۔ اپنی تعلیم کے سفر کی تکمیل کے لیے پرامید ہوں مگر اب اپنے والد پر مزید بوجھ بننا میرے لیے انتہائی مشکل ہوگا۔ میں کام کرنے کو عظمت سمجھتا ہوں، اس لیے محنت مزدوری سے کبھی شرم محسوس نہیں کی اور نہ آئندہ محسوس کروں گا۔ میں اب بھی اپنے والد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں مگر اب حصولِ تعلیم کی لگن کے باعث درکار وقت شاید میرے اس کام میں رکاوٹ بن جائے اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ میرے والد کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ قیانوس نے حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر سے اپیل کی ہے کہ تعلیم کی راہ میں حائل مالی معاملات کو دردمندی سے دیکھا جائے اور مالی مدد کی جائے تاکہ میں اپنے والد پر مزید بوجھ بنے بغیر اپنا خواب، اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔

قیانوس خان کے والد معلم خان سے جب ان کے بیٹے کی کامیابی پر تاثرات جاننا چاہے تو ان کا کہنا تھا کہ ان خوشی کے لمحات کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے، ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بیٹے قیانوس نے میری محنت کا پھل مجھے دے دیا ہے اور اللہ پاک کی مہربانی سے میری محنت کا مقصد بھی پورا ہو گیا ہے۔ میں اور میری اہلیہ سمیت میری فیملی کے تمام افراد اَن پڑھ ہیں۔ قیانوس سے قبل میرے بڑے بھائی نوشاد خان کے بیٹے نے میٹرک کیا۔ وہ ہماری فیملی کا پہلا پڑھا لکھا نوجوان تھا اور اب قیانوس نے تو ہماری فیملی کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں ان کا کہنا تھا، میں چونکہ خود اَن پڑھ تھا، اس لیے پڑھائی کی قدر تھی اور پھر قیانوس کا شوق دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جتنی بھی محنت کرنا پڑے کروں گا، مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کروں گا مگر اپنے بیٹے کو تعلیم ضرور دلاؤں گا اور اس کے خواب میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دوں گا۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ قیانوس مزید تعلیم حاصل کرے، اس کے لیے میں پہلے سے زیادہ محنت کروں گا مگر کتنا ہی اچھا ہو کہ حکومت پاکستان یا حکومت آزاد کشمیر قیانوس جیسے ہونہار بچے کی تعلیم کے حصول میں میری معاونت کریں۔ اس عمل سے نہ صرف قیانوس کی تعلیم مکمل ہونے میں آسانی ہو گی بلکہ میں اپنے فیملی کے دیگر بچوں کو بھی تعلیم دلا سکوں گا۔ ان کا کہنا تھا کہ میری صرف ایک خواہش ہے کہ میرا بچہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ملک و قوم کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔ (بشکریہ سنڈے ایکسپریس)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدائی قسمت کر دی

جاوید راہی

وہ قرآن مکمل کرنے والی تھی جب قرأت کرتی تو سامعین خوبصورت آواز اور لہجہ کی ادائیگی پر قربان ہو جاتے۔ نعت پڑھتی تو کئی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ میں اُس سے پوچھتا۔ ”مانا بادشاہ وہ کتنی انکم ہوئی۔“ وہ جھٹ سے اپنا چھوٹا سا پرس کھولتی اس میں ٹھونسے نوٹ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے نچاتی.....!

ایک ننھی پری کا المیہ، ہر کوئی اس کا گرویدہ تھا مگر.....

کوئی ایسی پھانس تھی میرے پرائے ہونے والے احساسات کے نہاں خانے میں جس کا میٹھا پھکا درد پورے وجود کو اپنے حصار میں لئے مجھے درد تنہائی کا اندھا شعور عطا کر رہا تھا۔ شاید میں کچھ بھول گیا ہوں جس کو یاد کرنے کی کوشش میں میرے تمام دکھوں کا مداوا ہی میرا احساسِ جرم بنا۔

یار کیا چل رہا ہے؟

میں نے موبائل پر پہلا میسج پڑھا اور موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے یادوں کی یلغار صرصر کے دریچے کی دیواروں پر مہکتے سرسراتے مخملی پردوں کو دونوں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر کیا۔ مریم سے میرا ناطہ تمام رشتوں کا مکمل بھرم تھا وہ معصوم تو تھی ہی مگر اس سے بڑھ کر جو بات اُس میں تھی وہ تھا اُس کے اندر چھپا ہوا دس سالہ شرارتی لڑکا جو اُسے ہر وقت متحرک رکھتا۔

میں اُس کی بھاگ دوڑ پر خوش ہوتا مگر نیاں کی ڈانٹ ڈپٹ پر وہ بھاگ کر میرے پیچھے ہو جاتی۔ نیاں اُس کا سارا غصہ مجھ پر نکالتے ہوئے کہتی ”جیسے، یہ اب بچی نہیں بڑی ہو گئی ہے۔ سارا دن اڑوس پڑوس کی چھتوں پر پتنگیں لوٹتی پھرتی ہے، اس کو جانے کب عقل آئے گی۔“

نیاں کی ڈانٹ پر وہ میرے پیچھے چھپ کر جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساری دنیا سے محفوظ ہو جاتی۔ میں اُس کی ٹھوڑی کا دباؤ محسوس کرتا جو وہ میرے کندھے پر ٹکا کر اپنی بڑی بڑی شرارتی آنکھوں سے میرے چہرے اور کبھی نیاں کے چہرے کو دیکھتی۔ جب نیاں ڈانٹ ڈپٹ کر کے دوسرے کمرے میں چلی جاتی تو وہ بڑے پیار سے مجھے مخاطب کرتی۔

"بھائی جان دیکھئے نا۔ باجی مجھے تھوڑا سا بھی ہلا گلا نہیں کرنے دیتی۔" اُس کے لہجہ میں شکایت کا عنصر گہرا ہوتا۔ میں اُسے لاڈ پیار کر کے پھر سے اُسی بھاگ دوڑ پر مامور کر دیتا۔ مریم کی روح لڑکوں جیسی تھی، صنفِ نازک کا اُس پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

میں آفس میں واپس آیا تو وہ نیاں کے ساتھ اس کی گود میں سر رکھے مرجھائی سی پڑی تھی اور نیاں کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار تھے میں دونوں کے پاس ہی صوفہ پر بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے میرے بیٹے کو....." میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا جو خاصی ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔

"جیسے، یہ صبح سے تڑپ رہی ہے اس کے پیٹ میں سخت درد ہے۔ کئی جتن کیے مگر یہ مسلسل اِسی کیفیت میں ہے۔"

"چلو اٹھو ہسپتال چلتے ہیں....." میری چہرے کی ناگواری بھانپتے اُس نے پوچھا..... "کیا ہوا ہے؟"

"یار کم از کم صبح ہی مجھے فون کر دیتیں....." میں نے تکلیف کے نمایاں اثرات مریم کے چہرے پر دیکھتے اُسے ڈانٹا .....پھر میں نے سہارا دے کر اُسے اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہماری ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ جب وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھتی تھی تو فوراً اس کی انگلی ڈیک کے سوئچ پر پہنچ جاتی.....میں جلدی سے تمام شیشے چڑھا دیتا.....اس کے باوجود گاڑی کے اندر چوکڑی کا سا منظر جاگ اُٹھتا.....آج وہ خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہی یوں سمٹ گئی جیسے اُس میں بات کرنے کی بھی سکت نہ ہو۔

گاڑی سپیڈ بریکر پر سے اُبھری تو اُس کے چہرے پر شدید درد کے آثار اُبھر کر ڈوب گئے..... "جیسے آہستہ چلاؤ اُسے سخت تکلیف ہے....." نیاں نے پیچھے سے مجھے ٹوکا۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر توصیف نے اُس کا مکمل معائنہ کرتے کچھ ٹیسٹ لکھے اور وقتی ٹریٹمنٹ دیتے پھر آنے کا کہا کہ رپورٹیں آنے پر معلوم ہوگا۔

مریم کے چہرے کی چہچہاہٹ اچانک ہی غائب ہوگئی تھی اور اُس کے چہرے پر کسی سفاک دِل شخص کے چہرے جیسی سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ وہ میرے مذاق کا جواب مذاق میں دے مگر وہ ایک فقرہ کہہ کر خاموش ہو جاتی .....نہ کریں بھائی جان.....ڈاکٹر کا لکھا نسخہ لے کر میں میڈیکل سٹور پر گیا.....دوائیں نکال کر دینے اور بل بنانے تک میں یہی سوچتا رہا کہ کل تک تو یہ کھلنڈری لڑکی ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتی پھرتی تھی آج یکا یک اسے کس کی نظر لگ گئی۔ میڈیسن لے کر مریم کے ٹیسٹ کروانے تک میں اور نیاں اپنی اپنی جگہ ہزار سوچوں میں گم رہے۔

رپورٹیں تین دن بعد ملنی تھیں اس لئے میڈیسن کا استعمال شروع کروا دیا .....انہیں گھر چھوڑ کر ڈاکٹر توصیف کے پاس واپس ان کے کلینک آیا، رش بہت تھا مگر انہوں نے تھوڑی دیر بعد مجھے بلوا لیا۔ میں نے مریم کے بارے میں پوچھا کہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے حتمی کوئی فیصلہ تو نہیں سنایا مگر یہ بات مجھے باور کروا دی کہ مریم کے یوٹرس میں ٹیومر لگتا تھا۔ ابتدائی معائنہ میں نہ تو اُس کے سائز کا علم ہوا

اور نہ ہی دیگر کسی اور معاملہ کی سمجھ آئی۔ اس بات چیت سے یہی اندازہ ہو پایا کہ شاید اپریشن کروانا پڑے۔ میں بے دل سا ہو کر اُٹھا اور واپس گھر آ گیا۔ ایک دو بار فون کر کے پتہ کیا۔ مریم میڈیسن کھانے سے کچھ بہتر ہوگئی تھی، میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے روز مریم اور اس کی امی میرے آفس آئیں۔ مریم حسبِ معمول آتے ہی میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اب تم کیسی ہو؟

"بھائی جان میڈیسن بڑی کڑوی ہے۔ میں نے نیاں سے وعدہ لے لیا ہے کہ ہر خوراک کے بعد آئس کریم اور وہ بھی پچاس روپے والی۔" اس نے آنکھیں مٹکاتے کہا۔

"اچھا بس تم دوائی احتیاط سے لینا تیری آئس کریم میرے ذمہ، میں نے ہنستے اُسے الگ کیا اور باجی سے مخاطب ہو گیا جو مریم کی وجہ سے پریشان تھیں۔ میری تسلی پر انہیں کچھ یقین ہوا۔ نیاں بھی تھوڑی دیر بعد آ گئی جس کے ہاتھ میں کئی شاپر تھے۔ شاید یہ لوگ مارکیٹ سے آئے تھے اور واپسی پر مریم کے اصرار پر آفس آ گئے، چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر انہوں نے اجازت لی اور اُٹھ گئے۔ نیاں نے مریم کی رپورٹوں بارے مجھے تاکید کی اور آفس سے یہ لوگ چلے گئے۔

ڈاکٹر توصیف کمپیوٹر پر کام کرتے رہے تھے، انہوں نے دبی زبان میں مریم کو کینسر کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دل میں اُس نٹ کھٹ سی لڑکی کے لئے دعا گو تھا کہ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھیں۔

دوسرے کئی ایک خیالات کے ساتھ ساتھ میں اس بات کو لے کر پریشان ہو رہا تھا کہ ہم سب مریم کے عادی ہو چکے تھے وہ خود سر اور خودار لڑکی جو حفظ قرآن مکمل کرنے والی تھی جب قرأت کرتی تو سامعین اُس کی خوبصورت آواز اور لہجہ کی ادائیگی پر قربان ہو جاتے۔ نعت پڑھتی تو کئی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ میں اُس سے پوچھتا۔ "مانا بادشاہ وہ کتنی اکم ہوئی۔" وہ جھٹ سے اپنا چھوٹا سا پرس کھولتی اس میں ٹھونسے ہوئے چھوٹے بڑے نوٹ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے نچاتی اور فخر سے کہتی "پورے سات سو چالیس ہیں بھائی جان۔" اُس کی جمع پونجی میں بیس ہزار سے اوپر روپے تھے ساتھ میں اُس نے ایک سو روپے روز کی کمیٹی بھی اپنے محلہ میں ڈال رکھی تھی۔

"بھائی جان میں نے آخری کمیٹی لینی ہے۔ اُس وقت تک میرے پاس لاکھ کے قریب پیسے ہو جائیں گے نا۔"

"مانے آپ نے لاکھ روپے کا کیا کرنا ہے۔"

"بھائی جان میں بھی اماں جی کے ساتھ عمرہ پر جاؤں گی۔" میرے پوچھنے پر وہ جواب دیتی۔ اماں جی کے پاس وہ حفظ کر رہی تھی۔ اماں جی کی خواہش تھی کہ وہ عمرہ کریں گی مگر اماں جان کا تھا کون جو اُن کو عمرہ کرواتا۔ بس اماں جی کے دل میں تڑپ تھی اپنے خواب کو عملی جامہ پہنچانے کی وہ مریم سے کہتیں کہ مریم توجہ سے حفظ کرو میں تمہیں اپنے پاسپورٹ پر اپنی بیٹی لکھوا کر ساتھ لے جاؤں گی۔

شوکت خانم کولیکشن سنٹر سے میں نے مریم کی رپورٹیں لیں اور باجی کو فون کیا کہ وہ بھی ڈاکٹر توصیف کے پاس آجائیں میں رپورٹیں لے کر وہاں جا رہا ہوں۔

توصیف صاحب اتفاق سے اس وقت فری بھی تھے انہوں نے فائل کھول کر رپوٹوں کو دیکھنا شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا باجی بھی اندر آ گئی اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے فائل ایک طرف رکھتے مجھے مخاطب کیا ''میرا خدشہ درست نکلا مریم کو یوٹرس کینسر ہے'' مجھے یوں لگا جیسے ڈاکٹر توصیف نے مجھے اپنے کلینک کے بڑے بڑے شیشوں میں اٹھا کر باہر پھینک دیا ہو۔ باجی کی آنکھوں سے سوتے پھوٹ نکلے میں اسے کیا تسلی دیتا میں تو خود کو بھی نہیں سنبھال پا رہا تھا۔

''آپ لوگ ہمت سے کام لیں اور مریم کو فورا جناح ہسپتال لے جائیں، ڈاکٹر طیب اپنے ہی شہر کے رہنے والے ہیں اور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں میں بھی ان کو فون کر دوں گا اور آپ کو بھی وہ جانتے ہی ہوں گے۔ فورا آپریشن کروائیں مریم کا کیوں کہ ٹیومر کا سائز کافی بڑا ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے توصیف صاحب میں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' میں باجی کو ساتھ لیے باہر آ گیا، وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی بڑی مشکل سے میں نے اسے حوصلہ دیا اور ہم دونوں آفس آ گئے۔

''اب کیا ہو گا مانی تو میری زندگی ہے میری سانسیں اسی کی سانسوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔'' یہی حال میرا تھا میں اسے کیا جواب دیتا۔

''اچھا اب تم گھر جاؤ یہ فائل ادھر ہی چھوڑ جاؤ اپنے لوگوں سے مشورہ کرو مانے کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے کہ اسے کیا ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے اگر ہمیں پریشان دیکھ لیا تو نہ جانے اس بچی پر کیا اثرات ہوں۔''

باجی صاحبہ اس بُری خبر کے لئے تیار نہ تھی اس لیے صبح ہی لاہور جانے کی تیاری شروع ہو گئی ۔۔۔اور عابی بھائی مریم کو لے کر علی الاصبح پہنچ گئے۔ حسب سابق مریم میرے ساتھ آگے وہ دونوں بہن بھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تمام راستے مریم دل کھول کر ہنستی کھیلتی رہی ڈاکٹر توصیف کی میڈیسن نے وقتی طور پر درد کنٹرول کر رکھا تھا راستے میں بڑی باجی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ گھر سے سیدھی جناح ہسپتال پہنچ جائیں۔

ہسپتال پہنچ کر سارے ضروری عمل سے فارغ ہو کر ابتدائی ٹریٹمنٹ کے لئے مریم کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وقفے وقفے سے کچھ مختلف ٹیسٹ کروائے گئے دوسرے روز ڈاکٹر طیب نے رپورٹیں دیکھتے مجھے مخاطب کیا کہ آپریشن میں دیر نہیں کرنا ہو گی کیوں کہ کینسر کی زد میں یوٹرس کا خاصا حصہ متاثر تھا۔

باجی کی حالت پریشانی سے غیر ہو رہی تھی میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا۔ ہم سب کو پریشان دیکھ کر مریم اپنے بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئی، ''بھائی جان کیا مسئلہ ہے آپ مجھے بتا کیوں نہیں رہے؟''

''بیٹا تمہارا چھوٹا سا آپریشن ہو گا تمہارے پیٹ میں پھنسی بن گئی ہے جو تمہیں درد ہوتا ہے اس کی وجہ یہ پھنسی ہے۔'' میں نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتے سمجھایا۔ کچھ لمحوں تک تو وہ گم سم رہی پھر یکدم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''تو پھر کیا ہے بھائی جان میرے بھلے کے لئے ہی تو آپ سب کچھ کر رہے ہیں۔'' میں اس کی سمجھ داری پر حیران ہو گیا۔

آپریشن کی تاریخ طے ہو گئی ضروری اقدامات شروع ہو گئے۔ بلڈ کا بندوبست، میڈیسن، آپریشن

کے وہ لوازمات جو ہسپتال میں نہیں تھے وغیرہ وغیرہ مریم اپنے بیڈ پر لیٹی بلڈ بیگ کو دیکھ رہی تھی میں چار دن سے اسے جوس وغیرہ زیادہ دے رہا تھا صبح و شام بلڈ لگنے کی وجہ سے اس کے چہرہ پر ضرورت سے زیادہ سرخی پھیل رہی تھی۔

''مانا جی کیا قطرہ قطرہ گزر رہا ہے اسی کو کھول کر گلاس میں ڈالو اور ڈکار جاؤ۔''

''بھائی جان میں ویمپائر ہوں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ سے چاکلیٹ پکڑ کر مجھے جواب دیا۔ مریم کی ایک عادت میں نے شدت سے محسوس کی تھی کہ وہ شکریہ کہنا نہیں بھولتی تھی۔

آج اس کا آپریشن تھا اسے ہسپتال کا روایتی لباس پہنا دیا گیا کلائی پر ربن ٹیگ لگاتے نرس نے اس کے گال پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ڈھیروں دعائیں دیں اور ہم سب لوگوں سے اسے ملوا کر دوسرے چند مریضوں میں شامل کر لیا جن کے آج مختلف آپریشن تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے گلے لگی اور کہا ''بھائی جان دعا کرنا میرے لئے۔'' سبھی اس کی طرف بھیگی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ تقریبا بھاگتی ہوئی دوسرے مریضوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آپریشن تھیٹر کے باہر مریضوں کے لواحقین بے چینی سے اپنے پیاروں کے انتظار میں تھے۔ آہستہ آہستہ کر کے تمام آپریشن شدہ مریض نکل گئے مگر مریم کو آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے ابھی تک اس کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ ریڈ باؤنڈری لائن کے آگے جانے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی سیکورٹی گارڈ کے سوا کوئی دیگر عملہ کا گزر ہو رہا تھا جس سے پوچھ کر دل کو تسلی مل جاتی۔ بُرے بُرے خیال دل میں اُٹھ رہے تھے۔ نیاں ایک طرف بیٹھی دوسری بہن

بہاولپور میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں، خاص اسلامی نمبروں اور
دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

کیپٹل نیوز ایجنسی

عباسیہ سٹریٹ، بندر روڈ، بہاولپور سے رابطہ کریں۔ Bahawalpur.Ph:886811/875967

Email: sayyaradigest@gmail.com

پتہ لاہور آفس: 240، مین مارکیٹ ریواز گارڈن۔ 042-7245412

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائیوں کے ہمراہ اللہ تعالیٰ سے التجا میں مصروف تھی میں اور آبی بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور میں جلدی سے اُدھر لپکا۔ ڈاکٹر طیب تھکے تھکے سے باہر آرہے تھے مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ رُکے اور آپریشن کامیاب ہونے کا بتا کر اپنے روم میں چلے گئے۔ تقریباً دو گھنٹے مریم کو انتہائی نگہداشت میں رکھنے کے بعد باہر نکالا۔ ہم سب بے صبری سے اُس کی طرف بڑھے۔ وہ دنیا مافیا سے بے نیاز بے ہوش پڑی تھی۔ میں ضبط کے باوجود اپنے آنسو نہ روک سکا۔ یہی حال سارے گھر والوں کا تھا۔

مریم پہلے وارڈ سے فارغ ہو کر دوسرے وارڈ میں شفٹ کر دی گئی۔

نیاں اس کیساتھ تھی ایک لمحہ کو بھی الگ نہ ہوئی بہت زور دے کر میں نے ایک ادھ کپ چائے کا دیا اسے۔ میں تھک کر اتنا بدحال ہو گیا تھا کہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نہ جانے کب سو گیا۔ مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔

''بھائی ہوش آ گیا ہے مریم کو وہ آپ کو ہی یاد ا رہی ہے۔'' میں جلدی سے اٹھ کر اس کے ساتھ وا ڈ میں آ گیا وہ نیم مدہوشی میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے پیار سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا جو برف کی مانند سرد تھا۔ پھر نیاں سے مخاطب ہو کر پوچھا'' ڈاکٹر صاحب آئے تھے؟'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے کہا''ہاں دو تین بار دیکھا ہے''

''کیا کہہ رہے تھے۔'' ''کچھ نہیں بس ٹھیک کا ہی کہا۔''

''ٹھیک ہے اب آپ تھوڑا آرام کر لیں باہر جا کر میں بیٹھتا ہوں اپنے بچے کے پاس۔'' میرے اصرار پر نیاں اور آبی باہر نکل گئے۔ میں مریم کے بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے ماتھے کو سہلانے لگا لمحہ در لمحہ اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور وہ سو گئی۔ میں اس کے پاس بیٹھا اس کے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ چھوٹی سی عمر میں اسے کیا روگ لگ گیا۔

آہستہ آہستہ وہ صحت یاب ہو رہی تھی۔ اُٹھ کر بیٹھنے واش روم تک سہارے سے چل کر آنے جانے لگی تھی وہ۔ ''بھائی جان اب چلیں نا گھر ڈاکٹر صاحب سے چھٹی لے کر۔'' وہ اصرار کرتی۔ ''بیٹا ابھی چند دن اور رُکنا ہے ہمیں یہاں۔'' میں نے اسے سمجھاتے جواب دیا۔ ''آؤ میں آپ کو نیچے لے کر چلتا ہوں۔'' اس کا دل بہلانے کا سوچ کر میں نے آبی اور نیاں کو وہیل چیئر لانے کا کہا اور اسے سہارا دے کر بیٹھایا۔

ہم چاروں ہسپتال کی بالائی منزل سے بذریعہ لفٹ نیچے آ گئے۔ نیچے آ کر وہ کئی دنوں بعد خود کو آزاد سا محسوس کر رہی تھی۔ ''میرا بیٹا کیا پسند کرے گا۔ آئس کریم.....؟'' میں نے نیاں کو طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ کھا سکتی ہے۔ میں نے آبی کو چار آئس کریم لانے کا کہا جو ہم کو ایک طرف رُکنے کا کہتے کنٹین کی طرف چلا گیا۔ مریم ہم دونوں سے اپنی وارڈ کی مریضوں کی باتیں کرنے لگی۔ اب ہم نے معمول بنا لیا تھا کہ جب وہ اُکتا جاتی تو ہم اسے نیچے لے آتے اور یوں وہ بہل جاتی۔ ڈاکٹر طیب صاحب نے راؤنڈ کے دوران اس کا معائنہ کیا اور چارٹ پر میڈیسن لکھ کر ڈسچارج کرتے دوبارہ معائنہ کرنے کی تاریخ لکھ دی۔ مریم بہت خوش تھی واپس گھر جانے پر۔ وارڈ کے لوگوں سے فرداً فرداً مل کر مریم کاؤنٹر پر آئی تمام سٹاف کا شکریہ ادا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور نیچے آ کر گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آبی اپنی موٹر سائیکل پر گھر کی طرف اور ہم سڑکوں پر گشت کرنے چل پڑے کبھی ادھر اور کبھی ادھر جب تک خود مریم نے واپس چلنے کا اظہار نہ کیا میں گاڑی گھماتا رہا۔ بڑی باجی نے مریم کے لئے الگ بیڈ روم کا پہلے سے ہی اہتمام کر لیا تھا۔ میں اسے اچھی طرح لیکچر دے کر کہ تم نے یہ نہیں کرنا اور تم نے یہ نہیں کھانا وغیرہ وغیرہ اسے پیار کرتے واپس جانے کے لئے گاڑی میں آن بیٹھا۔

''آپ رابطے میں رہیے گا۔'' نیاں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے کہا۔ ''وہ تو میں پانچ چھ سال سے ہوں۔ جواباً نیاں چھینپ کر رہ گئی اور میں سب سے اجازت لیتے بڑی باجی کے گھر سے باہر نکل آیا۔

زندگی پھر سے متحرک ہوگئی۔ مریم کے باہر سے زخم ٹھیک ہو گئے مگر اندر سے وہ دن بہ دن درد سہتے سہتے چڑچڑی ہوگئی اس کے چہرے کی رونقیں مایوسی میں بدل گئیں۔ ڈاکٹر کی طرف سے بتائی گئی آپریشن کی مدت ختم ہوگئی تو اس کے معائنہ کے لئے ہسپتال آئے۔ معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب نوے دن کی چھٹی پر ہیں ان کے بعد لیڈی ڈاکٹر تھیں جنہوں نے سرسری مریم کا معائنہ کیا اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہی کچھ بتائیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ میں تو ان لوگوں کی بے حسی پر تلملا کر رہ گیا۔ پھر ہسپتالوں کے چکر شروع ہوگئے، کبھی شوکت خانم اور کبھی انمول کبھی شیخ زید، مریم ٹوٹتی گئی یہاں تک کے اس کا نازک کومل جسم سوکھ کر کانٹا بن گیا۔ میں اسے لے کر کبھی حکیموں کے پاس کبھی پیروں کے پاس بھی گیا مگر مریم کا روگ بڑھتا ہی چلا گیا پھر میری آنکھوں کے سامنے مریم مصنوعی زندگی کی سٹیج پر پہنچ گئی۔ پورے جسم کو کئی مشینوں کے سپرد کر دیا گیا کئی دن وہ زندگی اور موت سے لڑتی رہی آخری بار قومہ میں جانے سے پہلے اس نے نقاہت بھرے لہجہ میں کہا ''بھائی جان، مجھے کینسر ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو بہت دکھ دیا ہے مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے اس کے کمزور ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا ''میری بیٹی بھی ماں باپ کے لئے بچوں کا دُکھ بار گراں ہوتا ہے بس آپ ٹھیک ہو جاؤ ہمارے لئے یہی کافی ہے۔'' نیاں روتے روتے میرے کندھے سے لگ گئی۔ ''جیسے میرا مانا ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔'' ''کچھ نہیں بس وہ سمجھتی ہے کہ ہم پر بار بنی ہوئی ہے۔'' میں نے بھرائی آواز میں اسے جواب دیا۔

پھر مانے نے زندگی سے ہار مان لی اور وہ اس دنیا سے بے نیاز ہوگئی سارا دن ساری رات مشینوں کی آوازوں کا شور اور مریم کی ڈوبتی تیرتی زندگی کی کشتی ادھر ادھر ہچکولے کھاتی رہتی۔ جب تک زندگی کی ڈور ٹوٹ نہ جائے مشینیں شور کرتی رہتی ہیں پھر یک دم خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایسا ہی ہوا مریم پتنگ پکڑتی پکڑتی خود بھی دور خلاؤں میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ نیاں اس کے بیڈ کے قریب یوں کھڑی تھی جیسے اسے مریم کے اُٹھنے کا انتظار ہو اور میں ششدر کھڑا تھا اور احمد جلیل کی یہ مختصر نظم میرے خیالوں میں گھومنے لگی

میرے پیارے چلے گئے ہیں وہاں
اس جہاں میں جہاں سے کوئی بھی
آج تک لوٹ کر نہیں آیا
پھر بھی دل مانتا نہیں میرا
جانے کیا سوچ کر یہ دیوانہ
وا ہی رکھتا ہے گھر کا دروازہ

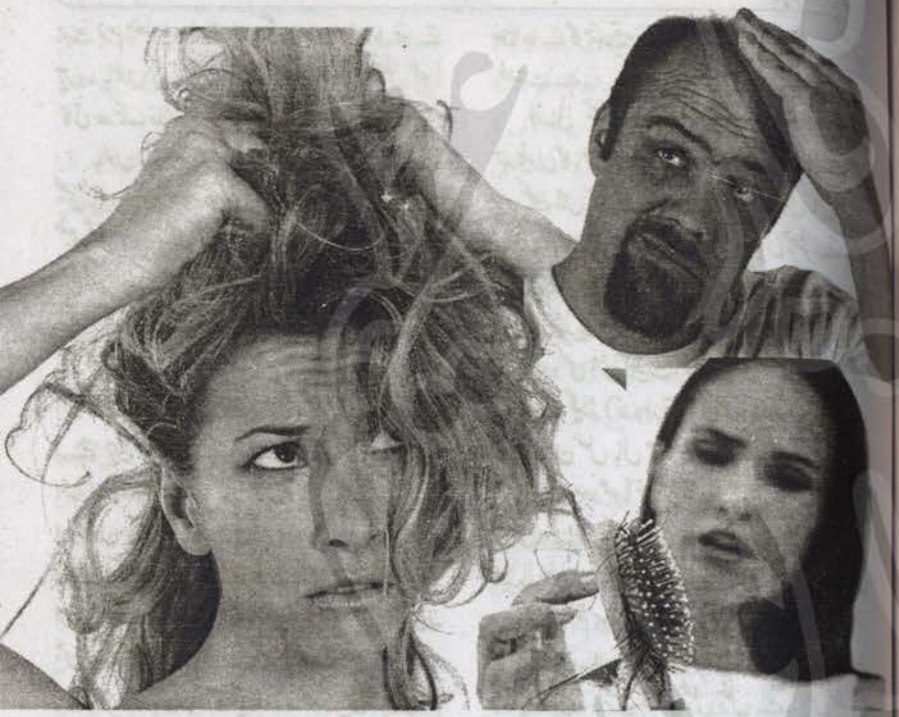

بالوں کے امراض

حکیم راحت نسیم سوہدروی

اخبارات و رسائل اُٹھا کر دیکھیں تو بال اُگانے کی ادویہ اور تیلوں کے اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے اور لاکھوں روپوں کے یہ تیل فروخت ہو رہے ہیں۔ جن لوگوں کو ان سے فائدہ نہیں ہوتا وہ انہیں فراڈ قرار دیتے ہیں۔ جن کو کچھ فائدہ ہو وہ ان کے گیت گاتے ہیں۔

بالوں سے متعلق مختلف مسائل کے بارے میں دلچسپ اور معلوماتی تحریر

بال مرد کے ہوں یا عورت کے، وقار اور خوبصورتی سے ان کا خاص تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی گھنے اور سیاہ بال پسند کرتا ہے اور سب سے زیادہ توجہ انسان انہی پر دیتا ہے۔ ہمارے جسم پر تقریباً پانچ لاکھ بال ہوتے ہیں۔ جسم میں سب سے زیادہ بال سر پر ہوتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہوتی ہے۔ بالوں کی لمبائی ایک انچ سے ایک گز تک اور عمر دو سے چھ سال تک ہوتی ہے۔ چھ سال بعد پرانا بال گر کر نیا آ جاتا ہے۔ گرم آب و ہوا والے مقامات پر بال زیادہ بڑھتے ہیں۔ ظاہری طور پر بال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت نرم معلوم ہوتے ہیں مگر بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ بالوں کی لمبائی، رنگت اور ساخت کا تعلق عموماً کافی حد تک خاندان سے ہوتا ہے۔

بالوں کے امراض میں سب سے اہم گنجا پن ہے یعنی بالوں سے محروم ہو جانا۔ بالوں کا گرنا ویسے تو ایک طبعی عمل ہے کیونکہ کمزور بال آہستہ آہستہ گر ہی جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے بال آتے رہتے ہیں۔ اگر بال نہ گریں تو انسان بھی ایک برفانی ریچھ کا روپ دھار لے مگر قبل از وقت بال گرنا ایک پریشان کن بات ہے اور اس سے نجات کے لئے دنیا کے بے شمار لوگ کوشاں رہتے ہیں مگر تھک ہار کر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اخبارات ورسائل اُٹھا کر دیکھیں تو بال اُگانے کی ادویہ اور تیلوں کے اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے اور لاکھوں روپوں کے یہ تیل فروخت ہو رہے ہیں۔ جن لوگوں کو ان سے فائدہ نہیں ہوتا وہ انہیں فراڈ قرار دیتے ہیں۔ جن کو کچھ فائدہ ہو وہ ان کے گیت گاتے ہیں۔

سر کے بال جلد کا ایک زائد حصہ ہیں جنہیں ہم بالوں کے غدود یا گلٹیاں کہتے ہیں۔ بالوں کی جڑیں حقیقی جلد کے نشیب میں 1/4 سے 1/12 انچ تک گہری ہوتی ہیں جبکہ بال ایک طرح کا بے جان تنا ہوتے ہیں یعنی جلد کے باہر بے جان ہوتے ہیں اس وجہ سے ہی جب ہم بال کٹواتے ہیں تو ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف بالوں کی جڑیں ایک زندہ اور فعال ریشہ ہیں ان کی پرورش خون کی باریک رگوں سے ہوتی ہے اور ان کی طاقت اعصاب کے ذریعے برقرار رہتی ہے۔ بالوں کی پیدائش کے تین مراحل ہیں: پہلے مرحلے میں بال پیدا ہو کر بڑھتے ہیں، دوسرے مرحلے میں گرتے ہیں۔ بالوں کے گرنے یا گنجے پن کا انحصار پہلے اور دوسرے مرحلے پر ہے۔ پہلے مرحلے میں جس قدر پیدا ہوں گے اسی قدر گھٹے ہوں گے، جتنے زیادہ گریں گے اتنا ہی سر صاف ہوتا جائے گا جبکہ تیسرے مرحلے میں تو بالوں سے مکمل رخصت ہے۔

انسانی جسم اور جلد میں فعلیاتی اور مرضیاتی تبدیلیوں کا بالوں کی صحت سے گہرا تعلق ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ان تبدیلیوں سے ہی بال گر کر صاف ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بال جھڑنے کے اسباب میں جنسیاتی موروثی اثرات بھی شامل ہوتے ہیں جبکہ شدید امراض، شدت بخار، تیز کیمیکل ادویات کے علاوہ کسی ذہنی کیفیت، خون کی کمی، نقص تغذیہ اور تھائی رائڈ گلینڈ (غدہ درقیہ) کی خرابی اور بعض خواتین میں دوران حمل بال تیزی سے جھڑتے ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد عموماً خود ہی آ جاتے ہیں۔ مستقل گنجے پن کی وجہ بالوں کی جڑوں کا مُردہ ہو جانا ہے اور دوسری وجہ بال خورہ ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت میں خون کی کمی سے جڑیں ختم ہو جاتی ہیں اور جسم کی طرح کمزور ہو کر مر جاتی ہیں۔ ان جڑوں کی تباہی میں کھوپڑی کی چھوت (پھپھوندی) وائرس کو بھی عمل دخل ہے۔ اس طرح جلدی وائرس نملہ (Herdeszoster) سے بھی گنجا پن ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ جن کے خون کی کمی سے بال گرتے ہوں، انہیں مقوی غذاؤں کا استعمال کرنا چاہیے۔

بال خورہ (Alopicial) ایک پریشان کن مرض ہے۔ اس کا شکار زیادہ تر مرد ہوتے ہیں اور مقام زیادہ داڑھی یا بھنویں بنتے ہیں۔ جہاں سے تکلیف کا آغاز ہوتا ہے پہلے وہاں دھبہ پڑتا ہے اس کے بعد چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کا دائرہ بن جاتا ہے۔ پھنسیاں کچھ روز میں سوکھ جاتی ہیں اور ان کے کھرنڈ باریک چھلکوں کی صورت میں جھڑ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی بال گر کر گول چکنا بن جاتا ہے اور بھوسی لگی رہتی ہے۔ یہ نشان بڑھ کر بعض اوقات داڑھی اور سر کو صاف کر لیتے ہیں۔ یہ تکلیف ویسے تو کوئی نقصان نہیں دیتی لیکن نفسیاتی طور

پر پریشان کر دیتی ہے۔ جدید تحقیقات نے اس کا سبب ایک خاص قسم کا بیکٹریا بتایا ہے۔ قدیم اطباء کے نزدیک اس کا سبب اعصابی فتور اور نمکین غذاؤں کا زیادہ استعمال ہے۔ اس مرض میں جسم میں خود کار واقع اجسام (Anti Body) بننے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں میں موروثی بھی ہوتا ہے۔ اس مرض میں صحت بخش غذائیں استعمال کی جائیں جیسے دودھ، دہی، میٹھے پھل، سبزیاں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ خون صاف کرنے والی ادویہ کا استعمال بھی مفید ہے۔ جمال گھوٹہ کا تیل احتیاط سے تمام مرض پر پھریری سے لگائیں۔ تھوم، پیاز اور ادرک کا پانی لگانا بھی مفید ہے۔

"بفہ" جسے Dandruff کہتے ہیں اور عام طور پر سر میں خشکی یا بھوسی کہا جاتا ہے، اس تکلیف میں سر کی جلد سے ایک چکنی رطوبت بہتی ہے جو جلد کی سطح پر جمع ہو کر جسم کی حرارت سے جسم سے بھوسی کی مانند جھڑتی ہے۔ دراصل یہ رطوبت سر کی جلد کو خشکی سے بچانے کے لئے سر کے غدودوں سے نکلتی ہے مگر جب یہ رطوبت زیادہ بننے لگے تو بہتی ہے۔ بعض لوگوں میں جسم کے دوسرے حصوں میں بھی کبھی ہو جاتی ہے اور خشکی پیدا کرتی ہے۔ اس میں عام طور پر سر میں خارش ہوتی ہے جس سے بھوسی اُترتی ہے۔ یہ خشکی سر کی جلد کے مسامات کو بند کر دیتی ہے اور میل کچیل خارج نہیں ہو پاتا۔ دھوپ اور تازہ ہوا بھی نہیں لگتی جس سے بالوں کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں اور بال گرنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ خون کی کمی اور غذائی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ بفہ کی صورت میں روغن کملیہ 100 گرام اور دوا خارش سفید 10 گرام ملا کر رکھ لیں۔ رات کو ہلا کر انگلیوں سے بالوں کی جڑوں میں جذب کرایا کریں۔ صبح بال دھو لیں۔ دس یوم میں مطلوبہ نتائج سامنے آتے ہیں مگر اس کے ساتھ غذا بہتر بنائیں۔ پتوں والی سبزیاں، تازہ دودھ، موسمی پھل، سبز ترکاریاں زیادہ کھائیں۔ موسم سرما میں مچھلی کے جگر کا تیل (روغن جگر ماہ) استعمال کرائیں اور درج ذیل ادویہ کھائیں:

☆ صبح دواالمسک معتدل سادہ چھ گرام، بعد غذا دوپہر شام شربت فولاد دو چمچے پانی ملا کر جبکہ رات کو گل منڈی چھ گرام جوش دے کر چھان کر پی لیں۔

☆ روزانہ نیم کے تازہ پتے پیس کر لگانا بھی مفید ہوتا ہے۔ اگر کسی بیماری کی وجہ سے ہو تو مقوی غذائیں استعمال کریں۔

بالوں کا سفید ہونا

قبل از وقت بالوں کا سفید ہونا بڑا تشویشناک ہوتا ہے۔ اگرچہ جسمانی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس کا ردعمل ناخوشگوار ہی ہوتا ہے۔ بالوں کو قدرتی طور پر سیاہ رنگ دینے والا مادہ جلد کے اندر ہوتا ہے اور ایک دفعہ بال جلد سے باہر آ جائے تو اس کے بعد اس کا رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔ پھر بال کے اندر ایک سوراخ ہوتا ہے، اس میں رنگت کا مادہ اور چربی ہوتی ہے، سیاہ بالوں میں رنگ دار مادہ زیادہ ہوتا ہے، عمر کے ساتھ ساتھ اس رنگ کی پیداوار کم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار ختم ہو جاتی ہے چنانچہ بال پہلے بھورے اور پھر سفید ہو جاتے ہیں۔ یہ تو طبعی عمل ہے مگر وقت سے قبل بچوں اور نوجوانوں میں بال سفید ہونے کی وجوہات میں موروثی اثرات کے علاوہ خون کی کمی سے بھی رنگت میں فرق آ جاتا ہے مگر ابھی تک کوئی بھی حتمی سبب معلوم نہیں ہو سکا البتہ مطب کے تجربات سے مشاہدہ میں آیا ہے کہ دائمی نزلہ، زکام، دماغی کمزوری اور سوئے ہضم بھی بالوں کی سفیدی کا ایک سبب ہو سکتے ہیں۔

اس لئے طب مشرقی کے اصول علاج کے مطابق اسباب جاننا ضروری ہے۔ اگر دائمی نزلہ زکام کی شکایت رہتی ہے تو پھر قرص مرجان سادہ 1 عدد، خمیرہ گاؤ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زبان عنبری چھ گرام صبح نہار منہ کھانا مفید ہے جبکہ رات کو سوتے وقت اسطخو دوس چھ گرام پانی میں جوش دے کر نیم چھان کر خمیرہ بادام کچھ چھ گرام کھالیا کریں۔

بالوں کی حفاظت کے لئے تدابیر

بالوں کی صفائی بہت ضروری امر ہے۔ اس لئے ہفتے میں کم از کم تین بار کسی مناسب صابن یا شیمپو سے بالوں کو دھویا جائے اور روزانہ سادہ پانی سے دھو کر صاف کیا جائے۔ اگر جلد چکنی ہے تو بیسن سے دھونا مفید ہے۔ برش روزانہ کیا جائے اور بالوں کو دھو کر تازہ ہوا اور دھوپ میں کھلا چھوڑا جائے۔ اس کے بعد مناسب تیل لگائیں۔ بازاری تیل سے احتیاط کریں۔ بالوں کو زیادہ صابن نقصان دیتا ہے اور جلدی امراض جنم لیتے ہیں۔ بالوں کی کھٹاس بھی گل جاتی ہے جو جراثیم کو مارتی ہے۔ بالوں کو دھو کر دھوپ لگانا اس لئے بھی مفید ہے کہ دھوپ جراثیم مارتی ہے اور حیاتین "د" کو جذب کرتی ہے۔ قدیم اطباء نے بالوں کے ماحول کو ترش قرار دیا ہے اس سے ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترش اشیاء سے دھونے کا مشورہ دیتے ہیں۔

غذا میں موسمی پھل، سبزیاں، دودھ، دہی مفید ہیں کیونکہ خون کی کمی یا جسمانی طور پر کمزور شخص کے بال کبھی بھی صحت مند، توانا اور گھنے وسیاہ نہیں ہوں گے۔ اس لئے صحت کی طرف توجہ ضروری ہے۔

مرہم

ایک بار ایک صاحب دبئی گئے۔ واپسی پر بورڈنگ کے دوران اچانک انہیں ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی جو بہت پریشانی کے عالم میں بار بار داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ صاحب اسکے پاس گئے اور اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کیساتھ دبئی میں رہتی ہے اور پہلی بار پاکستان جارہی ہے، لیکن جن صاحب نے اس کو گائیڈ کرنا تھا وہ ابھی تک نہیں آئے تھے اور فلائیٹ کا وقت ہو چکا تھا۔ اب ان صاحب نے لڑکی کو تسلی دی اور کہا کہ آپ کو پاکستان میں کسی قسم کی بھی مدد کی ضرورت ہو تو آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔

قصہ المختصر کہ ان دونوں میں پاکستان آنے تک اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد پاکستان آکر ان دونوں نے اچھا خاصا وقت ساتھ ساتھ گزارا، ان صاحب نے کچھ ایسا اچھا امپریشن دیا کہ لڑکی نے ان صاحب کو شادی کی آفر بھی کردی۔

اب یہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ طے یہ ہوا کہ لڑکی واپس جائے گی اپنے والدین سے بات کرے گی اور جلد ان کے ساتھ واپس آجائے گی اسکے بعد شادی کی جائے گی۔

یہ صاحب خود انکو چھوڑنے ائیر پورٹ گئے اور کافی گرمجوشی اور عہدوفا کے بعد اسکو رخصت کر آئے۔ کچھ عرصہ تک اس لڑکی کا کوئی فون نہ آیا لیکن کافی دن گزرنے کے بعد سب کو تشویش ہوئی، اب ان صاحب نے اسکے موبائل پر رابطے کی کوشش کی تو آگے سے ایک بزرگ نے فون ریسیو کیا ان کے پوچھنے پر جو خبر اسکو ملی وہ یہ تھی کہ دبئی میں ائیر پورٹ سے واپسی پر اس لڑکی کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ چند گھنٹوں بعد ہی وفات پا گئی تھی۔

یہ صاحب بہت دلبرداشتہ ہوئے، کافی عرصہ تک کام وام بھی نہ کیا، بہت پریشانی کے عالم میں بالکل پاگلوں جیسی حالت بنا کر گھومتے رہے، لیکن وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے، آہستہ آہستہ یہ دوبارہ اپنی اصل زندگی میں لوٹ آئے۔

☆☆☆

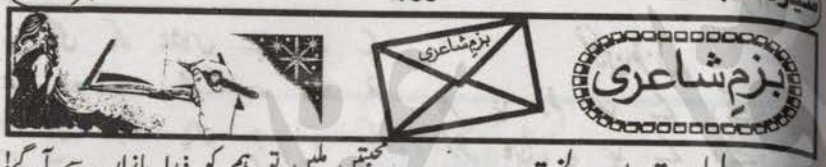

لڑیں دو بلبلیں تو ثالث بالخیر تو ہووے

عدل و انصاف پر رواں دواں ہو اگر کاروبار زندگی
وہ معاشرہ امن کی تعبیر ہوا کرتی ہے
مالک ارض و سماع سمیع و بصیر ہے
انسان عقل کل نہیں ایک بھول جو تقصیر ہوا کرتی ہے
لے ڈوبتا ہے بندے کو طاقت کا گھمنڈ
عدل کی نفی سے عدل کی تحقیر ہوا کرتی ہے
عدل سے جرأت عمل خود اعتمادی کی ترویج ہوتی ہے
عدل سے معاشرے میں فکر وعمل کی تطہیر ہوا کرتی ہے
لڑیں دو بلبلیں تو ثالث بالخیر تو ہووے
عدل کی برتری سے انسانیت کی توقیر ہوا کرتی ہے
سربلندی اس کی دین بندے کی کوئی خوبی نہیں
سچائی امر ہے کردار انسان کی تقدیر ہوا کرتی ہے
نکلی ٹہنیاں شگوفوں سے بھر جاتی ہیں رُت بدلنے پر
نظام قدرت اٹل ہے صالح معاشرہ عدل کی تصویر ہوا کرتی ہے
یہ جہان رنگ و بو قائم ہے عدل کی بنیاد پر
عدل سے برگشتگی پر قدرت کی تعذیر ہوا کرتی ہے
(قاضی محمد یوسف، مسقط)

غزل

سنسان گلیوں، ویراں درودیوار سے آگے
ہم انجان ہیں اپنے دلِ بے زار سے آگے!
ورنہ زمانہ کیا تیری دسترس میں نہیں
اک ہم ہی ہو گئے تیرے اختیار سے آگے!
کبھی یوں ہوا کہ وصل کے عنواں نہ ملے
اور کبھی میں لکھتا رہا دردوآزار سے آگے
الزام آئیں تو بے داغ قبا کی طرح ہوں
محبتیں ملیں تو ہم کو ذرا بازار سے آگے!
اب کہاں بھلا روزگار کی فکریں ہم کو
اب تو نکل آئے ہیں بہت دور گھر بار سے آگے
دل کی بات ہے سو اکتفا ہے اسی پر
ورنہ جہاں اور بھی پڑتا ہے رُخِ یار سے آگے!
(نعمان اسحاق، دائرہ دین پناہ)

غزل

دشت گلچیں سے جو بچا ہے
وہی اک پھول چمن میں کھلا ہے
تیز آندھیوں کا شور تھا اتنا
اک جلتا چراغ پھر بجھا ہے
زندگی بھر کا ساتھ تھا میرا اسکا
جو اک پل میں ختم ہوا ہے
شہر پرآشوب میں اتنا تو ہوا
آس کا زود سورج ڈھلا ہے
گھور اندھیرے نہ راستوں کا علم
مسافر انجان منزل کو چلا ہے
منڈیر میں بیٹھا اک پرندہ
کچھ نہ ملا تو پھر اُڑا ہے
چاروں طرف بند گھروں میں لوگ
پھر بھوک سے اک شخص مرا ہے
رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا اس کا اس سے
میرا بھائی پھر سے تنہا ہوا ہے
(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

دل بہت ہی اداس ہے اب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی بھی کچھ ناشناس ہے اب کے
جتنا وہ دور مجھ سے رہتا تھا
اتنا ہی میرے پاس ہے اب کے
کچھ تو بدلے ہیں زندگی کے چلن
کچھ یہ موسم بھی راس ہے اب کے
اک سمندر اُتار لوں خود میں
اتنی شدت کی پیاس ہے اب کے
ڈر کوئی اب نہیں بھٹکنے کا
وہ طبیعت شناس ہے اب کے
سوچتی ہوں بہار کا موسم!!
دور ہے نہ ہی پاس ہے اب کے
جس سے مہکے ہیں دل و جاں میرے
کچھ عجیب سی وہ باس ہے اب کے
خوش ہوں اس بات پر کنول اتنا
زندگی مجھ کو راس ہے اب کے
(یاسمین کنول، پسرور)

غزل

جب شیطانیت انسانیت کی راہ میں حائل ہوئی
تب نسلِ آدمؑ برائی کی طرف مائل ہوئی
جارحیت کا راستہ روکے سے کیوں رُکتا نہیں
طاقت مدافعت کی کس طرح زائل ہوئی؟
اتحادِ ملک و ملت پارہ پارہ ہو گیا
قوم بھٹکی اس قدر کہ ظلم کی قائل ہوئی
کیا کوئی بھی ان گمراہوں کو روکنے والا نہیں؟
کس طرح یہ قوم دہشت کی طرف مائل ہوئی
نفس کی عزت پہ اختر جان دیتے تھے کبھی
کیسے خودداری ہماری آج خود سائل ہوئی
(رشید اختر قادری، لاہور)

نمکین غزل

پھر نیا زخم کھا کے دیکھتے ہیں
گرلز کالج پہ جا کے دیکھتے ہیں
پہلے نظریں اٹھا کے دیکھتے تھے
اب تو نظریں جھکا کے دیکھتے ہیں
لڑکیاں دیکھنا تو فطرت ہے
ہم بہت بچ بچا کے دیکھتے ہیں
گر شگفتہ سا کوئی چہرہ ملے
ہم اسے مسکرا کے دیکھتے ہیں
سینڈل گر ادھر سے آتا ہو
پھر تو خود کو بچا کے دیکھتے ہیں
دور سے کچھ نظر نہیں آتا
پھر بھی عینک لگا کے دیکھتے ہیں
گھر تو اس کا ہمیں نہیں معلوم
ہم تو کالج پہ جا کے دیکھتے ہیں
(ایس۔امتیاز احمد، کراچی)

قمار بازی

جھوٹی دنیا طمع سازی ہے
ایک عادت قمار بازی ہے
فائدہ کم بہت زیاں اس میں
رومی و رازی ہیں کہاں اس میں
تندرستی کو چھین لیتا ہے
کیا جُوا ہم کو اور دیتا ہے
وقت ہوتا ہے اس میں ضائع بہت
بن کے بیٹھے ہوئے ہیں سارے بُت
یہ حقیقت ہے ایک قصہ ہے
قتل و غارت گری کا حصہ ہے
دور فرعون میں بھی سونا تھا
سامری جیت کر بھی روتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جادوگر کے کمال ہیں اس میں
سارے ابلیسی جال ہیں اس میں
تو بڑے لوگوں میں کہیں ہوتا
ان ستاروں میں یہ حسیں ہوتا
بات مشہور ہے زمانے میں
لطف آتا ہے یہ سنانے میں
ایک دن شہر سے کہیں کچھ دور
اپنے نواب بیٹھے تھے مسرور
صبح ٹھنڈی فضا سہانی تھی
تب جوا کی وہاں کہانی تھی
سب کو بخشا کیا عطا کیا کیا
نقشہ کھنچا وہاں جواری کا
سو خزانہ تمام سو جائے
ایسے میں صبح شام ہو جائے
ہم جواری کو کچھ نہیں دیتے
اس بھکاری کو کچھ نہیں دیتے
(ظفر زخمی، ملتان)

چپ

مجھے بھی یہی کہنا تھا
تمہیں بھی یہی سننا تھا
مگر زیست گزر گئی
اور باتیں رہ گئیں
ایک چپ سی تھی
جو ہمارے درمیان رہ گئی
(مریم ماہ منیر، لاہور)

غزل

وجۂ زخم دل بدن تار تار کی
ہر کسی نے بات تیری بار بار کی
دھر کے کسی پہ رسوا نہ ہم گئے
اپنی زندگی تھی خود یہ نثار کی!
کچھ ہے تو آ، آرزوئے دل کریں
کہ عشق چلا گیا ہے راہ بازار کی
چھا رہی ہیں دل پر شام اداسیاں
بات چھیڑیے اب زلف یار کی
مجھ کو ملا وہ اک مخلص کی خاک میں
بڑائی کیا پوچھتے ہو پروردگار کی
اس نے برا کہا تو چھوڑیے نعمان
بات اپنی اپنی ظرف و شعار کی!
(نعمان اسحاق)

غزل

عبادت کی طرح میں یہ کام کرتی ہوں
میرا اصول ہے پہلے سلام کرتی ہوں
مخالفت سے میری شخصیت سنورتی ہے
میں اپنے دشمنوں کا بڑا احترام کرتی ہوں
میں ڈر گئی ہوں بہت سایہ دار درختوں سے
ذرا سی دھوپ بچھا کر میں قیام کرتی ہوں
مجھے خدا نے غزل کا دیدار بخشا ہے ساحل
یہ سلطنت میں محبت کے نام کرتی ہوں
(ساحل نور، فیصل آباد)

زندگی

زندگی
زندگی تو ناؤ ہے
وقت کے سیل میں جو بہتی ہے
زندگی
زندگی تو ایسی ہے
حادثوں کے جو دکھ کو سہتی ہے
زندگی کو بھلا کہیں کیا ہم
ہر کہانی یہ خود ہی کہتی ہے

زندگی کے اداس لمحوں میں
کس کی تجھ کو تلاش رہتی ہے
(زاہدہ یوسفی، لاہور کینٹ)

غزل

روز تلقین وفا کرتا ہے
شخص جو، جور و جفا کرتا ہے
چند گھڑیوں کا سہارا دیکھا
کون دنیا میں وفا کرتا ہے
وہ مجھے بھول گیا ہے شاید
میرا من جس کو دعا کرتا ہے
پیار دنیا کی ضرورت ہے مگر
فرض یہ کون ادا کرتا ہے
اس کی توصیف بیاں ہو کیسے؟
دینے والا جو عطا کرتا ہے
میں کبھی بولا نہیں جس کے لئے
ساری دنیا سے گلا کرتا ہے
تیرے دروازے پہ دیتا ہے صدا
روز رانا یہ خطا کرتا ہے
(قدیر رانا، راولپنڈی)

مجھے محسوس ہوتا ہے

مجھے اک بوجھ کی صورت
اٹھا کر شام کاندھے پر
جب اپنے گھر پٹک دیتی ہے لاکر
تیرے ہونٹوں کی زندہ مسکراہٹ
مرے ٹوٹے ہوئے بازو پکڑ کر
اٹھاتی ہے مجھے
کہتی ہے آؤ
تمہارا بوجھ پلکوں پر اٹھالوں
سب اچھا ہے
سبھی نے گھر میں کھانا کھالیا ہے
رکابی، روٹیاں، سبزی
اور اس سے بھی بہت میٹھا
تیرا انداز دلداری
تری معصوم غم خواری
ہتھیلی تیل بن کر جذب ہو جاتی ہے
مرے گرم سر میں
سما جاتی ہیں بالوں میں
مسیحا انگلیاں تیری
مجھے محسوس ہوتا ہے
مرے بکھرے ہوئے اعضاء دوبارہ جڑ گئے ہیں
(ظفر گورکھپوری)

بندھن

ہم تم ایک سمندر ہوتے!!
رات سے گہری نیلاہٹ کے تخت پہ بیٹھے
ہونٹوں سے ہم ہونٹ ملا کر باتیں کرتے
لہریں ساحل ساحل جاتیں
دور انوکھے دیسوں سے وہ خبریں لاتیں
خوشیوں اور ناخوشیوں کی
رات سمے جب چاند چمکتا
ابر اور سمندر میں اک بندھن ہوتا
ناچ ناچ کے لہریں پاگل ہوتیں
ہم دونوں پاتال میں بیٹھے
صدیوں یونہی بیٹھے رہتے
پر ہم دونوں مچھلی بن کر
ساحل ساحل پھرتے
موت آتی، تو مر بھی جاتے
لیکن خوش خوش مرتے
(غلام جیلانی اصغر)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیارے لمحے

پیارے لمحے آئیں گے اور مجبوری مٹ جائے گی
ہم دونوں مل جائیں گے اور سب دوری مٹ جائے گی
ہر دم بہنے والی آنکھوں کی مالا بھی ٹوٹے گی
تیری میری ہستی اس بیری بندھن سے چھوٹے گی
لیکن یہ سب باتیں ہیں اپنے جی بہلانے کی
دکھ کی رات میں دھیرے دھیرے دل کا درد مٹانے کی
روتے روتے ہنستے ہنستے رُکتے رُکتے گانے کی
سکھ کا سپنا سوکھا ہے اور سوکھا ہی رہ جائے گا
سونی سیج پر پریم کہانی پریمی یوں کہہ جائے گا
ہوتے ہوتے سارا جیون آنکھوں سے بہہ جائے گا

(میراجی)

آج بھی شام اداس رہی

آج بھی تپتی دھوپ کا صحرا
تیرے نرم لبوں کی شبنم
تیری بکھری بکھری زلف کے
سائے سے محروم رہا
آج بھی پتھر ہجر کا لمحہ
صدیوں سے بے خواب رتوں کی
آنکھوں کا مقسوم رہا
آج بھی اپنے وصل کا تارا
راکھ اڑاتی شوخ شفق کی
منزل سے معدوم رہا
آج بھی شہر میں پاگل دل کو
تیری دید کی آس رہی
مدت کی گم صم تنہائی
آج بھی میرے پاس رہی
آج بھی شام اداس رہی

(محسن نقوی)

ایک شعر فیس بک ڈاٹ کام سے

ڈبو دے اپنی کشتی کو کنارا ڈھونڈنے والے
یہ دریائے محبت ہے یہاں ساحل نہیں ملتا

❁ ❁

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام: ..... تعلیمی قابلیت: .....
عمر: ..... پسندیدہ شاعر: .....
پسندیدہ غزل/نظم: .....
مشاغل: ..... تاریخ پیدائش/برج: .....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ: ..... پتہ: .....
ای میل: .....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com
www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: صائمہ عمران)

عیدالفطر آئی اور گزر بھی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں بھی۔ پھر شروع ہوئی وہی روٹین اور ماؤں کے ذہن پر سوار وہی سوال کہ لنچ بکس میں کیا ہو جو صحت بخش بھی ہو اور بچوں کا من پسند بھی۔ یوں تو گاہے بگاہے ہم آپ کو ایسی recipes بتاتے ہی رہتے ہیں جو آپ بآسانی بچوں کو لنچ بکس میں رکھ کر دے سکتی ہیں لیکن اس بار آپ کی آسانی کے لئے ہم خاص طور پر بچوں کی من پسند recipes بتا رہے ہیں جنہیں کھا کر بچے خوش اور بنا کر ماما خوش۔

پہلی recipe جو ہم آپ کو بتا رہے ہیں وہ ہے ایسے برگر کی جو pizza کا مزا لئے ہوئے ہے یعنی ٹو ان ون۔ بچوں کو برگر اور pizza دونوں بے حد پسند ہوتے ہیں اس کے لئے تو وہ ناں کر ہی نہیں سکتے۔

پیزا برگر

اجزاء:

مرغی کے سلائس	چار عدد (اُبلے ہوئے)
اوریگانو	ایک چمچ
برگر بن	چار عدد
ٹوماٹو کیچپ	حسب ضرورت
شملہ مرچ (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
مشروم (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
مکھن	برگر پر لگانے کے لئے
چیڈر چیز (کش کیا ہوا)	ایک کپ

ترکیب: برگر کو درمیان میں سے کاٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیں۔ دونوں حصوں پر مکھن لگائیں۔ اب ٹوماٹو کیچپ پھیلائیں۔ اس پر oregano چھڑک دیں۔ اب مرغی کے سلائس اور باقی سبزیاں ڈالیں۔ اوپر سے cheese چھڑکیں۔ اسی طرح سب برگر تیار کر لیں۔ ان کو اوون میں رکھیں۔ یہاں تک کہ cheese پگھل جائے۔ اب اوون سے نکال کر اوپر والے بن سے ڈھک دیں۔ مزے دار پیزا برگر تیار ہے۔

چکن ڈرم سٹکس

اجزاء:

چکن لیگ	چھ سے آٹھ عدد
نمک	آدھا چائے کا چمچ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچ

ایک کپ پانی میں یہ تمام اجزاء ڈال کر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور چکن گل جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

batter بنانے کے لئے:

انڈہ	ایک عدد
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ
چلی ساس	ایک چائے کا چمچ
نمک	آدھا چائے کا چمچ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچ
میدہ	چار کھانے کے چمچ
پانی	حسب ضرورت
بیکنگ پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچ

ترکیب: ایک پیالے میں batter کے تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کریں۔ اب ابلی ہوئی ڈرم

سٹکس کو batter میں ڈبو کر تیل میں فرائی کر لیں۔ فرنچ فرائز کے ساتھ سرو کریں۔

(تحریر: فاطمہ قیوم)

چکن ملائی بوٹی

اجزاء:

بون لیس چکن	آدھا کلو
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
نمک	ایک چائے کا چمچ
چینی	ایک چائے کا چمچ
دہی	آدھی پیالی
کریم	آدھی پیالی
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچ
قصوری میتھی	دو کھانے کے چمچ
گھی	دو کھانے کے چمچ

ترکیب: تمام اجزاء کو چکن کے ساتھ مکس کر

لیں اور 3 سے 4 گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر چکن کے ٹکڑوں کو سیخوں پر لگا کر کوئلوں پر سینک لیں یا پین میں پکا کر کوئلے کا دھواں دے لیں۔ مزیدار ملائی تکے تیار ہیں۔

جلیبیاں

اجزاء:

میدہ	چار پیالی
بیکنگ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
زردہ رنگ	آدھا چائے کا چمچ
چینی	تین پیالی
عرق گلاب	چند قطرے
چھوٹی الائچی	پانچ عدد
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب: ایک برتن میں میدہ چھان کر بیکنگ پاؤڈر ملا کر دو کپ گرم پانی ڈال کر لئی سی بنا لیں۔ اب 12 گھنٹے تک ڈھانپ کر رکھ دیں۔ ایک دوسرے برتن میں چینی اور 2 کپ پانی، زردہ رنگ، الائچی اور عرق گلاب ملا کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا شیرہ تیار ہو جائے۔ لئی میں تھوڑا سا میدہ ملا کر گاڑھا کر لیں۔ ایک پلاسٹک کی تھیلی میں سوراخ کر کے اس میں لئی ڈال کر کڑاہی میں گول گول ڈال کر فرائی کر لیں۔ جب گولڈن ہو جائیں تو نکال کر 5 منٹ کے لیے شیرے میں ڈال کر نکال لیں۔ مزیدار جلیبیاں تیار ہیں۔

(تحریر: سائرہ محسن)

پی نٹ بٹر کرنکلز

اجزاء:

مکھن	125 گرام
ونیلا	آدھا چائے کا چمچ
لیموں کے چھلکے	آدھا چائے کا چمچ
	(باریک کترے ہوئے)
شکر	1/3 کپ
براؤن شوگر	1/3 کپ
پی نٹ بٹر	1/3 کپ
میدہ	چوتھائی کپ
سوڈا بائی کاربونیٹ	ایک چائے کا چمچ
نمک	ایک چٹکی

ترکیب: مکھن، ونیلا، لیموں کے ٹکڑے، شکر، براؤن شوگر اور پی نٹ بٹر کو ملا کر اچھی طرح یکجان کر لیں۔ اس میں میدہ چھان کر اس میں سوڈا اور نمک ملائیں اور سخت گوندھ لیں۔ بسکٹ کی شکل کا بنا کر چکنائی لگی اوون ٹرے میں رکھ دیں اور اوپر کانٹے کی مدد سے کراس ڈیزائن بنا لیں۔ 350 فارن ہائیٹ پر 15 منٹ تک بیک کریں اوون ٹرے پر ہی ٹھنڈا ہونے دیں۔

چاکلیٹ نٹ

اجزاء:

میدہ	300 گرام

بغیر نمک والا مکھن	250 گرام
بادام	150 گرام
آئیسنگ شوگر	200 گرام
(فلنگ کے لیے)	(چھنی ہوئی)
گاڑھی کریم	250 گرام
آئیسنگ شوگر	75 گرام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادام	100 گرام
اخروٹ	100 گرام

آئیسنگ اور ڈیکوریشن کے لیے:

چاکلیٹ	300 گرام
مکھن	25 گرام
شوگر	50 گرام
پانی	3 ٹیبل سپون
گاڑھی کریم	250 ملی لیٹر

ترکیب: میدے کو چھان کر اس میں مکھن انگلیوں کی پوروں سے ملائیں۔ بادام اور آئیسنگ شوگر ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ اس کو تین برابر حصوں میں تقسیم کریں۔ برتن میں بٹر پیپر لگا کر پگھلا ہوا مکھن چاروں طرف اور تہہ میں لگائیں۔ اس برتن پر تینوں کو تہہ بہ تہہ جما دیں۔ 325 فارن ہائیٹ پر 40 منٹ تک بیک کریں۔ کریم کو پھینٹیں۔ اس میں شکر اور

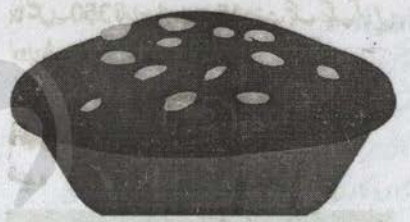

اخروٹ ملائیں۔ تینوں ٹکڑوں کو اس کریم کے ذریعے ملائیں۔ چاکلیٹ کو مکھن، شکر اور پانی کے ساتھ پگھلائیں پھر کیک کے اوپر کوٹنگ کریں۔ جب چاکلیٹ سیٹ ہو جائے تو کریم اور اخروٹ کے درمیان سے دو ٹکڑے کر کے سجائیں۔

بلیک فاریسٹ

اجزاء:

میدہ	4 ٹیبل سپون
انڈے	5 عدد
شکر	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	3 ٹیبل سپون
کوکو کا پاؤڈر	ایک ٹیبل سپون
مکھن	2 ٹیبل سپون
	ونیلا ایسنس
آئیسنگ شوگر	2 ٹیبل سپون
کریم	2 کپ
ڈبے میں بند چیری کیٹ کڑے	ایک کپ

ترکیب: انڈوں میں ایک کپ شکر ملا کر اچھی طرح پھینٹیں کہ یہ کریم جیسا ہو جائے اور اپنی مقدار میں بھی دوگنا لگے۔ میدہ چھان کر اس میں بیکنگ پاؤڈر، کوکو ملائیں۔ ان اشیاء کو انڈوں کے آمیزے میں اچھی طرح ملائیں۔ پھر پگھلا ہوا مکھن اور ایسنس ملائیں۔ اس تمام مکسچر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیں۔ دونوں حصوں کو چکنائی لگی اوون ٹرے

پر رکھ کر الگ الگ 350 پر 35 سے 40 منٹ تک بیک کریں۔ بچی ہوئی سکر کو دو ٹیبل سپون پانی میں اچھی طرح مکس کریں پھر اس کو پکا کر ذرا گاڑھا کر لیں۔ اس کو بنے ہوئے کیک کے دونوں ٹکڑوں پر اچھی طرح پھیلا دیں۔ کریم کو آئیسنگ شوگر کے ساتھ ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹیں۔ 20 منٹ تک فرج میں رکھ دیں۔ اب کیک کے دونوں ٹکڑوں کو اس کریم کے ذریعے ملائیں۔ ان کے درمین چیری بھی پھیلا دیں۔ بقیہ کریم اور چیری کو کیک کے اوپر سجائیں۔ چاکلیٹ سے بھی اوپر ڈیکوریشن کریں۔ اس کو 8 سے 10 ٹکڑوں میں کاٹ کر سرو کریں۔

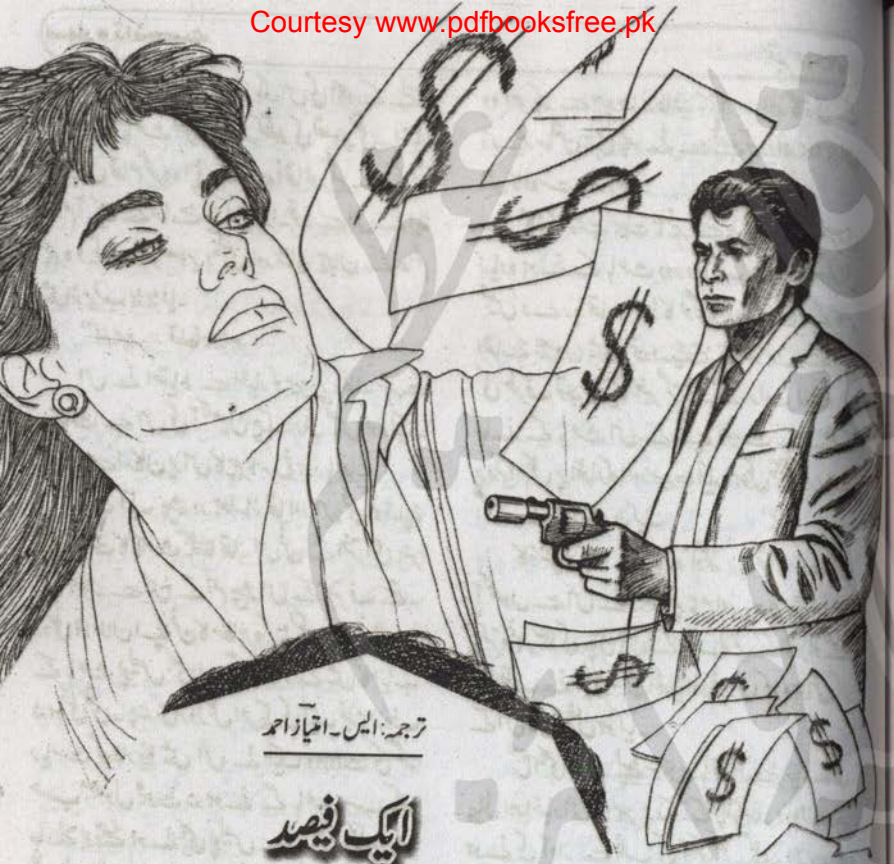

ترجمہ: ایس۔ امتیاز احمد

ایک فیصد

''اس کا مطلب ہے کہ وقت کی سوئیاں میرے منصوبے کے مطابق چل رہی ہیں۔'' فلپ نے کہا ''مجھے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو چلا ہے لیکن مکمل کامیابی تک میرے اصول کے مطابق ایک فیصد ناکامی کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔''

ایک بہروپیے کا ڈرامہ جس میں ناکامی کا ایک فیصد امکان تھا.....

فلپ کی نگاہیں اخبار کے ایک مخصوص حصے پر جمی ہوئی تھیں اور میز پر پڑی چائے کی ٹھنڈی پیالی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ فلپ کی نظروں کا مرکز وہ تین انچ ایک کالم کی تصویر تھی جس کے نیچے تحریر تھا: ''راجہ کنگھ..... جن کی کاروباری ساکھ نے اس بار پھر قصبے کے مقامی بجٹ کو خسارے سے بچا لیا۔''

اور اس کے بعد کوئی نصف کالم مسٹر راجر کی توصیف میں چھپا ہوا تھا جس میں قصبے کے شیرف کا اظہار تشکر بھی شامل تھا۔

فلپ کے لئے اس توصیفی بیان اور اظہار تشکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ اس کی نگاہ کے لئے تو کشش کا باعث صرف راجر کنگھ کی تصویر تھی۔ اخبار ہاتھ میں تھام کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمرے کے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ غور سے اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ پھر تصویر دیکھی اور شاید ہیجان کے عالم میں زیرلب بڑبڑایا۔

"ہو بہو..... قطعاً ہو بہو....."

اس نے احتیاط سے اخبار کو میز پر رکھا۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ایک عجیب سے امکان پر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

فلپ ایک پیشہ ور جعلساز تھا اور اس فن کو اپنے لئے عزت کا باعث سمجھتا تھا۔ اس فن کے اختراعی ہنر میں ہمیشہ سے اس کے ہم پیشہ اس کے معترف تھے۔ وہ علی الاعلان اپنے فن کا مظاہرہ کرتا لیکن ناکافی ثبوت کے باعث پولیس کبھی اسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ چند ہی روز قبل امریکہ کی ایک غیر معروف ریاست کوسٹاریکا میں اس نے ایک واردات کی مگر حسب معمول ثبوت نہ ہونے کے باعث سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پولیس بے بس تھی۔ لیکن کچھ لوگ عدالتوں میں ثبوت مہیا کرنے سے زیادہ اپنے قوت بازو کے بل پر فیصلے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کو اس کی فنکارانہ ہنرمندی کا نشانہ بننا پڑا تھا انہوں نے براہ راست فلپ سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ نتیجتاً وہ جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں اسے بروقت پتہ چل گیا کہ صرف ریاست سے ہی نہیں بلکہ وقتی طور پر اسے ملک سے بھی فرار ہونا پڑے گا کیونکہ وہ لوگ اس کی تلاش میں یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔

اچانک اسے اپنا ایک پرانا ہم پیشہ یاد آیا جو اب اس فنکاری سے تائب ہو کر ایک برطانوی قصبے میں آباد تھا اور شریفانہ زندگی گزارنے کا آرزومند تھا چنانچہ وہ امریکہ سے سیدھا برطانیہ پہنچا..... اور گاڑی کے ذریعے سالٹن نامی چھوٹے سے قصبے کو روانہ ہوا جہاں اس کا دوست رہ رہا تھا۔

گاڑی رات بہت تاخیر سے سالٹن پہنچی۔ سردی زیادہ ہونے کے باعث دور دور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اِکا دُکا لوگ اوور کوٹوں کے کالر اٹھائے جیبوں میں ہاتھ دیئے تیز تیز قدموں سے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر گزر گئے۔ رات زیادہ ہو جانے کے باعث اس نے اپنے دوست سے ملنے کا پروگرام کل پر اٹھا رکھا اور سیدھا ایک ہوٹل پہنچ کر رات گزارنے کا بندوبست کیا۔

کاؤنٹر کلرک بے چارہ اونگھ رہا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے رجسٹر پر نام اور پتہ درج کیا اور کمرہ نمبر ۱۳ کی چابی اس کے حوالے کر کے پھر اونگھنے لگا۔ فلپ نے اٹیچی کیس اٹھایا اور خود ہی کمرہ تلاش کر کے اس میں داخل ہو گیا۔

صبح ابھی وہ منہ لپیٹے سو ہی رہا تھا کہ ویٹر چائے کی پیالی اور اخبار اس کی میز پر رکھ کے چلتا بنا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سے فلپ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اخبار اٹھایا اور سرسری نظروں سے اسے دیکھنے لگا لیکن ابھی اس نے چائے کی پہلی ہی چسکی لی تھی کہ اس کی تمام تر توجہ صرف اس تصویر پر مرکوز ہو کر رہ گئی جس کے نیچے مسٹر راجر کنگھ کا نام چھپا ہوا تھا۔

اخبار کو میز پر پڑے پیپر ویٹ کے نیچے دبا کر وہ سیدھا ٹیلیفون کی طرف لپکا اور کاؤنٹر کلرک سے کہا کہ وہ ایک مقامی تاجر سے بات کرنا چاہتا ہے جس کا نام جون بریڈی ہے لیکن اس کا ٹیلیفون نمبر اس کے پاس محفوظ نہیں ہے۔

"کوئی بات نہیں جناب۔" کاؤنٹر کلرک نے مودبانہ جواب دیا۔ "میں ڈائریکٹری دیکھ کر نمبر ملائے دیتا ہوں۔"

فلپ کو چند لمحے انتظار کرنا پڑا اور پھر دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"جون بریڈی، سپیکنگ۔ ہیلو!"

"ہیلو جون!" فلپ نے جوش مسرت سے کہا "میں فلپ بول رہا ہوں..... فلپ سیکل..... پہچانا مجھے؟"

ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی اور پھر جان کا قہقہہ سنائی دیا "ارے فلپ..... تم یہاں؟"

"ہاں..... بالکل یہاں تمہارے شہر میں۔ وہ سنا نہیں تم نے یار زندہ صحبت باقی..... تو تم سے آن ہی ملے نا آخر۔" فلپ نے جوابی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "رات ہی یہاں پہنچا ہوں اور اب تمہاری دید کا مشتاق ہوں....."

"تو پھر دیر کیسی۔ فوراً چلے آؤ میرے پاس تم ایسے مفت خوروں کے لئے بہت جگہ ہے۔" جون نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فلپ نے سنجیدہ لہجے میں کہا "کچھ دیر پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ پہلے تمہیں ٹیلیفون کروں گا اور پھر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن اب ایسا ممکن نہیں۔"

"کیوں.....؟" جون نے حیرانی سے پوچھا..... "ایسی بھی کیا فوری تبدیلی آ گئی ہے تمہارے خیالات میں.....؟"

"جون۔ تم فوراً میرے پاس ہوٹل میں چلے آؤ..... ساری تبدیلی خود بخود تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ میرے کمرے کا نمبر ۱۳ ہے۔ کاؤنٹر کلرک سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ تم سیدھے کمرے میں چلے آنا۔" فلپ نے سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے کہا۔

سولہویں منٹ پر فلپ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے اُٹھ کر پہلے دروازہ کھول کر تھوڑی سی درز پیدا کی اور باہر جھانک کر یقین کر لیا کہ آنے والا جون ہی ہے اور پھر دروازہ کھول دیا۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملانے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد جون بولا "قصہ کیا ہے فلپ! تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔"

"قصہ.....!" فلپ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور اخبار اُٹھا کر جون کے سامنے پھیلا دیا "بس یہ قصہ ہے۔" اس نے راجر کنگھ کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں کیا ہے؟" جون نے بے دھیانی میں تصویر دیکھتے ہوئے کہا "یہ راجر کنگھ کی تصویر ہے۔ میرا کاروباری رقیب..... واحد رقیب....." لیکن پھر اس نے اچانک تصویر سے نظریں ہٹا کر فلپ کی طرف دیکھا "ارے! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ اس کی شکل تو تم سے بہت مشابہ ہے۔"

"تم اسے جانتے ہو جون؟" فلپ نے پوچھا۔

"بالکل جانتا ہوں..... اچھی طرح جانتا ہوں..... ہر سمجھ دار آدمی اپنے دشمن کو جانتا ہے۔" جون نے دانت پیستے ہوئے کہا "یہ واحد شخص ہے جس کے باعث میرا کاروبار خسارے کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ بھی آرائشی ظروف کا کاروبار کرتا ہے اور میں بھی لیکن سرمایہ زیادہ ہونے کے باعث اس نے منڈی پر قبضہ جما رکھا ہے اس لئے میرا مال فروخت سے رہ جاتا ہے۔" جون رنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا "لیکن تمہاری اور اس کی مشابہت کے علاوہ اس تصویر میں اور کیا اہم بات ہے؟" وہ سوچ رہا تھا فلپ نے اسے یہ تصویر کیوں دکھائی ہے..... وہ فلپ کے پرانے دنوں کا ساتھی تھا اور اس کی فنکاری کا مداح۔

"پھر.....؟" اس نے پائپ سلگاتے ہوئے آنکھ دبا کر فلپ سے پوچھا "اس بار کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ نیک ہے۔" فلپ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "اور کامیابی کا ننانوے فیصد امکان بھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سنو فلپ!" جون نے کہا "تم جانتے ہو میں یہ دھندا چھوڑ چکا ہوں....." جون ایک لمحے کو رُکا..... لیکن تمہاری دوستی اور راجر سے رقابت کے باعث ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہوں..... مگر پہلے یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"میرے ذہن میں ہمیشہ بہت کچھ ہوتا ہے۔" فلپ نے کہا اور اسے اپنے تازہ ترین پروگرام کے بارے میں بتانے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ منصوبے کی تفصیلات طے کرتے رہے اور فلپ بولا..... "تو پھر طے؟"

"بالکل طے....." جون نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے میں نے ہمیشہ تمہارے ذہن کی داد دی ہے لیکن اس بار تو تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اس شہر میں صرف ایک شخص ہے جس سے میرے کاروباری تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے لیکن اب وہ ایک شخص بھی نہیں رہے گا۔"

فلپ نے اپنے اٹیچی کیس سے چند ضروری چیزیں نکالیں اور اسے وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس نے اپنا ہیٹ ماتھے پر جھکا رکھا تھا جس کے باعث اس کا چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا۔ جون اس کے ساتھ نہیں تھا وہ بیس منٹ قبل اس کمرے سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت فلپ نے خاص طور پر احتیاط کی کہ کاؤنٹر کلرک یا کسی ویٹر کی نگاہ میں آئے بغیر ہوٹل سے باہر نکل جائے۔ باہر نکل کر اس نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد اسے جون کی گاڑی دکھائی دی۔ وہ ڈگی سے ٹیک لگائے فلپ کا انتظار کر رہا تھا۔

کوئی دس منٹ کے بعد گاڑی قصبے کے مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی نسبتاً ایک غیر آباد علاقے میں چھوٹے سے مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ وہ مکان ہے جہاں میں اپنے کاروباری مہمانوں کو ٹھہراتا ہوں۔" جون نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا "لیکن وہ مہمان ایک مخصوص وقت میں یہاں آتے ہیں آج کل یہ بالکل خالی پڑا ہے اور یہاں بیٹھ کر تم اطمینان سے اپنے منصوبے پر عمل کر سکتے ہو۔"

دونوں اندر داخل ہوئے۔ تین چار کمروں پر مشتمل ایک معقول سا چھوٹا مکان تھا۔ ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون بھی موجود تھا۔

"بالکل ٹھیک۔" فلپ نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا..... "یہ جگہ بالکل مناسب ہے یہاں کسی کے آنے یا ملنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے جون!" فلپ نے ایک لمحہ ٹھہر کر جون کی طرف دیکھا "تم بھی یہاں آنے کی بجائے ٹیلیفون پر ہی رابطہ رکھنا۔ تمہارے یہاں بار بار آنے سے کسی قسم کا شک پیدا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں اس کی گنجائش تو ہے۔" فلپ نے سوچتے ہوئے کہا..... "اب..... سب سے پہلا کام جو تمہیں کرنا ہے وہ کسی پرائیویٹ سراغ رساں کا بندوبست ہے۔ کیا اس قصبے میں....."

"ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔" جون نے فلپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کیا اس قصبے میں تمہیں آدمی بستے ہوئے نظر نہیں آتے اور جہاں آدمی آباد ہوں وہاں دنیا کا کوئی بھی واقعہ ظہور میں آ سکتا ہے اور پھر نتیجے میں ہر طرح کے لوگ بھی یہاں ہوں گے۔" اس نے ٹیلیفون کے نزدیک جا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو! مارک اتھن سپیکنگ۔" کسی نے دوسری طرف سے کہا۔

"ہیلو مارک!" جون نے اپنا تعارف کرتے ہوئے کہا "میں جون بول رہا ہوں جون بریڈی۔"

"اوہ! صبح بخیر مسٹر جون۔" مارک نے خوش دلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا۔ ”آج کیسے صبح ہی صبح یاد فرمایا آپ نے..... خیریت تو ہے؟“

”ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے مارک!“

جون نے براہ راست مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا..... ”اور یہ کام کچھ ایسا ہے کہ تمہارے علاوہ میں کسی اور شخص پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔“

”؟آپ بلا جھجک فرمایئے مسٹر جون!“ مارک نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا ”میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔“

”تم راجر کنگھ کو تو جانتے ہو اس قصبے کا سب سے بڑا تاجر.....“ جملے کا آخری حصہ ادا کرتے وقت جون کے لہجے میں طنز کی چبھن مارک نے خاص طور پر محسوس کی۔

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر جون۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مسٹر راجر اور آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ جون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا..... ”کیا تم راجر کے بارے میں مکمل تفصیلات مجھے پہنچا سکتے ہو مارک!“

”آپ کا مطلب ہے کہ مسٹر راجر کی زندگی کی مکمل تفصیل.....“ مارک کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ہاں مارک! وہ سب باتیں جو اپنے بارے میں خود راجر کو معلوم ہیں یا اس کے جاننے والوں کے علم میں ہیں۔“ جون نے کہا ”لیکن تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ کافی مشکل کام ہے۔“

”اوہ! ایسی بات نہیں ہے مسٹر جون! آپ کی اطلاع کے لئے بتاتا ہوں کہ اس قصبے میں آباد ہر شخص کے بارے میں ابتدائی معلومات تو میرے پاس محفوظ ہیں۔ باقی باتیں ضرورت پڑنے پر معلوم ہو جاتی ہیں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی بات سمجھ چکا ہوں۔ ساری تفصیلات آپ کو پرسوں شام تک مل جائیں گی.....“ مارک نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر بولا..... ”لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں مسٹر جون کہ معاملہ کیا ہے.....؟“

”کوئی خاص بات نہیں مارک۔“ جون نے کہا ”لیکن اگر اس کا جاننا تمہارے لئے ضروری ہے تو بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“

”کچھ ایسا ضروری بھی نہیں مسٹر جون۔“ مارک نے کہا ”میں تو صرف ذاتی معلومات کے لئے پوچھ رہا تھا..... لیکن خیر چھوڑیئے۔“

”شکریہ مارک! تم جانتے ہو کہ تم پر کتنا بھروسہ ہے اس لئے یہ کام میں نے تمہارے سپرد کیا ہے۔ برائے مہربانی جلد از جلد اسے نمٹانے کی کوشش کرنا۔ تمہاری فیس مجھے معلوم ہے اور تمہیں اس سے کچھ زیادہ ہی ملے گا۔“

”شکریہ مسٹر جون۔“ مارک کی آواز سنائی دی..... ”لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ میں صرف اپنی مقررہ فیس لوں گا۔“ اور اس کے ساتھ ہی ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”چلو یہ کام بھی ہوا۔“ جون نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا ”لیکن مجھے خدشہ ہے مارک کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہو جائے۔“

اگلے دن شام سات بجے کے قریب مکان کی کال بیل سنائی دی۔ فلپ اس وقت کمرے میں بیٹھا اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جون نے ٹیلیفون پر آنے کی اطلاع دے دی تھی پھر بھی فلپ نے احتیاط ضروری سمجھی اور براہ راست دروازہ کھولنے کی بجائے کھڑکی کی اوٹ سے

پہلے کال بیل بجانے والے کو دیکھا۔ وہ جون ہی تھا۔

”مارک کل سہ پہر تک بقیہ تفصیلات بھی ہمیں مہیا کر دے گا۔“ جون نے ایک مختصر سی فائل فلپ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ”فی الحال یہ معلومات اس نے اکٹھی کر لی ہیں۔“

”بہت اچھے۔“ فلپ نے فائل لے کر غور سے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ ”ان معلومات نے تو میرا کام بہت آسان کر دیا ہے۔“

فائل میں موجود کاغذات پر راجر کی موجودہ عمر اس کا قد، جسامت کے بارے میں اور دیگر عادات کے متعلق تفصیلاً درج تھا..... لیکن ایک بات جس نے فلپ کا کام واقعی آسان کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ راجر عادت کا بہت چڑچڑا تھا اور بعض دفعہ تو نوبت بدمزاجی تک پہنچ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی کاروباری مقبولیت کے باوجود اس کا حلقہ احباب بہت محدود تھا بلکہ جن لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے بھی، ان کی نوعیت بیشتر کاروباری تھی۔ ذاتی دوستی کا متحمل ہونا اس کے لئے خاصا دشوار مرحلہ تھا۔ اس کی ساری وجہ اس کی بدمزاجی تھی۔ چنانچہ فلپ کے لئے یہ سر درد ختم ہو گیا تھا کہ وہ راجر کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل کرے۔

فائل کی تفصیلات میں یہ بات بھی درج تھی کہ راجر ناک سے آواز نکال کر بولتا ہے جبکہ فلپ سمجھتا تھا کہ وہ خاصا خوش آواز شخص ہے لہٰذا اسے وقتی طور پر اپنی خوش الحانی کو خیرباد کہہ کر ناک سے بولنے کی مشق کرنا پڑی۔

اگلے دن شام ڈھلے جون پھر ایک فائل بغل میں دبا کر پہنچا تو فلپ مختلف تفصیلات کو ذہن نشین کرنے میں منہمک تھا۔

”یہ رہیں وہ باقی معلومات جو تمہارے لئے ضروری اور اہم ہیں۔“ جون نے کہا۔

فلپ نے فائل لے کر میز پر رکھ لی۔ ”بہت بہت شکریہ جون۔“ اس نے راجر کی نقل اُتارتے ہوئے ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا ”تمہاری مدد کے بغیر میں یقیناً اس معاملے پر سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ عمل کرنا تو بعد کی بات ہے۔“

”بہت خوب۔“ جون نے کہا ”تمہاری آواز سن کر تو کوئی شخص بھی شک نہیں کر سکتا کہ تم راجر نہیں ہو۔“

جون کے رخصت ہونے کے بعد فلپ نے اس فائل کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا جو ابھی اسے ملی تھی۔ ان بقیہ تفصیلات میں کچھ راجر کے کاروبار اور کچھ ذاتی زندگی کے بارے میں درج تھا۔

راجر کنگھ جرمنی سے ترک وطن کر کے برطانیہ پہنچا تھا اور اپنے ساتھ لائے ہوئے محدود سرمائے کے ساتھ اس نے اس چھوٹے سے قصبے میں آرائشی ظروف ڈھالنے کی ایک فیکٹری قائم کی اور بعد میں یہ کاروبار اتنا پھیل گیا کہ راجر اس قصبے کا سب سے بڑا تاجر بن گیا۔ طبیعت کے اعتبار سے وہ ایک قناعت پسند آدمی تھا چنانچہ اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس قصبے کو چھوڑ کر کسی بڑے شہر میں جا کر کاروبار کو زیادہ وسعت دے اور زیادہ دولت کمائے لیکن بہرحال اس قصبے میں رہتے ہوئے بھی اس کی آمدنی کافی معقول اور بعض لوگوں کے نزدیک تو قابل رشک تھی۔

دس سال پہلے وہ یہاں آیا تھا اور تین سال پہلے اس نے اس قصبے کی حسین ترین عورت سونیا سے شادی کی جو دراصل اس سے پہلے جارج کی بیوی تھی۔ جارج، راجر کے دفتر میں کیشیئر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن اچانک ایک دن خرد برد کے الزام میں پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی اور معاملہ اتنا سنگین ہو گیا کہ جارج کو پانچ سال کی سزا ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرائیویٹ سراغ رساں مارک نے ان تفصیلات کے ساتھ ایک ذاتی نوٹ بھی تحریر کیا تھا جس کے مطابق جارج پر خرد برد کا الزام غلط تھا اور راجر نے جان بوجھ کر اسے جعلی کیس میں پھانس کر قید کروا دیا تھا کیونکہ جارج کی بیوی سونیا میں وہ دلچسپی لیتا تھا اور خود سونیا بھی اپنی فضول خرچیوں کے باعث ایسے ہی کسی شخص کی تلاش میں تھی چنانچہ جارج کا مقدمہ ابھی زیرِ سماعت ہی تھا کہ راجر کے کہنے پر سونیا نے عدالت کے ذریعے جارج سے طلاق حاصل کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایسے کسی شخص کی بیوی کہلانا پسند نہیں کرے گی جس پر بددیانتی کا الزام ہو اور جارج کی سزائے قید کے دو ہی ماہ بعد اس نے راجر سے شادی کر لی تھی۔ جارج کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت چراغ پا ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ اس بات کا انتقام ضرور لے گا۔

اطلاع کے مطابق جارج ابھی تک جیل میں تھا اور ابھی اس کی رہائی میں دو سال کا عرصہ باقی تھا۔

"دو سال....." فلپ نے مارک کا لکھا ہوا نوٹ پڑھتے پڑھتے ٹھہر کر زیرِ لب کہا "دو سال کا عرصہ تو بہت زیادہ ہے۔ رہائی کے بعد اگر جارج کے سر پر راجر کے انتقام کا بھوت سوار ہوا بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا یا ممکن ہے دس دن۔ اس کے بعد تو میں کاروبار بیچ کر کسی پر سکون سے ملک کے ساحلی علاقے میں شریفانہ زندگی شروع کر دوں گا۔"

اس رات فلپ نے آنکھ نہ جھپکی۔ تمام رات وہ دونوں فائلوں کی تفصیل ذہن نشین کرتا رہا تاکہ کسی بھی معاملے میں تشنگی کا کوئی پہلو نہ رہے۔ صبح ساڑھے سات بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ جون اور فلپ کے درمیان ٹیلیفون پر گفتگو کا طے شدہ وقت تھا۔ فلپ نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو فلپ" جون کی آواز سنائی دی "تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"نہیں ابھی نہیں، کیا کوئی خاص بات ہے؟" فلپ کی آواز میں رات بھر کی بیداری اپنی تھکن ظاہر کر رہی تھی۔

"ہاں! کافی اہم۔" جون نے کہا "میں چند لمحوں میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد کال بیل سنائی دی۔ فلپ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ جون اخبار تھامے دروازے پر کھڑا تھا۔

"تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ سونیا کا پہلا خاوند جارج جیل میں ہے۔"

"ہاں۔" فلپ نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا "اور میں اس پر کافی غور بھی کر چکا ہوں۔"

"لیکن اب اس پر زیادہ دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔" جون نے اخبار پھیلاتے ہوئے کہا "کل رات جیل کی اس بیرک میں آگ لگ گئی ہے جہاں جارج قید تھا۔ نچلی منزل کے قیدیوں کو تو بچا لیا گیا ہے بس چند ایک کو معمولی زخم آئے ہیں لیکن ایک بلاک کی اوپر والی منزل بری طرح جل کر راکھ ہو گئی ہے اور جارج اسی بلاک کی اوپر کی منزل میں قید تھا۔ کل دس قیدی اس جگہ مقید تھے۔ یہ دیکھو اخبار نے ان کے نام اور تصاویر بھی شائع کی ہیں۔ ان دس میں سے نو کی لاشیں ایسی مسخ شدہ حالت میں ملی ہیں کہ دیکھی نہیں جاتیں۔ ان کی پہچان تو بعد کی بات ہے بعض کے تو مختلف اعضاء بھی جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ ملبہ بھی ہٹایا جا رہا ہے..... دسویں لاش بھی وہیں کہیں ہو گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ....." فلپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میرا مطلب ہے کہ خس کم جہاں پاک۔" جون نے ہنستے ہوئے کہا "اس شہر میں راجر کا ایک ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانی دشمن تھا جس کی طرف سے تمہیں یعنی نقلی راجر کو بھی خطرہ تھا لیکن اب عیش کرنا اور کھل کر کھیلنا۔ اس شہر میں اب تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وقت کی سوئیاں میرے منصوبے کے مطابق چل رہی ہیں۔" فلپ نے کہا "مجھے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو چلا ہے لیکن مکمل کامیابی تک میرے اصول کے مطابق ایک فیصد ناکامی کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔"

وہ تمام دن بھی فلپ نے اس مکان میں بند رہ کر گزارا۔ اس دوران میں جون سے ٹیلیفون پر گفتگو کر کے اس نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے دی۔

مارک کی فراہم کردہ معلومات میں درج تھا..... کہ راجر کنگھ علی الصبح سیر کا شوقین ہے۔ وہ منہ اندھیرے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر اس مصنوعی جنگل تک ضرور جاتا ہے جو پرندوں کی افزائش نسل کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس وقت کم ہی لوگ وہاں دیکھنے میں آتے ہیں اور اکثر تو دور دور تک کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا اور فلپ اسی تنہائی اور تاریکی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

اس رات جون بھی فلپ کے ہمراہ اس مکان میں رہا۔ دونوں پر ایک ہیجان کی سی کیفیت طاری تھی۔ صبح چار بجے الارم بجتے ہی دونوں غنودگی سے چونک اُٹھے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد دونوں نے چائے کا ایک ایک کپ پیا۔

"تم ناشتہ اپنے گھر جا کر کرنا جون۔" فلپ نے مسکراتے ہوئے کہا "اور میں اپنے گھر جا کر کروں گا۔"

جون کی فوکسی ویگن مکان سے کچھ دور کھڑی تھی۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور گاڑی مصنوعی جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر رینگنے لگی۔ صبح کی سفیدی پھیلنے میں ابھی دیر تھی جب وہ لوگ وہاں پہنچے۔ جون نے خصوصی احتیاط کے ساتھ گاڑی ایک ایسی جگہ پر روکی جہاں گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ویگن کے رُکتے ہی فلپ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بے آواز ریوالور باہر نکالا۔

"بس کچھ ہی دیر میں اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے۔" جون نے ریوالور سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ایک وقت تھا کہ فلپ اور جون دونوں مل کر واردات کیا کرتے تھے لیکن اس دوران بھی ایسے مواقع بہت ہی کم آئے تھے جب انہیں کسی کو جسمانی اذیت پہنچانا پڑی۔ اور اس وقت وہ دونوں درختوں کی اوٹ میں چھپے ایک ایسے شخص کا انتظار کر رہے تھے جو کچھ ہی دیر میں ان کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا تھا۔

فلپ کی نگاہیں اس پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے راجر کنگھ کو نمودار ہونا تھا۔

"جون! تمہیں بعد کا سب پروگرام تو معلوم ہے نا!" اس نے پگڈنڈی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"بہت اچھی طرح۔" جون نے جواب دیا "تم بالکل بے فکر رہو۔ ایک لاش کا غائب کر دینا میرے لئے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر تیار ہو جاؤ۔" فلپ نے سرگوشی کی "وہ آ رہا ہے۔"

جون نے چونک کر دیکھا۔ راجر کنگھ اپنے معمول کے مطابق ہاتھ میں چھڑی لئے بے دھیانی میں ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔

"اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت وہ اکیلا ہے۔" جون نے اپنے دل کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے درمیان کہا۔

"وقت کی سوئیاں....." فلپ نے ایک لمحے کے لئے جون کی طرف دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

راجر اب ان کے کافی قریب پہنچ چکا تھا اور اب

وہ وہاں تھا جہاں پگڈنڈی کے دونوں جانب گھنے درختوں کے باعث آدمی چند لمحوں کے لئے دوسروں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے۔

"گڈ مارننگ مسٹر کنگھ۔" فلپ نے درختوں کی اوٹ سے نکل کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ۔" مسٹر کنگھ نے بے دھیانی میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی نگاہ فلپ کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر پڑی اور حیرت سے اس کا منہ کھل کر رہ گیا.....!

"کون ہو تم.....؟" راجر نے بوکھلا کر پوچھا۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن صبح کی ایک اپنی بھی روشنی ہوتی ہے اور اس روشنی کا پھیلاؤ شروع ہو چکا تھا اور اس دوران راجر کی آنکھیں فلپ کے چہرے کا مشاہدہ کر چکی تھیں۔

"میں تمہارا ہم زاد ہوں راجر....." فلپ نے نہایت سنجیدگی سے کہا "تم نے پہچانا نہیں مجھے؟"

ریوالور کا رُخ راجر کی طرف تھا۔ حیرت اور خوف کا ایک ملا جلا ردعمل اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی عرض کرتا ہوں جناب۔" فلپ نے سر کو خم دے کر مودبانہ انداز میں کہا اور ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز پیدا ہوئی اور راجر کے ماتھے پر ایک تیسری آنکھ نمودار ہو گئی۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس نے منہ کھولا لیکن موت کی تیزدستی نے اسے مہلت نہیں دی اور کوئی آواز پیدا کئے بغیر وہ پشت کے بل گر گیا۔

"جلدی کرو جون۔ وقت بہت کم ہے۔" فلپ نے درختوں کے جھنڈ کی طرف پلٹ کر تیز لہجے میں سرگوشی کی اور لپک کر راجر کے مُردہ جسم سے گون اُتار لیا۔

☆.....☆.....☆

راجر کنگھ حسب معمول سیر سے لوٹا تو اس کی خوبصورت بیوی سونیا بستر پر پڑی کسمسا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرائی۔

"گڈ مارننگ ڈارلنگ۔"

"گڈ مارننگ ڈیئر۔" راجر ایک ہوائی بوسہ اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔

"گڈ مارننگ مسٹر کنگھ۔" ملازمہ نے صبح کی چائے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ۔" چائے لیتے ہوئے راجر مسکرایا۔ "مسز جم! تم آج معمول سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی ہو۔"

ادھیڑ عمر مسز جم اپنے بھدے چہرے اور بدنما دانتوں کے ساتھ ہنسی۔ "آپ اپنی بیگم کو ستانے کے لئے ہمیشہ مجھے ہی کیوں استعمال کرتے ہیں سر؟"

"سب ٹھیک چل رہا ہے....." فلپ نے مسکراتے ہوئے دل میں سوچا۔

معمول کے مطابق اس نے لباس تبدیل کیا۔ ناشتہ کی میز پر مسز جم کو ناشتہ دیر سے لگانے کی شکایت کی اور سونیا کو باتھ روم ہی میں چھوڑ کر دفتر کے لئے نکل آیا۔

اس کے دفتر میں داخل ہوتے ہی سب لوگ مودب اور مصروف دکھائی دینے لگے۔ اس دوران میں کچھ لوگ اس سے کاروباری گفتگو کے لئے آئے لیکن اس نے طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا عذر کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ دو ایک نے معاملے کی اہمیت کے باعث فوری گفتگو پر اصرار کیا تو اس نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے انہیں دفتر کے منیجر سے رجوع کرنے کے لئے کہا۔ ہاں البتہ اس دوران اس نے ایک بار اپنے اکاؤنٹنٹ کو طلب کر کے بینک کے حسابات اور وہاں جمع شدہ رقم کے بارے میں دریافت کیا اور اسے دفتر کا وقت ختم ہونے سے قبل یہ ساری تفصیل مہیا کرنے کا حکم دیا۔ وقت ختم ہوتے ہی لوگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ایک کر کے دفتر سے رخصت ہونے لگے۔ راجر کی میز پر مالی حسابات کی فائل پڑی تھی جو کچھ دیر پہلے اکاؤنٹنٹ اس کی میز پر رکھ گیا تھا۔

راجر آخری آدمی تھا جو دفتر سے رخصت ہوا۔ دفتر کے چوکیدار نے ادب سے اسے سلام کیا اور ایک طرف ہٹ کر اس کے لئے دفتر کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔ فائل راجر کی بغل میں تھی۔ اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک کر وہ بے مقصد مختلف سڑکوں کے چکر لگاتا رہا۔ فائل کے حسابات کے مطابق ایک خطیر رقم بینک میں موجود تھی اور اب دیر صرف اس بات کی تھی کہ ایک چیک پر دستخط کر کے وہ رقم نکلوالی جائے اور چیک بک راجر کے کوٹ کی جیب میں موجود تھی۔

مصنوعی جنگل سے واپسی کے بعد جون کی فلپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ٹیلیفون پر گفتگو بھی نہ ہوسکی تھی اور جون بہت زیادہ پریشان تھا۔ وہ فلپ کو آج شام کے اخبار میں چھپی ہوئی خبر کے بارے میں بتانا چاہتا تھا جو بہت اہم تھی لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ جون کسی طرح فلپ سے رابطہ قائم کرتا لیکن فلپ نے سختی کے ساتھ جون کو منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود جون سے رابطہ قائم کرے گا اور اب جون اخبار تھامے پریشانی کے عالم میں ٹیلیفون کے سامنے بیٹھا تھا۔

رات گئے راجر کی گاڑی، سونیا لاج میں داخل ہوئی۔ سب ملازم سو چکے تھے۔ صرف بیڈروم میں روشنی ہو رہی تھی اور اس کی بیوی ایک آرام کرسی پر بیٹھی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ راجر کو دیکھ کر اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اتنی تاخیر سے آنے پر وہ اپنے شوہر سے ناراض ہے۔

"سوری ڈیئر!" راجر نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا "بے تحاشہ مصروفیت کے باعث دیر ہوگئی۔"

سونیا نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے بیٹھی اپنے شب خوابی کے لباس کا دامن مسلتی رہی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی نیلگوں روشنی میں شب خوابی کے لباس سے جھانکتا ہوا سونیا کا خوبصورت بدن راجر کے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہا تھا..... اور راجر ہی کیا سونیا جیسی عورت کسی بھی صاحب دل مرد کو اپنے بدن کا اسیر کر سکتی تھی۔

لباس تبدیل کرتے ہوئے فلپ سوچ رہا تھا کہ ایسی خوبصورت رات شاید ہی کبھی اس کی زندگی میں آئی ہو جب بانہوں میں ایک خوبصورت عورت اور ذہن میں آنے والے کل کے انوکھے خواب ہوں۔

کوئی نصف شب کا عمل تھا جب سونیا اور فلپ ایک سحر انگیز خواب گاہ میں ایک دوسرے کے نزدیک دراز تھے۔ سونیا کے سنہری بالوں نے فلپ کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور فلپ کا بازو اس کے نازک بدن پر رینگ رہا تھا۔

"ایک پنتھ دو کاج۔" وہ ذہن ہی ذہن میں سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

"بیوی اور دولت، ساتھ ساتھ۔ قدرت بھی میری مشابہت سے دھوکہ کھا گئی ہے۔"

اور شاید ایسا ہی تھا..... غنودگی کے عالم میں جب وہ سونیا کے بدن کو ٹٹول رہا تھا اور سونیا اسے اپنے شوہر راجر کے دھوکے میں ایک بیوی کی محبت عطا کر رہی تھی..... تو چھناکے کے ساتھ خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ فلپ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے ریوالور کی نال جھانک رہی تھی اور ریوالور کے پیچھے دو آنکھیں۔

سونیا نے کھڑکی سے جھانکنے والے چہرے کو پہچان کر چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس کی طویل چیخ فائر کی گونج میں دب کر رہ گئی۔ فلپ کے سینے سے ایک چشمہ پھوٹ کر بدن کی ڈھلانوں پر پھیل رہا تھا۔

ایک فیصد ناکامی کا امکان کامیاب ہو چکا تھا۔

سیارہ مشورہ کلینک

ڈاکٹر ندیم چوہدری

ڈاکٹر ندیم چوہدری 28 سال سے لاہور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ نے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، آیورویدک سائنس اور یونانی سسٹم آف میڈیسن کا بغور مطالعہ کر رکھا ہے۔ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے آپ تمام طریقہ ہائے علاج میں سے مناسب ترین ادویہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس گروپ کی دوائی تجویز کی جاتی ہے بالکل اسی گروپ کی غذا بھی مریض کو استعمال کروائی جاتی ہے۔ نتیجتاً مریض اپنے مرض سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ ہر طرح کے مرض کا علاج کرتے ہیں لیکن بالخصوص آپ کو معدہ، جگر اور جنسی امراض کے علاج میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہزاروں مریض آپ کے ذریعے سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس فن میں مزید ترقی دے (آمین)

آپ میڈیکل ریسرچ سکالر بھی ہیں۔ آپ کے مضامین کئی نیشنل اور انٹرنیشنل اخبارات اور رسالوں مثلاً حکایت، نوائے وقت، دبئی نیوز وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ نے آپ کی طبی خدمات سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو دعوت دی ہے کہ اپنی طبی قابلیت کے جوہر ان صفحات کی زینت بنائیں۔ اس ماہ کا مشورہ کلینک آپ کے سامنے ہے۔

والدہ بہت وہمی ہیں

اس ماہ کا پہلا خط اختر حسین مغل صاحب کا ہے۔ آپ گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ میری والدہ صاحبہ کی عمر 65 سال سے اوپر ہے۔ وہ کئی بیماریوں کا شکار ہیں۔ بالخصوص معدے کی تیزابیت سے وہ بہت پریشان رہتی ہیں۔ پانچ سال سے ایلوپیتھک دوائیاں استعمال کر رہی ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں۔ تسلسل کے ساتھ ادویات استعمال کرنے کا تعلق ان کے وہمی پن سے ہے۔ وہ کوئی دوسری دوائی استعمال نہیں کرنا چاہتیں۔ جو دوائی وہ استعمال کرتی ہیں اس میں عام طور پر نیند کی دوائی بھی شامل ہوتی ہے جس سے وہ سمجھتی ہیں کہ آرام ہے۔ پہلے مرض معمولی تھا لیکن اب بہت بڑھ چکا ہے۔ اب معدے کے منہ پر درد ہوتا ہے۔ پیٹ کی ہوا بند رہتی ہے۔ جب درد زیادہ ہوتا ہے تو ڈاکٹر درد کو سکون دینے کے لئے بعض اوقات ایک اور بعض اوقات دو ٹیکے تک لگا دیتے ہیں۔ اس سے وقتی طور پر کچھ فرق پڑ جاتا ہے۔ اب بیماری اس قدر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھ چکی ہے کہ میری والدہ بار بار موت کا ذکر کرتی ہیں۔ حد سے زیادہ وہمی ہو چکی ہیں۔ سوچتی رہتی ہیں کہ کل اتنی بار پیشاب آیا تھا اور آج اتنی بار آیا ہے۔ کل اتنی بار ہوا خارج ہوئی تھی اور آج اتنی بار ہوئی ہے۔ کبھی کہتی ہیں کہ زہریلی گولیاں کھا کر مر جاؤں گی۔ کبھی کہتی ہیں نہر میں ڈوب مروں گی یا گاڑی کے نیچے آجاؤں گی وغیرہ وغیرہ۔ ہم وقتاً فوقتاً ان کے ایکسرے اور الٹراساؤنڈ وغیرہ کرواتے رہتے ہیں لیکن تمام رپورٹیں کلیئر آتی ہیں۔ چند ایک رپورٹس آپ کو اس خط کے ساتھ ہی ارسال کی جا رہی ہیں۔ براہ کرم ایسی دوائی تجویز کریں جس سے انہیں جلد افاقہ ہو جائے اور ساتھ ساتھ انہیں نیند بھی بروقت آتی رہے۔ اس عظیم احسان پر بندہ آپ کا ہمیشہ احسان مند رہے گا۔

☆.....اختر بیٹے! آپ کی پریشانی بالکل بجا ہے۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے ماں باپ کے فرمانبردار بیٹے ہیں۔ آپ اپنی والدہ کی جتنی ہو سکے خدمت کریں۔ ان کا ہر حکم بجالائیں اور اگر ان کے منہ سے کوئی ناگوار یا تکلیف دہ بات بھی نکلے تو آپ اس پر بھی صبر کریں۔ ان کی خوراک اور ادویات کا خاص خیال رکھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کریں اور ان کا دل بہلائیں۔ اگر ان کے دل میں کوئی غم ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کیا کریں۔ دوائی کے طور پر آپ اپنی والدہ کو ہومیو دوا (Dr. Reckweg) R-7 ساختہ جرمنی کے 10+10+10 قطرے کھانے کے بعد استعمال کرائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اگر اس طرح مسئلہ حل نہ ہو تو آپ اپنی والدہ کو لے کر تازہ ترین رپورٹس کے ساتھ ہمارے کلینک پر تشریف لائیں۔ تب مزید غور وخوض کے بعد بہترین دوائی تجویز کی جا سکتی ہے۔

کافی حد تک گنجا ہو چکا ہوں

پاکپتن سے عظمت فاروقی لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب اللہ آپ کا بھلا کرے۔ میں آپ کی سلامتی کے لئے ہمیشہ دعاگو رہتا ہوں۔ آپ واقعی دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اللہ آپکی عمر دراز کرے۔ ڈاکٹر انکل عرض یہ ہے کہ میں نزلہ زکام کا پرانا مریض ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میری نظر بھی کمزور ہے۔ ایک مقامی ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لیتا رہا جس سے نزلہ زکام کا تو آرام آ گیا لیکن نظر کی کمزوری ٹھیک نہیں ہوئی حالانکہ میں دوائی کی آٹھ عدد شیشیاں استعمال کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے بال بہت گرتے ہیں اور سر آگے سے کافی حد تک گنجا ہو گیا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھا سا تیر بہدف نسخہ تجویز کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب میری مالی حالت کافی کمزور ہے۔ ازراہ کرم کوئی اچھا اور کم قیمت نسخہ تحریر کیجئے گا۔ یہ بھی بتائیے کہ کیا نظر کی کمزوری اور گرتے بالوں کی دوائیں اکٹھی استعمال کی جا سکتی ہیں؟ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆..... بیٹا! آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ آپ اپنی صحت بنانے کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ اچھی خوراک استعمال کریں۔ باقاعدہ ورزش کریں۔ بھرپور نیند لیں اور آنکھوں کو سکون پہنچائیں۔ علاوہ ازیں ہومیو دوائی Physostign-6 ساختہ جرمنی خرید لیں اور تین تین قطرے صبح دوپہر شام استعمال کریں۔ ساتھ Vitamin-A باقاعدگی سے استعمال کریں۔ انشاء اللہ آپ صحت مند ہو جائیں گے۔ مزید برآں مندرجہ ذیل اشیاء بازار سے خرید کر گرائنڈ کر لیں:

مغز بادام (1/2 کلو)، سونف (1/2 پاؤ)، کالے چنے (1½ پاؤ)، چینی (ایک پاؤ)، دیسی شکر (1/2 پاؤ)، کالی مرچ (1/2 چھٹانک)

ان چیزوں کا سفوف بنا لیں۔ صبح شام ایک ایک چمچ یہ سفوف ہمراہ دودھ استعمال کریں۔ یہ نسخہ جسم، دماغ اور آنکھوں کو طاقت دیتا ہے۔ اس نسخے سے آپ کا حافظہ بھی بہتر ہو گا اور سر میں درد بھی نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ سردیوں کے موسم میں گاجروں کا جوس کثیر مقدار میں استعمال کیجئے۔ ان ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کو انشاء اللہ بہت جلد مذکورہ بالا مسائل سے نجات مل جائے گی۔

پسینے کی بدبو سے پریشان ہوں

کراچی سے عاصمہ امین لکھتی ہیں: ڈاکٹر انکل السلام علیکم! آپ کے دیئے گئے مشورے عوام الناس کی بہتری کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ سیارہ ڈائجسٹ کے ذریعے ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ میری عمر 19 سال ہے۔ ایک مقامی کالج میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے جسم سے پسینے کی شدید بدبو آتی ہے۔ اگرچہ میں روزانہ کئی دفعہ نہاتی ہوں لیکن ایک دو گھنٹے بعد ہی پسینے کی بدبو آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اب میں کب تک نہاتی جاؤں۔ میں نے اس سلسلے میں کئی ڈاکٹروں اور حکیموں سے رجوع کیا اور بڑا لمبا عرصہ مختلف ادویات استعمال کیں لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ آپ اس سلسلے میں میرے لئے کوئی بہترین دوائی تجویز کریں اور ساتھ ساتھ متبادل علاج سے بھی نوازیں تاکہ میں اس ناگوار صورتحال سے نجات حاصل کر سکوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆.....بیٹی! آپ اس چیز کو ذہن پر سوار نہ کریں۔ بعض افراد میں ایسی صورتحال دیکھنے میں آئی ہے کہ ان کے جسم سے خارج ہونے والی رطوبات سخت بدبودار ہوتی ہیں۔ بہرحال آپ کا یہ مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ ہومیو دوائی Psorinum ہفتہ وار استعمال کریں اور Sulphur-30 دن میں 2 دفعہ استعمال کریں۔ علاوہ ازیں آپ نیم کے پتے حاصل کریں۔ تین مٹھی بھر پتوں کو آٹھ گلاس پانی میں ڈال کر خوب پکائیں۔ ٹھنڈا کر کے چھان کر رکھ لیں۔ جب نہا چکیں تو نیم کے پتوں والا پانی جسم پر ڈالیں۔ اس پانی کو تولیے سے خشک نہ کریں بلکہ ویسے ہی رہنے دیں تاکہ یہ جسم میں رچ بس جائے۔ اس کے علاوہ نیم کے پتوں کو پیس کر پاؤڈر بنا لیں اور اس پاؤڈر کو جسم پر ملیں۔ اس کے علاوہ بازار سے میتھی دانہ خرید لیں۔ دو پیالی پانی میں ایک چمچ میتھی دانہ ڈال کر پکائیں۔ جب ایک پیالی پانی رہ جائے تو ڈھانپ کر چائے کی طرح دم دیجئے۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں تھوڑی سی چینی ڈال کر پیجئے۔ صبر و استقلال سے علاج کریں۔ کچھ عرصے بعد لازمی فرق محسوس ہو گا۔

سر کی جوؤں سے پریشان ہوں

کوٹلی آزاد کشمیر سے کنول اشرف کا خط آیا ہے۔ آپ لکھتی ہیں کہ ہمارا پورا خاندان سیارہ ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں دیئے گئے تمام مضامین بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور قارئین کے لئے زندگی کے ہر میدان میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیارہ مشورہ کلینک بھی بہت اچھی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سیارہ ڈائجسٹ کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ ڈاکٹر انکل ہم چھ بہنیں ہیں اور ہم سب کے سر میں بے تحاشا جوئیں ہیں۔ ہم نے کئی قسم کے شیمپو اور تیل استعمال کئے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات عارضی طور پر فرق پڑ جاتا ہے۔ ہر وقت سب کے سامنے سر کھجاتے ہوئے بہت شرم آتی ہے۔ خارش کر کر کے سر میں زخم بھی بن چکے ہیں۔ مہربانی کر کے کوئی بہتر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوائی تجویز فرمائیں اور ساتھ ساتھ متبادل علاج بھی بیان فرمائیں۔ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

☆.....بیٹی! دعا کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کے سروں میں جوؤں کی موجودگی واقعی ایک پریشان کن مسئلہ ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ ہومیو دوائی Psorinum ہفتہ وار استعمال کریں اور Vinla Minar-30 دن میں 3 بار استعمال کریں۔ مزید برآں آپ کسی پنسار سٹور سے پرانی اور خشک نیم کی گولیاں خرید لیں اور انہیں اچھی طرح باریک پیس لیں۔ دوپہر کے وقت دو پیالی پسی ہوئی گولیاں گرم پانی میں اس طرح بھگو دیں جس طرح مہندی بھگوتے ہیں۔ مغرب کے بعد یہ مواد سر کے بالوں میں اچھی طرح جڑوں تک لگائیں۔ آدھے گھنٹے میں وہ تھوڑا سا خشک ہو جائے گا۔ اب سر پر کوئی پلاسٹک کا لفافہ چڑھا لیں اور اوپر کوئی پھٹا ہوا دوپٹہ باندھ کر سو جائیں۔ صبح اٹھ کر سر دھو لیں۔ یہ عمل ہفتہ میں تین بار دہرائیں۔

تقریباً دو تین ہفتوں کے استعمال سے ساری جوئیں مر جائیں گی اور انشاء اللہ دوبارہ پیدا نہیں ہوں گی۔

اس کے علاوہ ایک پاؤ نیم کے تازہ پتے حاصل کریں اور انہیں آدھا کلو سرسوں کے تیل میں جلائیں۔ پہلے تیل گرم کریں اور پھر تھوڑے تھوڑے پتے ڈالتی جائیں۔ جب سیاہ ہو جائیں تو نکال کر دوسرے پتے ڈال دیں۔ اس میں تھوڑے سے مہندی کے پتے بھی جلائے جا سکتے ہیں۔ یہ تیل دن میں بالوں پر لگائیں۔ بال مضبوط اور گھنے ہوں گے۔ سر کے زخم بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

گریپ فروٹ کے فائدے

رنگ پورہ سیالکوٹ سے اشرف علی بٹ نے خط لکھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ مجھے گریپ فروٹ بہت پسند ہے۔ آپ اس کے فوائد کے بارے میں راہنمائی فرمائیں۔

☆.....جناب بٹ صاحب! آپ کی پسند واقعی بہت اچھی ہے۔ دوسرے سٹرس پھلوں کی طرح یعنی مالٹا، کینو اور لیموں کی طرح گریپ فروٹ بھی انتہائی خوشبودار اور غذائیت سے بھرپور پھل ہے۔ سیڈلیس قسم زیادہ بہتر ہوتی ہے کیونکہ اس میں عموماً شوگر، کیلشیم اور فاسفورس زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ گریپ فروٹ کو دوسرے پھلوں اور سبزیوں کے ساتھ عموماً سلاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کو دو برابر حصوں میں کاٹ کر بیج نکال دیئے جاتے ہیں اور چینی ملا کر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد استعمال کیا جاتا ہے۔

گریپ فروٹ نہایت اعلیٰ قسم کا مشتہی پھل ہے جو کہ لعاب دہن اور نظام انہضام میں بہتری لاتا ہے۔ یہ ایک صحت بخش اور مقوی غذا بھی ہے۔

اگرچہ گریپ فروٹ کا شمار ترش اور تیزابی پھلوں میں ہوتا ہے لیکن یہ پھل نظام انہضام کو اساسیت کا اثر دیتا ہے۔ کیمیائی اصول کے مطابق سٹرک ایسڈ انسانی جسم میں عمل تکسید کے بعد اساسیت کو بڑھاتا ہے چنانچہ اس کا جوس نہ صرف تیزابیت کو کم کرتا ہے بلکہ بہت سے دیگر نقائص جو کہ تیزابیت کے باعث پیدا ہوتے ہیں، ان میں بھی فائدہ مند ہے۔

گریپ فروٹ قبض کشا ہے۔ یہ انتڑیوں کو درست اور توانا رکھتا ہے۔ یہ پیچش، اسہال، آنتوں کی سوزش اور نظام انہضام کی دیگر بیماریوں میں بھی فائدہ مند ہے۔

گریپ فروٹ ذیابیطس جیسے موذی مرض میں بھی بہترین شفائی اثرات دکھاتا ہے۔ اگر آپ ذیابیطس کے مریض ہیں تو تین گریپ فروٹ تین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دفعہ روزانہ استعمال کریں۔ اگر آپ مریض نہیں لیکن آپ ذیابیطس میں مبتلا ہونے کا خدشہ محسوس کرتے ہیں تب بھی تین گریپ فروٹ روزانہ استعمال کریں۔ یہ جسم سے نشاستہ اور چربی کی مقدار کو کم کرتا ہے۔

مزید برآں گریپ فروٹ کا جوس بخار کی تمام اقسام میں فائدہ مند ہے۔ یہ پیاس بجھاتا ہے اور بخار کی تپش کو کم کرتا ہے۔ اس میں قدرتی کونین موجود ہوتی ہے جو کہ ملیریا کے علاج کے علاوہ سردی کے بخار میں بھی موثر ہے۔

آدھا گلاس گریپ فروٹ جوس اور آدھا گلاس لیموں کے جوس کو تھوڑے پانی میں ملا کر پئیں تو تھکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔ ایک ہفتے کا لگاتار استعمال انسان کو چاق و چوبند کر دیتا ہے۔ اگر پیشاب مقدار میں کم آتا ہو تو گریپ فروٹ کا جوس استعمال کرنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے پیشاب کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

بچپن میں کتے نے کاٹا تھا

لاڑکانہ سندھ سے عبدالغنی لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب السلام علیکم! میں بہت امید سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے اور آپ کو اسی طرح اپنی مخلوق کی خدمت کرنے کی توفیق دیئے رکھے۔ میں آپ کو اس خط میں اپنی بچپن سے لے کر اب تک کی ہسٹری لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اس کی روشنی میں میرے لئے بہترین دوائی تجویز کر کے مشکور فرمائیں۔

عرض یہ ہے کہ میں ایک بیروزگار شخص ہوں۔ میں نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔ میری عمر 24 سال ہے اور میں غیر شادی شدہ ہوں۔ بچپن میں میری صحت قابل رشک تھی۔ تقریباً 7 سال کی عمر میں مجھے کتے نے کاٹا تھا۔ پھر ہسپتال سے پیٹ میں تیرہ ٹیکے لگے۔ اس سے میرا پیٹ سوج گیا۔ کافی عرصے تک پیشاب لگ کر اور تکلیف سے آتا رہا۔ میں نے والدین کو بھی آگاہ کیا تھا لیکن کوئی علاج نہیں کرایا گیا تھا۔ اس وقت میں جسم میں بہت کمزوری محسوس کرتا تھا چنانچہ میں نے چائے اور پراٹھے بہت زیادہ استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ سخت سردی کے موسم میں بھی مجھے شدید پیاس لگتی تھی۔ میرے معدے کا نظام بھی بہت زیادہ گڑبڑ ہو گیا تھا۔ کئی دفعہ لیٹرین تک پہنچنے سے پہلے ہی شلوار میں پاخانہ نکل جاتا تھا۔ کھٹے ڈکار بھی اکثر آتے رہتے تھے۔ پھر میں نے مختلف طرح کی دوائیاں کھانا شروع کر دیں لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ نکسیر آنی شروع ہو گئی۔ یہ نکسیر ایک لمبے عرصے تک آتی رہی۔ بچپن سے لے کر اب تک سردیوں میں معمولی سردی سے اور گرمیوں میں معمولی گرمی سے اور معمولی شور سے سر درد شروع ہو جاتا ہے۔ سر درد ہر وقت نہیں ہوتا اور نہ ہی آدھے سر میں ہوتا ہے بلکہ پورے سر میں ہوتا ہے۔ بس گرمی یا سردی سے ہوتا ہے۔ موسم بدلتے ہی نزلہ زکام اور کھانسی کا حملہ ہو جاتا ہے۔ پہلے میرے ہاتھ سردیوں میں بھی گرم رہتے تھے۔ جو کوئی بھی ہاتھ ملاتا تھا کہتا تھا کتنے گرم ہاتھ ہیں لیکن آج کل میرے ہاتھ پاؤں سخت ٹھنڈے رہتے ہیں۔ اب جو کوئی بھی ہاتھ ملاتا ہے کہتا ہے کتنے ٹھنڈے ہاتھ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے برف میں لگے ہوئے ہوں۔ گرمیوں میں جب صبح کو سو کر اٹھتا ہوں تو ناک کے اردگرد ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تیل لگا ہوا ہو۔ ناک کے اردگرد اور ٹھوڑی پر سرخ دانے نکلتے رہتے ہیں جیسے خون جمع ہوتا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ پھر کیل کو دبا کر باہر نکالتا ہوں تو سکون ملتا ہے۔ اکثر

داغ بھی پڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بہت سال تک بے تحاشا مشت زنی بھی کی ہوئی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے اس بیماری پر قابو پا لیا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ گال پچکے ہوئے ہیں۔ کندھوں کے درمیان ریڑھ کی ہڈی میں تھوڑا خم آ گیا ہے۔ چہرے پر رونق نہیں ہے۔ آنکھوں میں جوانی کی کشش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرے بال بھی گرتے ہیں۔ بالوں میں سکری بھی ہے۔ اس نے میرے بالوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ براہ مہربانی میرے لئے اچھی سی دوائی تجویز کریں اور اچھی خوراک کے بارے میں بھی راہنمائی فرمائیں۔

☆..... بیٹے دعاؤں کا شکریہ۔ میں نے آپ کا طویل خط پڑھا ہے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ کو اتنی ساری پریشانیاں لاحق ہیں۔ آپ مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ آپ ہومیو دوائی SILICIA-30 ساختہ جرمنی خرید لیں اور اس دوائی کے پانچ قطرے فی خوراک تھوڑے پانی میں ڈال کر روزانہ دن میں ایک بار خصوصاً رات کو سوتے وقت پی لیا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ کشمش، بادام اور مکھن استعمال کریں۔ بکرے کا گوشت بھی ہفتے میں دو مرتبہ ضرور کھائیں۔ نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کریں اور روزانہ ورزش کو اپنا معمول بنائیں۔ اپنی نیند ہر حال میں پوری کریں اور خیالات کو پاکیزہ رکھیں۔ انشاء اللہ آپ کچھ عرصے بعد صحت یاب ہو جائیں گے۔

سر پر لگنے والی چوٹ سے پریشان ہوں

منڈی یزمان بہاولپور سے عمر دراز لکھتے ہیں کہ میں ایک سال پہلے ایک رات کو اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اچانک کوئی دشمن آیا اور اس نے پوری طاقت سے ایک ڈنڈا میرے سر کے بائیں جانب مارا۔ سر سے خون نہیں نکلا لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کافی بڑے بڑے گومڑے پڑ گئے جو کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ سر میں چوٹ کی وجہ سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آنکھیں ہر وقت تھکی تھکی رہتی ہیں۔ ان میں جلن بھی ہوتی ہے۔ آنکھیں ہلکی سی دھوپ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ کنپٹیاں بھاری رہتی ہیں۔ نیند کے بعد بھی جسم سستی کا شکار رہتا ہے۔ اسی وجہ سے میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی ہے حالانکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ میری عمر ابھی صرف 26 سال ہے لیکن میں زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ ہر وقت سر میں درد اور کھچاؤ رہتا ہے۔ سستی اور نیند کا غلبہ مستقل طور پر موجود ہے۔ دائیں جانب دبانے سے چوٹ سے متاثرہ جگہ چبھتی ہے اور بائیں کان میں بھی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ تکیے پر سر رکھنے میں مشکل پیش آتی ہے اور سر کی ایک سائیڈ مسلسل دس بیس سیکنڈ سے زیادہ تکیے پر نہیں رکھی جا سکتی۔ متاثرہ سائیڈ رکھنے پر تو اور بھی مشکل پیش آتی ہے۔ میں نے ہر طرح کا علاج کروایا ہے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ سر درد کے لئے روزانہ 8 سے 10 گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ خدا کے لئے مجھے اس مصیبت اور تکلیف سے نجات دلائیں۔ عمر بھر آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔ میرے لئے بہترین دوائی تجویز فرمائیں۔ شکریہ

☆..... عزیز گرامی! آپ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ آپ کے کسی دشمن نے ڈنڈے کی بھرپور ضرب سے آپ کو نقصان پہنچایا۔ سر کی چوٹ واقعی بڑی خطرناک ہوتی ہے کیونکہ اس سے دماغ کے متاثر ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جو سارے بدن کا کنٹرول ٹاور ہوتا ہے۔ آپ ہومیو دوا

ARNICA-30 اور NAT-SUL PH-30 کو ادل بدل کر کے استعمال کریں۔ ایک دن ایک دوا اور دوسرے دن دوسری دوا کے 5 قطرے فی خوراک تھوڑے پانی میں ڈال کر پیا کریں۔ یہ عمل مسلسل 3 ماہ جاری رکھیں۔ انشاء اللہ آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔

ناریل کے فائدے

چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے عرفان باجوہ نے خط لکھا ہے۔ باجوہ صاحب نے ناریل کے فوائد دریافت کئے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ کیا ناریل ہر عمر کے لوگوں کے لئے فائدہ مند چیز ہے یا بڑی عمر کے لوگوں کے لئے زیادہ ضروری ہے۔

☆......عرفان باجوہ صاحب! ناریل ایک غذائیت سے بھرپور میوہ ہے۔ اس کی بہترین غذائیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ونڈر فوڈ (wonder food) کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں وہ تمام ضروری غذائی اجزاء موجود ہیں جن کی ہمارے جسم کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی غذائی و ادویاتی خصوصیات کی بناء پر اسے زندگی کا درخت (tree of life) بھی کہا جاتا ہے۔ روایتی دیسی غذاؤں اور دواؤں میں اس کا استعمال ہزاروں سال سے جاری ہے۔

ناریل تازہ اور خشک دونوں حالتوں میں ملتا ہے۔ خشک ناریل کو کھوپرا کہتے ہیں۔ یہ سارا سال مارکیٹ میں دستیاب ہوتا ہے جبکہ تازہ ناریل جولائی، اگست اور ستمبر تک مل سکتا ہے۔ اسے کئی طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کوکونٹ ملک (coconut milk)، بٹر (butter)، کریم، آئس کریم، کیک اور بسکٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ناریل کی گری عام طور پر غذا کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں تیل کی اچھی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں غذائی ریشہ، وٹامنز اور نمکیات بھی پائے جاتے ہیں۔

ناریل بیکٹیریا کو ہلاک کرتا ہے جو السر، گلے کی انفیکشن، مسوڑھوں کی تکالیف، پیشاب کی نالی کی سوزش، نمونیہ اور سوزاک وغیرہ کا موجب بنتے ہیں۔ یہ ایسی فنجائی کا خاتمہ کرتا ہے جو رنگ ورم اور دوسری اقسام کی انفیکشن کا باعث بنتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا کام فوری توانائی مہیا کرنا ہے۔ یہ تھکن کو دور کرتا ہے اور جسم میں چستی لاتا ہے۔ یہ ہاضمہ کو ٹھیک رکھتا ہے اور نمکیات اور وٹامنز کے انجذاب کو بہتر بناتا ہے۔ پیٹ کے کیڑوں کو بھی ختم کرتا ہے۔ لبلبہ کو نارمل رکھتا ہے اور انسولین کی پیداوار کو بہتر بناتا ہے۔ ہڈیوں کے بھربھرے پن سے بچاتا ہے اور مدافعتی نظام کو تقویت دیتا ہے۔ کولون، بریسٹ اور دوسرے کینسر سے بچاؤ میں معاون ہے۔ یہ گردے کی خرابیوں کو دور کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بطور مانع تکسیر عامل بھی کام کرتا ہے۔

یاد رہے کہ ناریل کو ایک مناسب مقدار میں ہی کھایا جانا بہتر ہے کیونکہ کسی بھی چیز کا ضرورت سے زیادہ استعمال خرابی پیدا کرنے کا موجب بن سکتا ہے۔ دل اور جگر کی خرابیوں میں مبتلا افراد کو اس کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ اس کا زیادہ استعمال وزن میں اضافے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ایسے لوگ جنہیں نٹس الرجی ہو انہیں ناریل کے استعمال میں احتیاط برتنی چاہیے۔

ہر قسم کے ضدی اور پیچیدہ امراض کے مستقل شافی علاج کے لیے ڈاکٹر ندیم چوہدری سے ان فون نمبرز پر رجوع کریں۔
0333-4450636,0313-4450636

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقشِ فریادی

شمس بازغہ شیروانی

دل میں حقیقتاً دعا مانگا کرتی کہ فیشن بدل جائے اور قمیصیں لمبی ہو جائیں۔ دعا اگرچہ دیر سے قبول ہوئی مگر ہوگئی بلکہ ہوتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ قمیصوں کی لمبائیاں بڑھتے بڑھتے اتنی ہوگئیں کہ دوپٹے بھی اس لمبائی کو پورا کرنے کی غرض سے قمیصوں اور کُرتوں میں غرق ہونے لگے۔

مشاہدہ و ریاضت میں لپٹی باتیں، جن میں سوچنے والوں کیلئے بہت کچھ ہے

احوالِ خاطر

اس برس دبئی میں موسم سرما واقعی ہمیں اپنے پنجاب کے سرما کی یاد دلا گیا۔ گھروں میں ہیٹر (جو کہ نہیں ہیں) اور پاؤں گرم رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ذرا گھر کی کھڑکیاں کھلی رہ گئیں تو تھرتھری سی چھوٹ جاتی۔ دن میں موسم بھلا لگتا لیکن سویرے فجر کے وقت اور سرِ شام سردی بہت بڑھ جاتی۔

فجر کے فوراً بعد جبکہ ابھی خاصا اندھیرا ہوتا، واک پر جانے سے تمام دن طبیعت ہشاش بشاش رہتی۔ صاف فضا، ہر جانب کیاریوں سے سر اُٹھاتے، ہنستے ہوئے پھول، جھومتے درخت، پودے، گنگناتی سبک ہوا اور سب سے بڑھ کر سکیورٹی۔ دل میں کوئی خوف کوئی ڈر نہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بھرپور لطف لینے اور سوچ کو صحیح

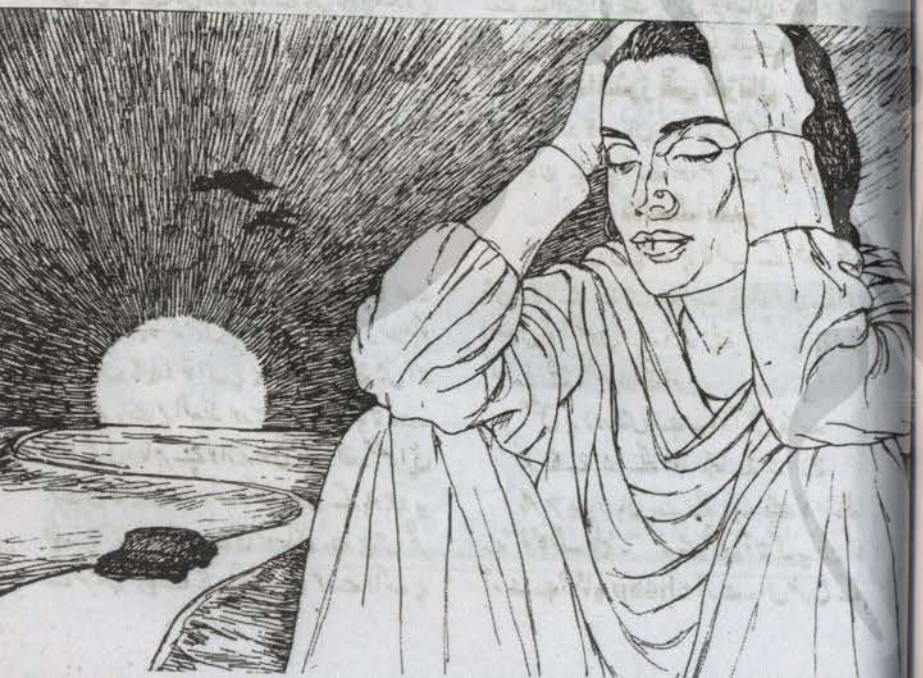

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹریک پر رکھنے کے لئے اور زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے آپ کے آس پاس سکیورٹی اور شہر میں امن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ قانون، قاعدہ ہو تو زندگی میں ایک قرینہ سا رہتا ہے۔

کسی نے کہا ''یہاں ہر کوئی خریداری میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔'' میں نے سوچا، خریداری تو بہت ضروری ہے۔ اگر خریداری نہ ہو تو کاروبار میں مندی آئے گی اور گھروں کے چولہے ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ ہاں مگر ہر کام میں اعتدال بھی ضروری ہے۔

''نہ ہاتھ گلے سے باندھ لیجئے، نہ اتنا کھلا چھوڑ دیجئے کہ خود محتاج ہو بیٹھیں۔'' (القرآن)

ایک بات جو یہاں بہت بھلی لگتی ہے وہ ہے ہر جگہ خوبصورت مساجد، پروقار مینارے، پروقار ماحول، ایک ہی وقت میں اذان ہوتی ہے، مزہ آ جاتا ہے۔ صبح کی حمد و تسبیح کے لئے آپ پرسکون ماحول میں دل لگا لیتے ہیں ورنہ ہمارے ہاں لاؤڈ سپیکرز پر بعض صاحب مساجد اس قدر پڑھتے ہیں اور طرح طرح کی آوازوں میں پڑھتے ہیں کہ خشوع مشکل ہو جاتا ہے اور اگر کہیں نعت خوانی ہو تو فلمی دھنوں کے ماہر نعت خواں ہر دھن آزما ڈالتے ہیں اور پھر اتفاقاً وہ دھن آپ کو بھی آتی ہو تو کہاں کا خشوع اور کہاں کا خضوع؟

لوکل معاشرے میں آپس کے سلام کا بہت رواج ہے جیسا کہ ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ سلام کو آپس میں پھیلاؤ تو اس پر یہاں عمل دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر بات پر الحمدللہ اور سبحان اللہ کہا جاتا ہے۔ ہر موقع کی دعا ہر بچے کو ازبر ہوتی ہے۔ قصہ مختصر اپنی بہت سی خامیوں اور لاتعداد کمزوریوں کے باوجود یہ ایک پرامن اور قاعدے کی سوسائٹی ہے جہاں فجر کے سرگیں اجیالے میں ایک اکیلی عورت واک پر جائے تو خوف سے سکڑی سمٹی نہیں بلکہ اطمینان اور سکون سے چلتی ہے۔

پبلک پراپرٹی

بجلی کے خلاف ایک بار احتجاج میں پھر مسلسل توڑ پھوڑ دیکھنے کو ملی۔ شاہراہوں پر لگے اچھے خاصے مضبوط barriers اکھاڑنے، پھولوں کے گملے توڑنے، گرانے کے مناظر، جھلستی گرمی میں ٹائر جلانے، پلوشن پھیلانے، پرائیویٹ اور سرکاری پراپرٹی کو نقصان پہنچانے کے مناظر طبیعت پر بہت گراں گزرتے ہیں۔ یہ شاہراہیں، یہ کھمبے، یہ سجاوٹ آپ کی ہے۔ یہ پراپرٹی یا تو پبلک کی ہے یا کسی کی ذاتی ملکیت۔ یہ فضا بھی آپ کی ہی ہے جس میں آپ پلوشن پھیلا رہے ہیں۔ اس میں آپ اور آپ کے بچے سانس لے رہے ہیں۔ پبلک پراپرٹی آپ کے دیئے گئے ٹیکس اور محصولات سے بنی ہے، حکمرانوں کی جیب سے نہیں۔ یہ آپ کی سہولت کے لئے ہے اور پرائیویٹ پراپرٹی کو نقصان پہنچانا تو یوں بھی قابل ستائش نہیں کہ وہ کسی کی ملکیت ہے۔

ڈاکٹرز کی ہڑتال

نہ درد کا درماں ہو، نہ زخم کا مرحم ہو
جان لینے پہ آئے ہو، تم کیسے مسیحا ہو؟

نو کالنگ پلیز

زنانہ لباس کی پشت پر غالب کے اشعار چن چن کر کاڑھے گئے ہیں۔ غالب اپنی شاعری کے اس استعمال کو آنکھوں سے دیکھ لیتے تو گریہ و زاری کرنے لگتے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پھر مزید یاددہانی کے لئے ایک جملے کا اضافہ ہے ''نو کالنگ پلیز۔'' سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سا آرٹ ہے؟ شاید cheap آرٹ۔ اس طرح کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اشعار اور وہ بھی صنف نازک کے لباس پر! اب بھلا خود ہی سر عام دعوت دی اور پھر ”نو کالنگ پلیز“ لکھوا کر دیکھنے والے کو مزید کچھ کر گزرنے کی دعوت دے دی۔ دیکھنے والا نمبر ڈائل کئے بغیر ہی contact کرے گا اور وہ بھی direct۔ ملبوسات پر آپ کچھ بھی لکھوالیں تو پڑھنے والا تو ضرور رُک کر پڑھے گا اور جو پڑھنے میں کمزور ہوا وہ ہجے کر کر کے پڑھے گا۔ یوں جو زیادہ شوقین ہوا وہ اونچی آواز میں پڑھے گا۔ پھر آپ بُرا منائیں گی۔ خود تماشہ بننا اور پھر کال اور eye contact پر پابندی کا تقاضا؟ بات بنتی نہیں۔

ایسے میں والدین، شوہر، سسرال، انکا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے؟ گراوٹ آخر کہاں آئے گی؟ تعلیم عام کرنے اور شاعری کا ذوق اُجاگر کرنے کا کیا خوب طریقہ ڈھونڈا۔ شاید اسی طرح گلی گلی تعلیم ہو جائے۔

ماں

ہر مذہب، ہر معاشرے نے اسے تعظیم و تقدیس دی۔ ہر مفکر، ہر بڑی ہستی نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پیغمبروں کو جنم دینے والی، محبت کے بیان میں دنیا کے بہترین ادب میں سب سے اونچا مقام پانے والی ماں آج کل ایک ٹی وی پروگرام میں اپنی تقدیس کے لئے خود سوالیہ نشان بن گئی ہے۔ ماں کے حوالے سے متواتر دو تین اقساط سے اس قدر ناشائستہ مذاق ہو رہا ہے کہ سر شرم سے جھک جاتے ہیں مگر ادب و معلومات پر انتھک بات کرنے والے میزبانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ شاید انکی ”فرہنگ“ میں ماں کی تقدیس و مقام سے متعلق کوئی معنی کوئی محاورہ نہیں۔ ”ماں“ سے متعلق جگت بازی ہرگز قابل ستائش نہیں ہے۔

شادی کی تجویز

پرانے وقتوں میں شادی کی تجویز کچھ اس انداز میں پیش کی جاتی تھی۔

لڑکا: کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟

لڑکی: اوہ......اتنی جلدی؟

لڑکا: ہاں یا ناں...... جلدی بتاؤ۔ میں دو کشتیوں میں سوار ہوں۔

☆☆☆

ننھی منی کہانی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکے نے ایک لڑکی سے کہا: کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟

”نہیں“ لڑکی نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔

☆☆☆

کیا خوب کہا

اگر میں تمہیں اچھے حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا تو گویا مجھے خدا سے خدانخواستہ اختلاف ہے۔ یہ پُرحکمت بات ایک مخلص دوست نے دوسرے دوست سے کہی۔

اگر ہم اس بات کا مفہوم سمجھ لیں تو دوسروں کی خوشی پر خوش ہونا سیکھ سکتے ہیں اور دوسروں کے درد بانٹنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں......!

خواجہ سرا

اب خواجہ سرا بھی احتجاجی ریلی کے لئے سڑکوں پر آ نکلے۔ یوں تو وہ سڑکوں پر ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔ فل میک اپ، کسا ہوا لباس، جھمکے، ٹھمکے، بے شمار دعائیں، لبوں پر دوسروں کو مسکرا دینے پر مجبور کرنے والے موقع و محل کے لحاظ سے بے ساختہ جملے۔ انسان انہیں کچھ نہ کچھ خیرات دے ہی دیتا ہے۔ ان لوگوں میں حس مزاح کچھ زیادہ ہے یا اپنے خاص ماحول میں مسلسل تربیت فنکاری کا کمال۔

پاک و ہند کے علاوہ اس قسم کی مخلوق (حلیہ کے لحاظ سے) دنیا کے کسی اور ملک، شہر یا گلی کوچے میں شاید ہی دکھائی دے۔ صنف نازک سے مماثلت کی کوشش کرتی مخلوق تو نظر آ جاتی ہے مگر گانے بجانے، تالیاں پیٹتے بے ہنگم میک اپ میں سڑکوں، شاہراہوں پر نہیں ہوتے۔ فلپائن کے لوگوں میں زنانہ حرکات و سکنات کرنے والے اب بہت نظر آنے لگے ہیں لیکن وہ مردانہ لباس میں ہی ہوتے ہیں اور ملازمتیں کرتے ہیں۔ ہسپتالوں، دفاتر، سٹورز وغیرہ ہر جگہ ہی ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے ملازمتیں حاصل کرتے اور ڈھنگ سے کماتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں ان خواجہ سراؤں نے حلیے بدل کر شادی بیاہ اور دیگر تقریبات پر یوں گا بجا کر اور جگتیں کر کے کمائی کرنے کا یہ انداز کب، کیوں اور کیسے اختیار کیا؟ مجھے اس کا کچھ حتمی علم نہیں۔

کچھ تو قدرتاً یہ صنف رکھتے ہیں اور کچھ کو ماں باپ مختلف وجوہات کی بنا پر واہموں پر مبنی مانی ہوئی منتوں کی نظر چڑھا کر اس حال کو پہنچاتے ہیں۔ سکول، مدرسے کی شکل سے بے نیاز، حکومت کی طرف سے کسی بھی سہولت سے محروم یہ مخلوق اپنی دنیا آپ جی رہی ہے۔ ان کی زندگی کو کوئی مفہوم، کوئی مقام دینے کے لئے شاید این جی اوز کو ہی آگے آنا چاہیے۔ اولاً یہ منتوں کی خاطر اولادیں اس طرح بھینٹ چڑھانے کا عمل رُکے اور دوسرے انہیں باعزت زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو۔ انہیں نارمل بچوں کی طرح زندگی دینے کے لئے صحیح ماحول میں پرداخت کی ضرورت ہے تاکہ انہیں بھی تعلیم اور روزگار کی سہولت میسر ہو۔ انہیں اپنے ان گھروں میں رہنا چاہیے جہاں یہ جنم لیں نہ کہ ان کے کرتا دھرتا ٹھیکیدار انہیں اٹھا لے جائیں اور ایک خاص طریقہ سے پروان چڑھا کر کمائی کا ذریعہ بنائیں۔

ہندوپاک کے مسلم سلاطین کے درباروں، خاص طور پر بیجاپور کے عادل شاہی اور دکنی نظام شاہی درباروں میں ان کو امیروں، وزیروں بلکہ سپہ سالاروں کے عہدے دیئے گئے۔ مغلیہ ادوار میں عورتوں کے پردے کے خیال سے ”زنانہ“ میں ان کی خدمات کا باقاعدہ استعمال تھا۔ شاید وہیں سے انکے ہاں زنانہ لباس کے استعمال کا رواج ہوا ہو لیکن بات تو انکے اصلاح احوال کی ہے۔

فیشن

پرانی بات ہے، جن دنوں فیشن کی وجہ سے قمیص نہایت مختصر تھی، میں نے انہی صفحات پر اس حوالے سے الزام درزی پر دھرا تھا کہ

ٹٹ جانے درزی نے......
رکھ لئی میرے جھگے توں ٹاکی

دل میں حقیقتاً دعا مانگا کرتی کہ فیشن بدل جائے اور قمیصیں لمبی ہو جائیں۔ دعا اگرچہ دیر سے قبول ہوئی مگر ہو گئی بلکہ ہوتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ قمیصوں کی لمبائیاں بڑھتے بڑھتے اتنی ہو گئیں کہ دوپٹے بھی اس لمبائی کو پورا کرنے کی غرض سے قمیصوں اور کُرتوں میں غرق ہونے لگے۔ ایک لباس کی تیاری میں دو دو ساڑھیاں کٹوائی گئیں۔ پاجامے کی لمبائی شاعر کے گریبان کی طرح چارگرہ رہ گئی۔ کُرتوں کے دامن پیروں میں اُلجھنے لگے۔ ڈیزائنرز کو عام طبقے کی جیب کا خیال رکھنا پڑے گا۔ کپڑے کے اس بے تحاشا استعمال سے کمانے والوں کو اوور ٹائم لگانا پڑتے ہوں گے۔ ایک زمانے میں آستین پر زور تھا۔ آستین کے پیچ کھلتے تو آستین بازو سے دو گز لمبی ہوتی۔ اب تو یہی کہنا ہے ”بیبیو بس کرو۔ غریب کے کفن کے لئے کچھ کپڑا بازار میں چھوڑ دو۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوطی دیوی

محمد سلیم اختر

نوطی دیوی مصری تاریخ کا اہم کردار ہے، اس کے حوالے سے کئی تاریخی واقعات مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم دور میں اس دیوی کا مندر چوری کے مجرموں کا فیصلہ کرنے کے لیے مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ملزم نے حقیقت میں چوری کی ہوتی تو وہ نوطی دیوی کے سامنے پیش ہوتے ہی پتھر کے بُت میں تبدیل ہوجاتا۔ زیرِنظر تحریر آثارِ قدیمہ کے ماہر تین دوستوں کی کہانی ہے جو تحقیق کی جستجو میں اسی نوطی دیوی کے مندر تک جا پہنچے تھے!

قدیم مصر کی تاریخ سے کشید کردہ حیرت انگیز داستان

زیاد جب خیمے میں داخل ہوا تو یامین اور رشید کھدائی میں برآمد ہونے والی متفرق اشیاء کے معائنے میں مصروف تھے۔ زیاد بربری نسل کا ایک تنومند انجینئر تھا جسے انہوں نے خاص طور سے اس مہم کے لئے ایک دوست کی معرفت قاہرہ سے بلایا تھا۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی کی مہم جس کی ابتدا ایک عجیب اتفاق سے شروع ہوئی تھی گزشتہ ایک ماہ سے جاری تھی جس کے نتیجے میں سطحِ زمین سے بستی کے آثار دریافت ہوئے تھے.....!

زمانۂ طالب علمی سے ہی یامین کو تاریخ اور خاص طور سے قدیم مصر کی پراسرار تاریخ کے مطالعہ کا بے حد شوق رہا تھا۔ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے وطن واپس جانے سے قبل اہرام، ابوالہول اور دوسرے معروف آثارِ قدیمہ کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ یونیورسٹی میں کئی ماہ پہلے اس کی ملاقات ایک سینئر مصری طالب علم رشید سے ہوئی تھی جو قصر فرافرا کا رہنے والا تھا۔ ہم ذوق ہونے کی وجہ سے دونوں کی دوستی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ جب رشید کو اس کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے بڑے اصرار کے ساتھ یامین کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ یامین نے قاہرہ پہنچتے ہی رشید کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ رشید نے فوراً جوابی خط لکھا کہ سردست وہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے اس کے استقبال کے لئے قاہرہ نہیں آسکتا لیکن یامین مصر چھوڑنے سے پہلے قصر فرافرا ضرور آئے۔ یامین نے ایک ہفتہ تک اہرامِ مصر کی سیر کی اور پھر اپنے دوست سے ملنے چل دیا۔ قصر فرافرا..... قاہرہ سے جنوب مشرق میں تین سو میل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا صحرائی شہر ہے جہاں صرف اونٹوں کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے.....

یامین ایک گائیڈ کی ہمراہی میں روانہ ہوا مگر ابھی وہ قصر فرافرا سے پچاس میل کے فاصلہ پر تھے کہ بادسموم کے ایک زبردست طوفان میں گھر گئے۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ یامین کے گائیڈ کے بقول اس نے پوری زندگی میں ایسا طوفان نہیں دیکھا تھا۔ ہوا کے زبردست تھپیڑوں اور بگولوں نے انہیں اپنے راستے سے بھٹکا کر کئی میل مغرب میں ایک پہاڑی سلسلے کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب طوفان گزر گیا اور یامین آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا تو اپنے سامنے چند گز کے فاصلے پر ریت کا ایک بڑا سا گڑھا دیکھا جس میں ایک گول سی چٹان اُبھری ہوئی تھی۔ جب اس نے گڑھے کے اندر اُتر کر قریب سے اس کا جائزہ لیا تو اسے کچھ شبہ سا ہوا کہ جیسے وہ کسی عمارت کا گنبد ہو کیونکہ وہ کوئی ایک پتھر نہیں تھا بلکہ کئی بڑے بڑے پتھروں کو تعمیراتی انداز میں مصالحہ سے جوڑ کر گنبد کی شکل دی گئی تھی..... اس نے مزید ریت اُٹھا کر دیکھا تو گنبد کچھ اور نمایاں ہو گیا مگر وہ زمین کے اندر اتنا گہرا دبا ہوا تھا کہ اسے کھودنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں تھی..... اس دریافت نے یامین کے دل کو جوش سے بھر دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس مقام پر ضرور کوئی قدیم عمارت زمین کی تہوں میں دفن ہے۔ ہوا کے زبردست طوفان نے بگولوں کی شکل میں ریت اُڑا کر دنیا کے سامنے تاریخ کا ایک اور ورق نمایاں کر دیا ہے۔

یامین کے سامنے نہ صرف تاریخی تحقیقات کا ایک سنہری موقع بلکہ شہرت اور ناموری کے وسیع امکانات بھی اُجاگر ہونے لگے۔ اگر یہاں کوئی قدیم شہر دفن ہے تو اس کی دریافت کا سہرا اس کے سر بندھ سکتا ہے۔ وہ خوشگوار اُمیدوں اور تابناک مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا رشید کے پاس پہنچا۔ اسے اپنی دریافت کے بارے میں بتایا۔ رشید نے اس کے ساتھ جا کر گنبد کو دیکھا اور یامین کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً مصری محکمہ آثار قدیمہ کو اس جگہ کھدائی کی اجازت حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ عام حالات میں محکمہ آثار قدیمہ خود اس قسم کے کام انجام دیا کرتا ہے..... لیکن جنگ عظیم ختم ہوئے چند ہی سال گزرے تھے اور مصر داخلی طور پر ایسے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا کہ یامین اور رشید کی درخواست شاید کہیں فائلوں کے انبار میں دب کر رہ گئی اور اس کا کوئی جواب یاددہانی کے باوجود موصول نہیں ہوا۔ آخر رشید نے جو ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اپنے وسائل سے کھدائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ خود قاہرہ گیا۔ ایک دوست کی معرفت زیاد کی خدمات حاصل کیں۔ کھدائی کرانے کے لئے ضروری آلات خریدے اور تیس مزدوروں کی مختصر تعداد کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی ایسے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے جنہوں نے یامین اور رشید کے اندازوں کی تائید کر دی۔ پندرہ سے بیس فٹ کے بعد ہی ایک مختصر سی قدیم بستی کے مکانات، بازار، گلیاں، کوچے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ وہ گنبد ایک چھوٹے سے مندر کا ثابت ہوا جس کی بلندی بستی کی دوسری عمارتوں سے زیادہ تھی۔ کھدائی کے دوران پتھر کی ایسی سلیں بھی ملیں جن پر قدیم مصری زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ یامین اور رشید دونوں ہی کو مُردہ زبانوں کے بارے میں کوئی تجربہ حاصل نہ تھا۔ اس لئے طے کیا گیا کہ ان سلوں کو پڑھنے کے لئے کسی قدیم زبانوں کے ماہر کی خدمات بھی حاصل کی

جائیں..... اور اس طرح اس گروپ میں پروفیسر عثمان کا اضافہ ہوا۔

مندر یوں تو پوری طرح نکالا جا چکا تھا مگر اس کے دروازے میں پتھر کی ایک بہت بڑی چٹان سی اس طرح پھنسی ہوئی تھی کہ اندر جانا ناممکن تھا۔ بظاہر یہ چٹان مندر کے سامنے بنے ہوئے بلند سنگی چبوترے کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی جو کسی ناقابل فہم طریقہ سے ٹوٹ کر دروازے پر گر گئی تھی اور زیاد گزشتہ تین دن سے اسے ہٹانے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اس کوشش میں مندر کے اندر کا حال جاننے کے عام تجسس سے زیادہ ایک خاص اضطراب اور بے چینی بھی شامل تھی جس کی وجہ پتھر کی دو تین سلیں تھیں جو بستی کے مختلف مقامات پر زمین میں گڑھی ہوئی پائی گئی تھیں۔

پروفیسر عثمان نے ان پر کھدی ہوئی تحریر کا جو ترجمہ کیا تھا..... اس کے مطابق یہ مندر نوطی دیوی کا مندر کہلاتا تھا۔ سلوں کی عبارت کسی اشتہار یا اعلان کی صورت میں تھی جس میں مندر کے پجاری ہرداس کی جانب سے عام لوگوں کو یہ دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے چوری کے مقدمات کا فیصلہ نوطی دیوی سے کرائیں۔ پجاری کا دعویٰ تھا کہ جہاں کوئی ثبوت کوئی گواہی نہ ملے اور ایک یا ایک سے زیادہ افراد کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہو کہ ان میں سے اصلی چور کون ہے تو وہاں نوطی دیوی کا بے لاگ فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا۔ اصل چور دیوی کے سامنے بیٹھتے ہی پتھر کا بن جائے گا۔

یہ کئی اعتبار سے بڑی عجیب بات تھی۔ اول تو یہ کہ قدیم مصری دیوی دیوتاؤں میں نوطی کے نام کی کوئی دیوی اب تک معلوم نہیں کی جا سکی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ آخر چوری کے جرم کا ہی فیصلہ کیوں کرتی تھی اور تیسرے یہ کہ اس کی سزا مجرم کو اس انوکھے انداز میں کیوں دی جاتی تھی..... دوسرے الفاظ میں مندر کے اندر کسی ایسے قدیم مذہب کا راز بھی پوشیدہ ہو سکتا تھا جس سے آج کی مہذب دنیا بالکل ناواقف تھی اور یہ ایک بڑی اہم دریافت ہوتی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یامین اور رشید مندر کے اندر پہنچنے کے لئے جتنا بے چین ہوتے کم تھا۔

زیاد خیمے میں داخل ہوا تو دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں بھائی کیا خبر لائے؟ چٹان کو دروازے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے؟'' یامین نے پوچھا۔

''صدیوں زمین کے اندر دبے رہنے کی وجہ سے چٹان اتنی مضبوطی سے جم گئی تھی کہ.....''

''اوہ تم نے پھر وضاحتیں شروع کر دیں۔'' یامین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ذرا ٹھہرو۔'' رشید نے جلدی سے ہاتھ اُٹھایا ''زیاد صاحب کے الفاظ قابل غور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چٹان اتنی مضبوطی سے جم گئی تھی..... گویا اب نہیں ہے..... یہ الفاظ دیگر.....''

''دروازہ کھل گیا ہے۔ آپ حضرات تشریف لے چلیں۔'' زیاد نے اپنا فقرہ پورا کر دیا۔

''تم نے اندر جا کر دیکھا؟'' یامین نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں۔ یہ کام آپ لوگوں کا ہے۔'' زیاد نے جواب دیا۔

''اگر پتھر پر لکھی ہوئی عبارت درست ہے تو میں پتھر بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ خطرہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو چور ہیں۔'' یامین بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں کم و بیش ہر شخص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی نہ کسی چھوٹی یا بڑی چوری کا مرتکب ضرور ہوتا ہے۔'' زیاد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ محض نوطی دیوی کے سامنے جانے سے کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ اس کے لئے ضرور کچھ خاص قسم کی رسمیں یا الفاظ ادا کئے جاتے ہوں گے۔'' یامین نے جواب دیا۔

''یعنی دھڑکا تمہیں بھی لگا ہوا ہے۔'' رشید مسکرایا ''بہرحال میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''مگر میں رکھتا ہوں۔'' یامین نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ قدیم مذاہب یا دیوی دیوتاؤں کے بارے میں جو عجیب روایات مشہور ہیں یا پرانی تاریخ کے ذریعے ہمیں معلوم ہوئی ہیں، ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔''

''اچھا بھئی ہوتی ہوگی۔ سردست اس بحث سے کیا حاصل ہے۔ آؤ چلیں۔'' رشید نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

تینوں خیمے سے باہر نکلے۔ مندر تک پہنچے۔ مزدور چٹان ہٹانے کے بعد دروازے پر پڑا ہوا ملبہ صاف کر رہے تھے۔ یامین نے اندر جھانک کر دیکھا۔ دن کی روشنی ہونے کے باوجود اندر نیم تاریکی تھی۔ مشعلیں جلائی گئیں اور یہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ مندر ایک کافی وسیع وعریض ہال پر مشتمل تھا جس کے تین جانب برآمدے بنے ہوئے تھے۔ دائیں طرف دو تین فٹ اونچے اور تقریباً اتنے ہی لمبے چوڑے چبوترے پر پتھر کا ایک قد آور مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمہ بڑی عجیب وضع کا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور گردن کے نیچے تک سارا دھڑ عورت کا تھا مگر اس کے جسم پر کسی حسین چہرے کی جگہ ایک انتہائی بدشکل بلکہ خوفناک صورت نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں، چھوٹی اور بے حد پھیلی ہوئی ناک، ناک کے ساتھ ہی مونچھوں کی جگہ دو سینگ نما چیزیں اُبھری ہوئی، موٹے موٹے ہونٹ جن سے اوپری دانت خوفناک انداز میں منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے جن میں دائیں بائیں دو دانت کسی درندے کی طرح لمبے اور نوکیلے تھے۔ یہ غالباً نوطی دیوی کا مجسمہ تھا۔ دیوی کے مجسمے کے سامنے بالکل پتھریلے فرش پر ہڈیوں کا ایک پنجر چبوترے سے کمر ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی جانب پتھر کی تین سلیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی تھیں اور ایک سل علیحدہ پڑی تھی..... یامین نے جھک کر سلوں کو دیکھا۔ ان پر قدیم طرز تحریر میں کچھ لکھا تھا مگر شکلوں کی بناوٹ ناموزوں اور بگڑی بگڑی سی تھی۔

ایک دالان پتھر کے مجسموں سے بھرا پڑا تھا۔ رشید نے گنا۔ وہ تعداد میں 23 تھے۔ کمر تک بالکل عریاں اور کمر سے نیچے کوئی کپڑا دھوتی کے انداز میں باندھے ہوئے۔ ان مجسموں کا انداز تراشے ہوئے مجسموں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنے تناسب اور دوسری تفصیلات میں حیرت انگیز طور پر بیٹھے ہوئے انسانوں سے اتنے مشابہ تھے کہ پہلی نظر میں کسی زندہ آدمی کا شبہ ہوتا تھا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ چور ہیں جو دیوی کے سامنے پیش کئے گئے تھے اور دیوی نے انہیں پتھر کا بنا دیا۔'' رشید نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے۔'' یامین نے جواب دیا۔

دوسرے دالان میں کھانے پینے کے برتن، پتھر کی سلیں جن میں کچھ سادہ تھیں اور کچھ پر ویسی ہی تحریر معلوم ہوتی تھی جیسی بستی میں ملنے والی سلوں پر پائی گئی تھی۔ تیسرا دالان یوں تو خالی تھا مگر اس میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے ایک گوشے میں پتھر پر کھودنے کی کچھ اوزار نما چیزیں

اور دوسرے گوشے میں ایک بڑا سا سنگی مرتبان رکھا ہوا تھا۔ یامین نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مشعل کی روشنی مرتبان کے کھلے منہ میں ڈالی اور اس کی آنکھیں منعکس ہوتی ہوئی بے شمار کرنوں سے چکاچوند ہوگئیں۔

''اوہ رشید دیکھنا تو..... مجھے تو یہ ہیرے جواہرات معلوم ہوتے ہیں۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ زیاد اور رشید لپک کر مرتبان کے پاس پہنچے۔ جھانک کر دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل کر رہ گئیں۔ زیاد نے ایک دم سے مرتبان میں ہاتھ ڈال دیا پھر جو نکالا تو اس کی مٹھی میں ایک قدیم وضع کا زیور لٹک رہا تھا۔ یہ کوئی گلے میں پہننے کی مالا یا گلوبند کی طرح کا سونے کا زیور تھا جس میں بہت سے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ مرتبان کو اُلٹ دیا گیا اور اس میں سے بے شمار چھوٹے بڑے زیور، سب کے سب طرح طرح کے جواہرات سے مزین فرش پر ڈھیر ہوگئے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زیور ہیں جو نوطی دیوی کو چڑھاوے یا نذرانے کی صورت میں پیش کئے جاتے رہے ہوں گے۔'' یامین نے کہا۔

''لاکھوں پونڈ کی مالیت ہوگی ان کی۔'' زیاد ایک ایک زیور اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

''ہوگی۔'' یامین نے لاپرواہی سے کہا..... ''یہ خزانہ ہماری ملکیت نہیں کہ اس کی قیمت جانچنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک قیمت کے مقابلے میں ان کی تاریخی حیثیت زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم محکمہ آثار قدیمہ سے دوبارہ رجوع کریں تو یقیناً وہ نہ صرف اب تک کے تمام اخراجات ادا کرے گا بلکہ آئندہ تحقیقات کے سلسلہ میں ضروری سہولتیں بھی فراہم ہو جائیں گی۔''

''خیر اخراجات کی مجھے پرواہ نہیں۔'' رشید بولا۔

''تم جانتے ہو کہ میں نے یہ مہم صرف اپنے اور تمہارے شوق کے پیش نظر شروع کی تھی۔ بہرحال یہ باتیں بعد میں بھی طے کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس قیمتی خزانے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیں جہاں کسی اور کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے۔ ہمیں اس دریافت کو بھی صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا ہوگا ورنہ شہری آبادی سے پچاس ساٹھ میل دُور اس صحرا میں اگر کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھائی دی تو ہم کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکیں گے۔''

''میرا مشورہ قابل قبول ہو تو ان زیورات کو کسی کپڑے وغیرہ میں باندھ کر یامین صاحب کے سپرد کر دیا جائے جو اسے اپنے آہنی صندوق میں حفاظت سے رکھ لیں۔ یہاں اس سے زیادہ محفوظ کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔'' زیاد نے کہا۔

''میں تائید کرتا ہوں۔'' رشید نے کہا اور خود ہی گلے میں بندھا ہوا بڑا رومال کھول کر فرش پر بچھاتے ہوئے اس میں زیورات رکھنے لگا۔

اور یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ رشید اپنے خیمے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ زیاد اندر داخل ہوا۔

''سونے کا پروگرام ہے؟'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ہاں..... مگر تم اب تک کیسے جاگ رہے ہو؟'' رشید نے کہا ''روزانہ تو آٹھ بجتے ہی بستر پر پہنچ جاتے تھے۔''

''میں آج بھی سونے ہی کی کوشش کر رہا ہوں مگر اکیلے کام بنتا نظر نہیں آ رہا۔'' زیاد نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا ''اس لئے تمہارے پاس آ گیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا مطلب..... یہاں میرے خیمے میں سونا ہے؟''

''بدھو ہی رہے۔ میں دوسرے سونے کی بات کر رہا ہوں جس کے ساتھ قسمت چمکانے کے لئے کچھ اور بھی چیزیں ہیں۔''

''اوہ تمہارا اشارہ زیورات کی طرف ہے مگر یامین ایسی کوئی تجویز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔''

''ایسا سنہری موقع زندگی میں بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔''

''ناممکن ہے۔'' رشید نے نفی میں سر ہلایا ''میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

''اس صورت میں اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم اس کی مرضی کے بغیر بھی اس خزانے پر قبضہ کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' رشید نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بہت آسان بات ہے۔ ہم اس کے آہنی بکس کا تالا توڑ کر زیورات نکال لیں گے۔''

''لیکن اس طرح تو براہ راست میری یا تمہاری ذات شبہ کی زد میں آئے گی۔'' رشید چونک کر بولا ''ظاہر ہے کہ ہم تینوں کے علاوہ کوئی اس راز سے واقف نہیں ہے۔''

''جو الزام وہ ہم پر لگائے گا ہم اسے خود اسی پر الٹ دیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ظاہر ہے کہ زیورات اس کے قبضہ میں ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔''

''لیکن بکس کا ٹوٹا ہوا قفل؟''

''کیا کوئی خود اپنے بکس کا تالا نہیں توڑ سکتا؟'' زیاد نے ڈھٹائی سے جواب دیا ''ہم دونوں اس پر الزام لگائیں گے کہ اس نے چوری کا شبہ ہماری جانب منتقل کرنے کے لئے خود ہی تالا توڑ کر زیورات کہیں چھپا دیئے ہیں۔ ثبوت نہ اس کے پاس ہوگا اور نہ ہمارے پاس۔ ایسی صورت میں وہ ہمارے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتا۔''

''بات تو سمجھ میں آتی ہے۔'' رشید نے کہا ''مگر تالا توڑنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تو؟''

''میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔'' زیاد نے جواب دیا۔

''ابھی اسے کافی میں نیند کی تین گولیوں کا پاؤڈر پلا کر آ رہا ہوں۔''

''بہت خوب۔'' رشید مسکرا دیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے جب سے وہ زیورات دیکھے ہیں، اسی وقت سے ان پر قبضہ کرنے کی سکیم بنانا شروع کر دی تھی۔''

''ہاں زیورات اس کے پاس رکھنے کا مشورہ بھی اسی سکیم کا ایک حصہ تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کی نیت خراب ہوتی تو ہم انہیں اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے۔''

''مجھے تعجب ہے کہ جب تم اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے تو تم نے مجھے شریک کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟''

''کوئی شک نہیں کہ میں تنہا بھی زیورات نکال سکتا تھا۔'' زیاد نے مسکراتے ہوئے کہا ''لیکن اس صورت میں..... تم اور یامین متحد ہو جاتے اور اگرچہ یہاں پولیس وغیرہ موجود نہیں ہے لیکن تم اپنے مزدوروں کے بل پر مجھے پکڑ بھی سکتے تھے اور میری ہی چیزوں کی تلاشی بھی لے سکتے تھے جبکہ ہم دونوں مل کر یامین کی ہر چال کا جواب دے سکتے ہیں۔''

''بہت ہوشیار ہو لیکن یہ بات جان لو کہ میرا

حصہ دو تہائی ہوگا۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"اس لئے کہ اس مہم پر میرا پیسہ خرچ ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے اس خزانے پر میرا حق سب سے زیادہ ہے۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔ ہم دونوں اسے برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔ میری مدد کے بغیر نہ تم انہیں پا سکتے ہو اور نہ ٹھکانے لگا سکتے ہو۔"

"اچھی بات ہے..... یوں ہی سہی۔" رشید کچھ سوچنے لگا۔ آخر اس نے جواب دیا "مگر میں ایک بات اور بھی سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کیا.....؟"

"اگر وہ چڑھاوے کے زیورات ہیں تو ان کی چوری نوطی دیوی کے غصہ کو بھی دعوت دے سکتی ہے۔" رشید نے کچھ فکرمندی سے کہا۔

"کمال کرتے ہو۔ صبح تو کہہ رہے تھے کہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

"پھر بھی ان کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کا نوطی دیوی سے تعلق نہیں ہے تو بہتر ہوتا۔"

"ان پتھر کی سلوں پر زیورات کے متعلق کوئی بات لکھی ہے؟" زیاد نے پوچھا۔

"نہیں۔" رشید نے بتایا..... "عثمان صاحب کہہ رہے تھے کہ ان میں سے چند سلوں پر وہی اعلان تحریر ہے جو بستی میں ملنے والی سلوں پر درج تھا اور کچھ پر دیوی کی عبادت اور اس طریقہ کا حال لکھا ہوا تھا جس کے ذریعے مجرموں کو انصاف کے لئے اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ چار سلیں جو پنجرے کے پاس پائی گئی تھیں ان کی عبارت اتنی شکستہ ہے کہ ابھی پڑھی نہیں جاسکیں۔ عثمان صاحب کا خیال ہے کہ وہ پنجر مندر کے پجاری کا ہے اور اس نے مرتے وقت گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اس تحریر کے ذریعے دوسروں تک کوئی پیغام پہنچانا چاہا ہے۔"

"وہ زیورات دیوی کے ہوں یا کسی اور کے ہوں، مجھے اس سے غرض نہیں۔" زیاد نے جواب دیا "میں اپنے مستقبل کی راحت ہزاروں سال پہلے گزری ہوئی کسی دیوی کے خوف سے قربان نہیں کر سکتا۔"

"زیورات رکھو گے کہاں؟"

"ہم اپنے پاس بھی رکھ سکتے تھے۔" زیاد نے کہا "یا ہمیں ہماری یا ہمارے سامان کی تلاشی لینے کی ہمت نہیں کرسکتا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یامین نے بات بڑھانے کی کوشش کی تو یہ خبر عام مزدوروں کو بھی معلوم ہو جائے گی اور پھر اگر ان میں سے کسی نے قسمت آزمانا چاہی تو ظاہر ہے کہ وہ ہم تینوں کے خیموں کا ہی رُخ کریں گے۔ چنانچہ میں نے زیورات چھپانے کے لئے ایک محفوظ جگہ بھی تلاش کر لی ہے۔"

"کہاں.....؟"

"خیموں سے باہر پہاڑیوں میں۔" زیاد نے بتایا "میں آج سہ پہر ٹہلتا ہوا اس طرف چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک چٹان میں اتنی بڑی دراڑ دیکھی جس میں کوئی بھی چیز آسانی سے چھپائی جا سکتی ہے۔ دراڑ زمین سے کچھ بلندی پر ہے اور جب تک کوئی خاص طور پر اس کی تلاش میں نہ ہو وہ نظر نہیں آسکتی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔" رشید مسکرایا۔

"تو پھر چلو دیر کس بات کی ہے؟"

یامین کا خیمہ قریب ہی تھا۔ ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ پہاڑی کے دامن میں پانچ خیمے ایک نیم دائرے کی صورت میں لگائے گئے تھے۔ پہلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیمہ زیاد اور اس کے دو ساتھیوں کا تھا جنہیں وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ دوسرا خیمہ عثمان صاحب کا، تیسرے میں کھدائی سے برآمد ہونے والے نوادرات کا ذخیرہ رکھا گیا تھا۔ اس کے برابر میں یامین کا خیمہ تھا اور سب سے آخر میں رشید کا۔ سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ چھوڑ کر ایک بہت بڑے شامیانے میں قناتیں لگا کر مزدوروں کی شب بسری کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اس کے برابر ہی دو خیمے اور لگے تھے جن میں سے ایک کھانے اور ناشتے کی تیاری کے کام آتا تھا اور دوسرے میں مزدور کھانا کھاتے تھے۔

رشید اور زیاد یامین کے خیمے میں پہنچے تو وہ اپنے فولڈنگ بستر پر بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ پلنگ کے بائیں جانب خیمے کی دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا آہنی صندوق رکھا تھا۔ صندوق پرانی وضع کا اور مضبوط بنا ہوا تھا۔ اسے یامین نے اس خیال سے ساتھ لے لیا تھا کہ زیادہ قیمتی قسم کے نوادرات اس میں محفوظ کئے جاسکیں۔ زیاد نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب سے ایک ہتھوڑا نکالا اور دو تین ضربوں میں ہی صندوق میں پڑا ہوا قفل توڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ زیورات اسی رومال میں بندھے ہوئے صندوق کے ایک کونے میں رکھے تھے۔ اس نے رومال اُٹھا لیا۔ ڈھکنا دوبارہ بند کیا اور ٹوٹا ہوا قفل وہیں چھوڑ کر دونوں چپ چاپ باہر نکل گئے۔

اب ان کا رُخ پہاڑی کی طرف تھا۔ آسمان پر چاند موجود نہیں تھا مگر کھلے صحرا میں تاروں کی چمک بھی راستہ تلاش کرنے کے لئے کافی تھی۔ مزید آسانی کے لئے زیاد نے ٹارچ بھی ساتھ لے لی تھی۔ اچانک رشید چلتے چلتے رُک گیا اور پیچھے گھوم کر دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" زیاد نے پوچھا۔

"مجھے کوئی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔" رشید آہستہ سے بولا۔

"تمہارا وہم ہے۔" زیاد نے آنکھیں پھاڑ کر خیموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... "یہاں تو دُور دُور تک....."

"غور سے سنو۔" رشید جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

اور اس مرتبہ زیاد نے بھی وہ آواز سُن لی تھی۔ بڑی عجیب سی آواز..... جیسے کوئی اپنی انگلیاں چٹخ رہا ہو۔ چٹ چٹ چٹ۔ مگر یہ صرف ایک لمحہ کے لئے ہی تھا۔

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خشک لکڑی توڑ رہا ہو۔" اس نے کہا۔

"یا پھر جیسے ہڈیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہی ہوں۔"

رشید نے سرگوشی کی۔ زیاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب تم کہو گے کہ وہ ڈھانچہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔"

اس نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا..... "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی وہمی طبیعت کے مالک ہو۔" رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح کھڑے ہوئے سننے کی کوشش کرتے رہے مگر پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی.....

آخر وہ ایک مرتبہ پھر آگے بڑھے۔ زیاد نے جو چٹان تلاش کی تھی اس میں شک نہیں کہ وہ قیمتی چیز چھپانے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کا تو ذکر ہی کیا کوئی خاص طور سے بھی تلاش کرتا تب بھی مشکل سے ہی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ دراڑ اتنی بڑی تھی کہ اس میں زیورات کا رومال آسانی سے آ گیا۔ رشید بار بار پلٹ کر دیکھتا جا رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ زیاد نے رومال اندر رکھنے کے بعد مزید حفاظت کے خیال سے ایک چھوٹا پتھر اُٹھا کر دراز میں پھنسا دیا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ انہیں زیورات چھپاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، وہ واپس لوٹے۔ رشید کا دل اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ وہ زیاد کو بھی گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ مندر میں لے گیا۔ ڈھانچہ کو دیوی کے مجسمے کے پاس سے اُٹھا کر کوٹھڑی میں رکھ دیا گیا تھا۔

''آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔'' زیاد نے ٹارچ کی روشنی کوٹھڑی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ڈھانچہ اپنی جگہ موجود ہے۔'' رشید نے کہا۔ پنجر واقعی کوٹھڑی میں موجود تھا مگر معلوم نہیں رشید کا وہم تھا یا حقیقت کہ اسے جہاں ہونا چاہیے تھا وہاں نہیں تھا۔ رشید کا خیال تھا کہ ڈھانچہ مرتبان کے قریب رکھا گیا تھا جبکہ وہ اس وقت پتھر کی سلوں کے قریب پڑا تھا۔

دوسرے دن ہنگامہ ہونا ناگزیر تھا۔ رشید اور زیاد دونوں اس کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ صبح اُٹھتے ہی یامین کی نگاہ ٹوٹے ہوئے قفل پر پڑی۔ اس نے جلدی سے صندوق کھول کر دیکھا۔ باقی سب چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں مگر زیورات کا رومال غائب تھا۔ وہ اسی وقت رشید کے خیمے میں پہنچا۔ دونوں کی بحث نے زیاد کو بھی متوجہ کیا۔ جیسا کہ طے تھا کہ اس نے رشید کا ساتھ دیا اور پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ سب عثمان صاحب کے خیمے میں تھے۔

''ہم تینوں کے علاوہ کوئی زیورات کی موجودگی سے واقف نہیں تھا۔'' یامین کہہ رہا تھا ''میں جانتا ہوں کہ یہ حرکت میری نہیں ہے اس لئے.....''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں'' زیاد نے بات کاٹی..... ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ خود تمہاری نیت ہی اس قیمتی خزانے کو دیکھ کر خراب نہیں ہوگئی تھی؟''

''زیورات میرے ہی پاس رکھے تھے۔'' یامین نے جواب دیا ''اگر میں انہیں حاصل کرنا چاہتا تو اس کے ہزار طریقے نکال سکتا تھا۔ چوری کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی!''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' عثمان صاحب نے تائید کی۔

''اور اگر انہیں میں چرانے کا ارادہ کر چکا تھا تو یہ تجویز کیوں پیش کرتا کہ انہیں تمہارے پاس رکھوا دیا جائے۔'' زیاد تیزی سے بولا ''غالباً تم بھولے نہیں ہوگے کہ یہ مشورہ میں نے ہی دیا تھا۔''

''تو پھر رشید نے چرائے ہوں گے۔'' یامین نے کہا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں چوری کی دولت پر۔'' رشید بگڑا ''یہ سب کچھ میرے پیسے سے کیا جا رہا ہے۔ میں چاہتا تو زیورات اپنی نگرانی میں رکھنے کا مطالبہ کر سکتا تھا..... مگر میں نے زیاد کی تجویز کی تائید کی۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ انہیں اپنے پاس رکھتا تو تمہیں اس طرح مجھ پر چوری کا الزام لگانے کا موقع نہ ملتا۔''

''مجھے یہ تم دونوں کی ملی بھگت معلوم ہوتی ہے۔'' یامین نے غصہ سے جواب دیا..... اور پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا..... ''سوچنے کی بات ہے عثمان صاحب کہ میرے پاس قفل کی چابی موجود تھی۔ بڑی آسانی سے تالا کھول کر نکال سکتا تھا۔ تالا وہ شخص ہی توڑے گا جو اسے چابی سے کھولنے پر قادر نہ ہو۔''

''یہ تمہاری ایک چال ہے۔'' زیاد نے کہا ''تم اپنی خیانت کو چوری کا روپ دینا چاہتے تھے۔ اگر چابی سے تالا کھول کر زیورات نکالتے تو اپنے

دوستوں کو مورد الزام ٹھہرانے کا موقع کب ملتا۔''

''تو تم نے زیورات نہیں نکالے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اور نہ تم نے؟'' یامین نے رشید کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔''

''تو کیا تم دونوں اپنی اور اپنے سامان کی تلاشی دینے کے لئے تیار ہو؟''

''بڑی خوشی سے۔'' رشید نے جواب دیا ''لیکن میں کسی چور کو تلاشی لینے کا حق نہیں دے سکتا۔''

''تلاشی عثمان صاحب لیں گے۔'' یامین نے کہا ''اور میں خود اپنی چیزوں کو سب سے پہلے دکھاؤں گا۔''

''وہ تم ہو یا عثمان صاحب یا کوئی اور میں اس الزام کو اپنی ذاتی توہین محسوس کرتا ہوں۔'' زیاد نے تیزی سے کہا..... ''بغیر کسی قانونی اختیار کے تلاشی تو کیا کوئی میرے اسباب کو یا مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

''تم قانونی اختیار کی بات کرتے ہو۔'' یامین بولا ''اچھی بات ہے۔ میں ابھی قصر فرافرا جا کر اس معاملے کی پولیس میں رپورٹ کرتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہو گیا..... ''عثمان صاحب! میری واپسی تک آپ ان دونوں کو یہاں سے ہلنے نہیں دیں گے۔''

''ذرا ٹھہرو صاحبزادے۔'' عثمان صاحب نے نرمی سے جواب دیا..... ''قانون کسی ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور ابھی تک ایمانداری کی بات ہے کہ تم مجھے نہ ان کے جرم کے بارے میں مطمئن کر سکے ہو اور نہ ہی اپنی بے گناہی کے بارے میں۔ تم تینوں کی اب تک کی گفتگو سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شیطان نے تم ہی میں سے کسی کو اس ذلیل حرکت پر آمادہ کیا ہے۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا لیکن وہ جو کوئی بھی ہو، میں اسے اتنا ضرور کہوں گا کہ ان زیورات کا تعلق اب ایک تاریخی دور سے ہے اور تاریخ افراد کی نہیں قوم کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم دیکھ رہے ہو کہ اس دولت نے جو کبھی کسی کی دوست نہیں رہی..... پل بھر میں تمہاری برسوں کی دوستی کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ایک ہرجائی شے کے لئے اپنے دلوں کو نفرت کی آماجگاہ نہ بناؤ۔ میرا مشورہ ہے کہ اس وقت آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے کو چور بنانے کی بجائے تم لوگ اپنے اپنے خیموں میں واپس جاؤ۔ وقتی تحریص نے جس کسی کو بھی راہ راست سے بھٹکا دیا ہے وہ اپنے خیمے کی تنہائی میں ایک بار پوری سنجیدگی سے اپنی حرکت اور اس کے انجام پر غور کرے اور پھر شام ہونے سے قبل خاموشی کے ساتھ کسی کو کچھ بتائے بغیر زیورات اسی مرتبان میں واپس رکھ دے جہاں وہ پائے گئے تھے۔ ہم اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں گے۔''

مگر اس ترکیب کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سورج غروب ہونے سے قبل عثمان صاحب نے مندر میں جا کر سب کے سامنے مرتبان دیکھا..... وہ خالی تھا۔

''میں جانتا تھا کہ چور اتنی آسانی سے اس قیمتی خزانے سے دستبردار نہیں ہوگا۔'' یامین نے رشید اور زیاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... ''مگر اس مسئلہ پر دن بھر غور کرنے کے بعد میرے ذہن میں ایک اور حل آیا ہے۔ مجھے پروفیسر صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اگر یہ معاملہ پولیس کے ہاتھوں تک پہنچ گیا تو پھر ہم سب کو بہت پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے لئے اپنے دلوں میں نفرت کی ایسی دیوار بھی کھڑی کر لیں گے جسے عبور نہیں کیا جا سکے گا..... ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت نوٹی دیوی کے مندر میں کھڑے ہیں اور پتھر کی سلوں پر لکھی ہوئی عبارت سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ قدیم زمانے میں اس دیوی سے انصاف طلب کیا جاتا رہا ہے اور وہ بھی خاص طور پر چوری کے معاملات میں..... ہمارے سامنے بھی ایک ایسا ہی معاملہ درپیش ہے، کیوں نہ ہم نوٹی دیوی کو انصاف کرنے کا موقع دیں۔"

"کیا مطلب.....؟" رشید چونکا۔

"آج تو وقت گزر چکا ہے۔ کل غروب آفتاب سے پہلے ہم تینوں نوٹی دیوی کے سامنے حاضر ہوں گے اور مقررہ رسومات ادا کرتے ہوئے دیوی سے کہیں گے کہ ہم میں سے جس کسی نے بھی زیورات چرائے ہیں وہ اسے پتھر کا بنا دے۔"

"بکواس۔" زیاد منہ ٹیڑھا کر کے بولا "تمہیں اس خرافات پر یقین ہو تو ہو۔ مگر میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔"

"اور فرض کرو کوئی بھی پتھر کا نہ ہوا تب؟" رشید نے پوچھا۔

"تب ہمیں مجبوراً پولیس کو اطلاع دینا پڑے گی۔" یامین نے جواب دیا "آپ کیا کہتے ہیں عثمان صاحب!؟"

"میں صرف اس خیال سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں کہ اس طرح چور کو سوچنے سمجھنے کے لئے کچھ اور وقت مل جائے گا۔" عثمان صاحب افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولے "شاید خدا اس کے دل میں نیکی ڈال دے۔"

"تب پھر یہ بات طے سمجھی جائے۔"

"میں اسے بھی تمہاری کوئی چال سمجھتا ہوں۔" زیاد نے کہا "لیکن اس خیال سے کہ کہیں تم یہ نہ کہنا شروع کر دو کہ اگر ہم چور نہیں ہیں تو اس آزمائش سے کیوں ڈرتے ہیں، میں تمہاری تجویز منظور کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اگر نوٹی دیوی میں واقعی کوئی طاقت ہے تو وہ چور کو سچ مچ کا پتھر بنا ڈالے۔" اس کے بعد سب اپنے خیموں کی طرف واپس لوٹ گئے۔

"میں حیران ہوں کہ کل رات وہ آواز سننے کے بعد بھی تم نے یہ تجویز کیسے مان لی؟" رشید نے پریشانی سے کہا۔ یہ گفتگو اس وقت زیاد کے خیمے میں ہو رہی تھی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" زیاد نے جھلا کر بولا۔

"ہم نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بیکار کر دی ہیں۔ میں نے یہ احمقانہ تجویز مان کر بڑی دوراندیشی سے کام لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ظاہر ہے پتھر کی وہ بے جان مورتی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم میں سے کوئی پتھر نہیں بنے گا۔" زیاد نے جواب دیا۔ "لیکن مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کیمپ کے ایک مزدور کو کچھ رقم دے کر واپس جانے پر آمادہ کر لیا ہے۔ وہ آج رات کی تاریکی میں غائب ہو جائے گا۔ کل شام جب نوٹی دیوی اپنا انصاف کرنے سے قاصر رہے گی تو ہمیں موقع ہو گا کہ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ چونکہ ہم میں سے کوئی پتھر کا نہیں بنا، اس لئے چور کوئی اور شخص ہے۔ پھر خود ہی کیمپ کے مزدوروں سے پوچھ گچھ کرنے کی تجویز پیش کر دیں گے اور یہ معلوم ہو گا کہ ایک مزدور غائب ہے تو قدرتی طور پر یہی سوچا جائے گا کہ یا تو کسی طرح سے اسے زیورات کا علم ہو گیا تھا یا اس نے کوئی اور قیمتی چیز چرانے کے خیال سے صندوق کا قفل توڑا تھا لیکن قدرت نے اس کے سامنے بیش بہا خزانہ رکھ دیا اور وہ زیورات لے کر بھاگ نکلا۔ جب تک پولیس میں رپورٹ کی جائے

گی مزدور نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہو گا۔ کوئی اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن اگر ہم سچ مچ پتھر کے بن گئے تب؟"

"کیا بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔"

"تم کچھ بھی کہو میں اس امتحان میں پڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" رشید بات کاٹ کر بولا۔

"حد کر دی تم نے بزدلی کی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو اس کام کو اکیلا ہی کر لیتا۔" زیاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا..... "ویسے اگر تم اس دیوی سے اتنا ہی ڈرتے ہو تو ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں اور تم ابھی مل کر مندر کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"تمہارے اندر بات کاٹنے کی بُری عادت ہے۔ پہلے اچھی طرح سن تو لیا کرو۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہم ابھی اس پتھر کے بُت کے ٹکڑے کئے دیتے ہیں اور پھر عثمان صاحب کے خیمے میں جا کر ان سے گپ شپ کرنے لگیں گے۔ گھنٹے بھر بعد وہی مزدور جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، بھاگتا ہوا ہمارے پاس آئے گا کہ اس نے ابھی ایک آدمی کو مندر سے بھاگ کر نکلتے دیکھا اور اندر جھانکا تو دیوی کا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک گھنٹے سے عثمان صاحب کے پاس موجود ہوں گے۔ تب توڑنے کا شبہ فوراً یامین کی طرف جائے گا۔ ہم کہیں گے کہ جس طرح اس نے خود اپنے صندوق کا تالا توڑ کر ہمیں چور بنانا چاہا اسی طرح دیوی کا مجسمہ توڑ کر ہمارے خلاف مزید شکوک وشبہات پیدا کرنا چاہتا ہے جبکہ حقیقت میں خود اس نے آزمائش کے خوف سے یہ حرکت کی ہے۔"

"ترکیبیں سوچنے میں تمہارا جواب نہیں۔" رشید خوش ہو گیا..... "مگر کیا اس مزدور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟"

"وہ میرا اپنا آدمی ہے۔" زیاد نے بتایا "یہ بات نہ ہوتی تو میں اس قدر یقین سے کیسے یہ بات کہہ دیتا کہ پولیس کبھی اس کا پتہ نہ چلا سکے گی۔"

"بس تو پھر یہی ترکیب ٹھیک ہے۔" رشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں مندر پہنچے۔ زیاد اپنے ساتھ ضروری اوزار بھی لیتا گیا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی مندر کے آس پاس یا مندر کے اندر موجود نہیں ہے، زیاد نے اپنا وزنی ہتھوڑا اٹھایا اور پوری قوت سے مجسمے کے سر پر دے مارا۔ مندر کیمپ سے اتنے فاصلے پر واقع تھا کہ دونوں میں سے کسی کو اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ توڑ پھوڑ کی آوازیں وہاں تک پہنچ سکتی ہیں۔

ہتھوڑا پڑتے ہی دیوی کا سر ٹوٹ کر اس طرح نیچے گر گیا جیسے مجسمہ پتھر کا نہیں، مٹی کا بنا ہوا ہو۔ دو تین ہاتھوں میں زیاد نے مجسمہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور فاتحانہ انداز میں پلٹ کر رشید کی طرف دیکھا۔ "اب تو یقین ہو گیا تمہیں کہ تمہارا وہم کتنا بے حقیقت ہے۔" وہ بولا "اگر نوٹی دیوی میں کچھ بھی طاقت ہوتی تو وہ ہمیں اس آسانی سے اپنی بربادی کی اجازت نہ دیتی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" رشید نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب تم عثمان صاحب کے پاس چلو۔ میں اس مزدور کو سکھا پڑھا کر ابھی آتا ہوں۔" زیاد قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

رشید مجسمے کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ ٹکڑا اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اسے دوبارہ اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر درپیش تھا۔ مجسمے کے تمام ٹکڑے جیسے کسی ان دیکھی کشش سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹا ہوا پاؤں پنڈلی سے جا کر جڑ گیا۔ پنڈلی ران کے ٹکڑے سے جڑ گئی۔

''زیاد'' اس نے گھبرا کر زیاد کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے؟'' زیاد مشعل اُٹھاتے ہوئے اس کی طرف گھوما۔

''یہ..... یہ..... یہ'' رشید کے منہ سے کوئی اور بات نہ نکل سکی۔

زیاد نے اس کے اشارے کی سیدھ میں فرش کی طرف دیکھا اور اس کی اپنی سانسیں رُکی رہ گئیں۔ ٹوٹا ہوا مجسمہ نصف سے زیادہ اپنے آپ کو مکمل کر چکا تھا اور پھر ان کی حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی آنکھوں نے یہ ناقابل یقین منظر بھی دیکھا کہ چند لمحوں کے اندر ہی ٹوٹے ہوئے تمام چھوٹے بڑے ٹکڑے ایک بار پھر نوطی دیوی کے سالم مجسمہ کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

رشید کی بُری حالت تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ زیاد نے حیرت کے باوجود ہمت سے کام لیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے مجسمے کے سامنے سے ہٹا کر کوٹھڑی کی طرف لے گیا اور وہاں پڑی ہوئی سلوں پر بٹھا دیا۔ کافی دیر تک دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ رشید اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ زیاد کا چالاک ذہن اس صورتحال کے تدارک کے لئے کوئی اور ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' آخر رشید کانپتی ہوئی آواز میں بولا ''ذرا سوچو اگر ہم کل انجانے میں دیوی کے سامنے اپنے انصاف کے لئے بیٹھتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔''

''میں اب بھی اسے دیوی کی کوئی کرامت خیال کرنے سے قاصر ہوں۔'' زیاد نے جواب دیا..... ''البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ قدیم زمانے کے کسی پجاری نے اس مجسمہ پر کوئی ایسا جادو کر رکھا ہو کہ وہ ٹوٹنے کے بعد خود ہی جڑ جائے یا کسی خاص وقت میں اس کے سامنے بیٹھنے والا کوئی فرد پتھر کا بن جائے اور ممکن ہے ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی اس کے جادو کا اثر کام کر رہا ہو۔''

''پھر اب ہم کیا کریں گے؟'' رشید نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا..... ''میری بات مانو تو وہ زیورات واپس کر دو۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' زیاد نے نفی میں سر ہلایا ''تم ذرا خاموش رہو اور مجھے سوچنے دو کہ ہم اپنے آپ کو اس جادو سے کس طرح بچا سکتے ہیں۔''

رشید چپ ہو گیا۔ زیاد سوچتا رہا۔ ایک دم سے اس نے سر اٹھا کر رشید کی طرف دیکھا۔

''ایک بہترین ترکیب ممکن ہوسکتی تھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا ''ایسی ترکیب کہ نہ صرف وہ زیورات ہمیشہ کے لئے کسی مزید پریشانی کے بغیر ہمارے قبضے میں رہتے بلکہ یامین سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا مگر افسوس کہ نہ حسن کو اتنی جلدی بلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ اتنی عجلت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔''

''حسن کون؟'' رشید نے پوچھا۔

''میرا ایک دوست ہے۔ بہترین سنگ تراش۔'' زیاد نے بتایا ''جو انسان کو سامنے بٹھا کر ایسا حیرت انگیز مجسمہ بناتا ہے کہ تم اصل اور نقل میں تمیز نہیں کر سکتے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' رشید اُلجھ کر بولا ''وہ اگر مجسمہ بناتا ہے تو ہماری موجودہ پریشانی سے اس

بات کا کیا تعلق؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ یہاں ہوتا اور ہمارے پاس چند دن کی مہلت بھی ہوتی تو میں حسن سے ایک مجسمہ تمہاری اس دیوی کا بنواتا اور دوسرا یامین کا۔''

''پھر کیا ہوتا؟''

''پھر ہم اس دیوی کی جگہ وہ مجسمہ رکھ دیتے۔ آزمائش ہوتی اور ہم تینوں دیوی کے سامنے بیٹھتے مگر بعد میں جب مندر سے باہر نکلتے تو یامین پتھر کے بُت میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔''

''مگر کیسے؟ مجسمہ تو نقلی ہوتا۔ اس میں یہ طاقت.....؟''

''بالکل بدھو ہو۔'' زیاد نے بات کاٹی ''ہم یامین کی جگہ اس کا بُت رکھ دیتے۔''

''اور یامین.....''

''یامین'' زیاد نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا ''یامین مزید ہمارے لئے دردسر بننے کی زحمت سے بچ جاتا۔''

''ایسی ناممکن العمل باتیں تم ہی سوچ سکتے ہو۔'' رشید کھڑا ہو گیا ''میں اب مزید ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہاں میرا دم جیسے گھٹا جا رہا ہے۔''

''تمہاری گھبراہٹ مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ بہرحال تم ٹھہرنا نہیں چاہتے تو مجھے اصرار نہیں ہے۔ آؤ چلیں۔ مگر صبح سے پہلے ہمیں کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرنا ہے۔''

رشید کوٹھڑی کے سامنے سے گزرا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر اندر کی جانب چلی گئی۔ زیاد مشعل لئے اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ اچانک رشید کے قدم رُک گئے۔

''اب کیا ہوا؟'' زیاد نے ناگواری کے ساتھ پوچھا۔

''کوٹھڑی میں دیکھو۔'' رشید نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ زیاد نے مشعل والا ہاتھ کچھ اونچا کرتے ہوئے کوٹھڑی میں جھانکا اور مشعل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ پجاری کا ڈھانچہ جسے کل انہوں نے سلوں کے پاس رکھا تھا۔ اب وہ کوٹھڑی میں موجود نہ تھا۔

چند لمحوں تک دونوں حیران اور سراسیمہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوٹھڑی میں دیکھتے رہے۔ ''خدا کے لئے زیاد'' آخر رشید خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا ''جلدی سے باہر نکلو ورنہ میں بیہوش ہو کر گر جاؤں گا۔''

''تم تو ذرا سی بات پر گھبرا جاتے ہو۔'' زیاد بولا۔

''یہ ذرا سی بات ہے؟ کل رات وہ پراسرار آوازیں اور آج ڈھانچے کا غائب ہونا..... میں تو کہتا ہوں کہ پجاری یا اس کی روح ضرور ہماری چوری سے واقف ہے اور.....''

''میں نہیں مانتا۔'' زیاد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے رشید سے زیادہ خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہو۔ ''وہ ہڈیوں کا پنجر جو ہزاروں سال پہلے کبھی انسان رہا ہو گا، اب ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ جہاں تک اس کے غائب ہونے کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ اسے پروفیسر عثمان مزید تحقیق کے لئے اپنے خیمے میں لے گئے ہوں گے۔''

''تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تو جب تک جی چاہے ٹھہرو۔ میں جا رہا ہوں۔'' رشید نے کہا اور مندر کے دروازے کی طرف چل دیا۔

زیاد بھی اس کے پیچھے مندر سے باہر آیا۔ راستے بھر دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ زیاد کا خیمہ قریب آ گیا لیکن رشید کا رُخ پروفیسر عثمان کے خیمے کی طرف تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہاں کہاں جا رہے ہو؟" زیاد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈھانچہ کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہے یا نہیں؟" رشید نے جواب دیا۔

"پاگل ہو رہے ہو۔ اگر پروفیسر جاگتا ہوا اور اس نے پوچھ لیا کہ ہمیں مندر سے ڈھانچے کی عدم موجودگی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تو کیا جواب دو گے؟"

"تو پھر زیورات واپس کر دو۔"

"میں اتنی آسانی سے اس خزانے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔" زیاد نے کہا "آؤ میرے خیمے میں چلو ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے غور کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور سمجھ میں آ جائے گی۔"

وہ رشید کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے خیمے میں داخل ہوا مگر یہاں انہیں ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی شخص زیاد کے بستر پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ رُخ کچھ ایسا تھا کہ جلتے ہوئے شمعدان کی روشنی چہرے کے خدوخال اُجاگر کرنے سے قاصر تھی۔

"کون ہے؟" زیاد نے دبے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ جواب میں لیٹنے والے نے چونکتے ہوئے سر اٹھا کر زیاد کی طرف دیکھا۔

"ارے حسن تم......؟" بے اختیار زیاد کے منہ سے نکلا۔

حسن مسکراتا ہوا بستر سے اٹھا اور دونوں دوست بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہو گئے۔

"مگر یہ اچانک بغیر اطلاع کے؟" زیاد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں...... اب تمہارے لئے ریگستانوں میں ڈاک اور تار کے محکمے قائم کئے جائیں گے کیا؟" حسن نے جواب دیا۔

"مگر پھر بھی......"

"پھر بھی کیا...... مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں آثار قدیمہ کی کھدائی کر رہے ہو تو سوچا کہ شاید مجھے بھی اپنے آئندہ مجسموں کے لئے کوئی آئیڈیا یا کوئی ماڈل مل جائے۔ چنانچہ چلا آیا۔"

"اور بہت مناسب وقت پر آئے۔" زیاد نے جوش کے ساتھ کہا "سچ مانو میں کچھ دیر ہی پہلے تمہیں یاد کر رہا تھا۔" وہ رشید کی طرف گھوما جو ابھی تک حیرت سے حسن کو دیکھ رہا تھا۔

"رشید! ان سے ملو۔ یہ ہیں موجودہ صدی کے بہترین مجسمہ ساز حسن۔" اس نے تعارف کرایا...... "اور ان کی فنکاری کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اگر وہ 23 مجسمے کھدائی میں برآمد نہ ہوئے ہوتے تو میں یہی کہتا کہ انہیں حسن نے تراشا ہے۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" رشید نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا مگر حسن زیاد کی طرف متوجہ تھا۔ "یہاں 23 مجسمے برآمد ہو چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"بہت خوب...... گویا میرا اتنی زحمت اٹھا کر یہاں آنا بیکار نہیں گیا۔"

"تئیس نہیں چوبیس۔" زیاد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اور وہ چوبیسواں مجسمہ ایک دیوی کا ہے جس کا جسم کسی بے حد حسین عورت کا اور سر کسی خوفناک بلا کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ایک مجسمہ کتنی دیر میں بنا لیتے ہو؟"

"کتنا بڑا مجسمہ؟" حسن نے پوچھا۔

"آدمی کے قد کے برابر۔"

"اپنے طور پر بناؤں تو ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے اور خصوصی صلاحیت سے کام لوں تو ایک گھنٹہ میں مکمل کر لوں گا۔"

"خصوصی صلاحیت؟" زیاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ایک راز کی بات ہے۔" حسن مسکرایا "تم میرے اتنے عزیز دوست نہ ہوتے تو کبھی نہ بتاتا۔ بہر حال مختصر طور پر یوں سمجھ لو کہ مجھے ایک بزرگ کی دعا حاصل ہے۔ اگر میں چاہوں تو بے ہنگم بے ڈول پتھر کو ایک گھنٹے کے اندر کسی بھی طرح کے مجسموں میں ڈھال سکتا ہوں۔ میرے مجسموں میں حقیقت کی جھلک ان بزرگوں کی دعا کا نتیجہ ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" زیاد اچھل پڑا۔

"بالکل...... مگر میں عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔"

"یہاں بھی بہت خاص صورتحال درپیش ہے۔" زیاد نے کہا...... "میں تم سے دو مجسمے بنوانا چاہتا ہوں اور اگر تم انہیں دو گھنٹے میں تیار کر دو تو منہ مانگا معاوضہ دے سکتا ہوں۔"

"کس کے مجسمے بنوانا چاہتے ہو؟" حسن نے سوال کیا۔

"اپنے؟ یا ایک اپنا اور ایک اپنے ان دوست کا......"

اس نے رشید کی طرف دیکھا...... "کیا نام بتایا تھا تم نے ان کا؟"

"یہ رشید ہیں۔" زیاد نے جواب دیا...... "مگر ہمیں اپنے مجسمے نہیں بنوانے۔"

"تو پھر......؟"

"ایک اس دیوی کا جس کا ابھی ذکر کیا اور دوسرا ایک شخص کا جس کا نام یامین ہے۔"

"یامین؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

"ہیں ایک حضرت۔ تو تم دو گھنٹوں میں ان کے مجسمے تیار کر لو گے؟"

"بشرطیکہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔"

"دیوی کا مجسمہ تو میں ابھی تمہیں مندر میں لے جا کر دکھائے دیتا ہوں۔" زیاد نے کہا اور پھر رشید سے مخاطب ہوا۔ "ذرا چپکے سے جا کر دیکھو کہ یامین کیا کر رہا ہے۔"

رشید نے اثبات میں سر ہلایا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

"چپکے سے جا کر دیکھنے میں کیا مصلحت ہے؟" حسن نے پوچھا...... "کیا تم ان کی لاعلمی میں ان کا مجسمہ بنوانا چاہتے ہو؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"مگر کیوں؟"

زیاد نے ایک لمحہ غور کیا۔ وہ حسن کو خزانے کے راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا مگر صورتحال کچھ ایسی تھی کہ اگر سردست وہ اس کی کوشش بھی کرتا تو آگے چل کر جب یامین کے پتھر بن جانے کی داستان عام ہوتی تو حسن کا مشکوک ہو جانا یقینی تھا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ حسن کو زیورات کے بارے میں بتانے کا مطلب ایک تیسرا حصہ دار پیدا کرنا تھا مگر ہر پہلو کا جائزہ لینے کے بعد زیاد نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ نہ ملنے کا خطرہ مول لینے سے تیسرے حصہ پر قناعت کرنا زیادہ بہتر ہے اور اس نے مختصر الفاظ میں حسن کو اب تک کے تمام واقعات بتاتے ہوئے اپنی آئندہ تجویز سے بھی آگاہ کر دیا۔ اسے اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ حسن نے کسی اعتراض کے بغیر اس کی مکمل تائید کرتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا کیونکہ اس کے خیال میں کوئی عقل مند انسان اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔

رشید نے واپس آ کر بتایا کہ یامین اپنے خیمے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سو رہا ہے۔ زیاد نے رشید کو وہاں چھوڑا اور حسن کو ساتھ لے جا کر پہلے یامین کی صورت دکھائی اور پھر مندر میں دیوی کے درشن بھی کرا دیئے۔ مجسموں کے لئے پتھر کی ضرورت کا مسئلہ اس بھاری چٹان نے حل کر دیا جو مندر کے دروازے سے ہٹائی گئی تھی۔ حسن کا اندازہ تھا کہ وہ چٹان سے دونوں مجسمے بنا لے گا۔

"اب تم جاؤ۔" حسن اپنے اوزاروں کا بیگ کھولتے ہوئے بولا "دو گھنٹے بعد آنا، مجسمے تیار ملیں گے۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم دو گھنٹے میں اس چٹان کو توڑ کر مجسمے اس طرح بنا سکو گے۔" زیاد نے کہا "مگر میرا ذہن کوئی اور حل سوچنے سے قاصر ہے۔ اب تمام دارومدار تمہاری صلاحیت پر ہے۔ اگر تم یہ کام نہ کر سکے تو ہمیں مجبوراً زیورات واپس کرنا پڑیں گے۔"

"پریشان مت ہو۔ ان بزرگ کی دعا سے پتھر میرے ہاتھوں میں آ کر موم ہو جاتا ہے۔" حسن نے جواب دیا۔

"تمہاری تجویز کا انجام کیا ہو گا اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک مجسموں کا تعلق ہے وہ تمہیں مقررہ وقت پر مل جائیں گے۔"

زیاد واپس چلا گیا۔ دو گھنٹے کا وقت اس نے اپنے خیمے میں رشید کے ساتھ کس اضطراب اور بے چینی کے ساتھ گزارا، اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے ذہن میں حسن کی کاریگری اور معجزانہ صلاحیت کے بارے میں کوئی شبہ تھا تو وہ دو گھنٹے بعد نوطی دیوی اور یامین کے مجسمے دیکھنے کے بعد دور ہو گیا۔ دونوں مجسمے اتنی فنکاری کے ساتھ بنائے گئے تھے کہ ایک مرتبہ تو اسے یہی خیال ہوا کہ حسن نے مندر سے دیوی کا مجسمہ نکال کر باہر رکھ دیا ہے۔ اسی طرح یامین کا بُت دیکھ کر رشید یوں جھک کر پیچھے ہٹا جیسے اس نے سچ مچ یامین کو اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ لیا ہو۔

"یار تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔" زیاد نے حسن کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا..... "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کسی نے وہ زیورات اسی لئے مندر میں رکھے تھے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں۔"

زیورات کے تذکرے پر رشید نے چونک کر زیاد کی طرف دیکھا۔ اسے زیاد نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ حسن کو بھی اس راز میں شریک کر چکا ہے۔

"گھبراؤ نہیں۔" زیاد اس کی پریشانی کو دیکھ کر بولا "حسن میرا انتہائی قابل اعتماد دوست ہے اور اس نے اس وقت جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو تیسرے حصہ کا حق دار ثابت کر چکا ہے۔"

وہ حسن کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"بہت خوب۔" پھر تم اسی خاموشی سے چپ چاپ رخصت ہو جاؤ۔" زیاد نے کہا۔

"قاہرہ میں ہمارا انتظار کرنا۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک ہفتے یا ایک عشرے سے زیادہ دن نہیں لگیں گے۔"

عجیب بات تھی کہ حسن نے اس مرتبہ بھی کوئی کلمۂ اعتراض منہ سے نہیں نکالا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے زیاد اور رشید کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں شوخی کی چمک تھی۔ کسی ایسے شریر بچے کی طرح جو اپنی شرارت پر دل ہی دل میں ہنس رہا

ہو۔ دوسرے لمحہ وہ تیزی سے گھوما اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے تاریکی میں غائب ہو گیا لیکن زیاد نے اپنی مسرت میں نہ اس کے عجیب سکوت پر غور کیا اور نہ ہی اس کی اس شوخ چمک پر۔ اسے تو یہ خیال بھی نہ آیا کہ جب حسن کو کسی نے آتے نہیں دیکھا تھا یا وہ کسی سے نہیں ملا تھا تو اسے زیاد کے خیمے کا علم کس طرح ہوا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" زیاد نے کہا "ذرا سہارا دو۔ ہمیں ان مجسموں کو اٹھا کر مندر میں لے جانا ہے۔"

"تم نے اس کی آنکھوں پر غور کیا؟" رشید نے پوچھا۔

"کس کی آنکھوں پر۔ دیوی کی یا یامین کی؟"

"میں حسن کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں اس کی آنکھوں کو کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہماری کسی حماقت پر ہنس رہا ہو یا پھر اس نے ہمارے ساتھ کوئی شرارت کی ہو اور اس کی کامیابی پر اپنی خوشی دبانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔" رشید نے جواب دیا۔

"تمہارے وہم کا بھی کوئی جواب نہیں۔" زیاد ہنسا "وہ لاکھوں پونڈ کے قیمتی خزانے میں تیسرا حصہ پانے پر خوش ہو رہا ہے اور تم نہ جانے اس سے کیا کیا مطلب نکال رہے ہو۔ بہرحال جلدی کرو، دو بج رہے ہیں۔ مجسمے اندر پہنچا کر ہمیں کچھ دیر سونا ہے۔"

"مگر مندر میں مجسمے چھپانے کی جگہ کہاں ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"دیوی کا مجسمہ تو اصل مجسمہ کی جگہ چبوترے پر رکھ دیں گے اور....."

"اور اصل مجسمہ کہاں جائے گا؟"

"پہاڑیوں کی دوسری جانب گہرے کھڈ میں۔" زیاد نے جواب دیا۔ "رہے ہمارے دوست یامین تو وہ کل شام تک ان 23 مجسموں کے درمیان آرام کریں گے جو مندر کے دالان میں رکھے ہیں۔"

"جگہ تو خوب سوچی ہے۔" رشید نے تعریف کی "واقعی جہاں پہلے ہی اتنے مجسمے رکھے ہیں وہاں ایک اور کی گنجائش بڑی آسانی سے نکل سکتی ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا مگر دیوی کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ اگر اس کے ٹکڑے جڑ سکتے ہیں تو وہ کھنڈ سے دوبارہ واپس بھی آ سکتی ہے۔"

"مجھے اس کی امید نہیں۔" زیاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا..... "بہرحال دیکھیں گے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو کسی دوسری ترکیب پر غور کروں گا۔"

مجسمے پتھر کے ہونے کے باوجود زیادہ بھاری نہیں تھے۔ رشید اور زیاد پہلے دیوی کا بت اُٹھا کر مندر میں لے گئے۔ اسے چبوترے کے سامنے فرش پر رکھ دیا اور یامین کا بُت لانے کے لئے واپس لوٹے مگر جیسے ہی انہوں نے پیٹھ موڑی ایک اور عجیب بات ہوئی..... حسن جو ان کی آنکھوں کے سامنے صحرا میں غائب ہو چکا تھا..... دالان کے ایک پلر کی آڑ سے نکلا۔ چبوترے کے قریب آیا۔ مندر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ زیاد اور رشید باہر جا چکے تھے۔ اس نے بڑے اطمینان سے نوطی دیوی کا مجسمہ چبوترے سے اٹھا کر فرش پر رکھ دیا اور اپنا بنایا ہوا نقلی مجسمہ اٹھا کر دیوی کے بت کی جگہ چبوترے پر ایستادہ کر دیا..... دوبارہ دروازے پر نظر ڈالی اور سبک قدموں سے کوٹھڑی کی جانب چل دیا۔ جب تک زیاد اور رشید..... یامین کا بُت اٹھا کر اندر آئے وہ کوٹھڑی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

یامین کا مجسمہ دالان میں رکھے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

23 مجسموں میں شامل کر کے انہوں نے چبوترے سے نوطی دیوی کا بُت اٹھا کر اس کی جگہ دوسرا مجسمہ رکھ دیا اور دیوی کا بُت مندر سے باہر لے آئے۔ زیادکیمپ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کھول لایا۔ مجسمہ اس پر لادا اور پہاڑی کی طرف لے چلا۔

''میرا ایک مشورہ مانو گے؟'' رشید نے کہا۔

''کیا؟''

''میرا خیال ہے کہ پہاڑی کے دوسری طرف کھڈ اتنا گہرا نہیں کہ اگر دن میں کوئی اس طرف سے گزرے تو اسے مجسمہ نظر نہ آئے۔'' رشید نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ تم اسے میرا وہم کہہ لو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے دیوی کو اس طرح کھڈ میں پھینکا تو وہ ضرور واپس آ جائے گی۔ اس لئے اگر کھڈ میں گرانے کی بجائے ہم اسے کسی غار میں رکھ کر پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''اگرچہ اس مزید محنت سے فائدہ نہیں ہے لیکن تمہارے اطمینان کے لئے ہم یہ بھی کر لیں گے۔'' زیاد نے کہا۔

اور پھر ایسا ہی کیا گیا۔ پہاڑی کے عقبی حصہ میں ایک چھوٹا سا غار تلاش کر کے دیوی کا مجسمہ اس کے اندر رکھ دیا گیا۔ آس پاس سے بڑے پتھر چن کر غار کا منہ بھی بند کر دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر دونوں واپس لوٹے۔ اونٹ کو باندھ کر وہ اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے کہ زیاد کو اس مشعل کا خیال آیا جسے وہ جلتی حالت میں مندر میں چھوڑ آیا تھا۔

''غنیمت ہے کہ تمہیں یاد آ گیا۔'' رشید بولا ''ورنہ صبح کو یامین کی نظر پڑ جاتی تو وہ ضرور چوکنا ہو جاتا۔''

''محض مشعل کی موجودگی سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔'' زیاد نے جواب دیا ''لیکن میں کل شام ہونے والے ڈرامے کو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک رکھنا چاہتا ہوں اس لئے مشعل لے آنا ہی مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں اپنی آمد کا کوئی سراغ چھوڑ آئے ہوں چنانچہ دوبارہ جا کر دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

وہ مندر میں داخل ہوئے۔ مشعل اسی پتھر پر بدستور جل رہی تھی جہاں زیاد نے اسے رکھا تھا۔ رشید نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو زیاد دیوی کے مجسمے کو پکڑے کھڑا تھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے جلدی میں مجسمہ غلط رُخ پر رکھ دیا ہے۔'' زیاد نے جواب دیا۔

''اس کو ٹھیک کر رہا تھا۔''

''غلط رُخ سے کیا مطلب؟''

''بھئی دیوی کا رُخ دروازے کی طرف تھا نا!''

''ہاں۔''

''لیکن ابھی میں نے دیکھا کہ ہم نے اس کا منہ کوٹھڑی کی طرف کر دیا تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' رشید چونکا..... ''مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے اسے رکھا تھا تو منہ دروازے کی جانب ہی تھا۔''

''تو کیا مجسمہ خود ہی کوٹھڑی کی سمت گھوم گیا تھا؟'' زیاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''خدا بہتر جانتا ہے۔'' رشید نے جواب دیا ''مگر ہمیں کوٹھڑی میں بھی دیکھ لینا چاہیے۔''

وہ زیاد کے جواب کا انتظار کئے بغیر کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک دم سے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے مشعل والا ہاتھ اٹھا کر اس کی تھرتھراتی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور فوراً ہی بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ کوٹھڑی دوبارہ پجاری کے

ڈھانچے سے آباد ہو چکی تھی۔

رشید کا دل مطمئن نہیں تھا مگر بظاہر اس نے زیاد کی تردید نہیں کی کہ ڈھانچہ شروع سے آخر تک کوٹھڑی میں ہی موجود رہا ہوگا..... مگر پہلی مرتبہ وہ دونوں نوطی دیوی کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے دوبارہ درست ہو جانے کے عجیب واقعہ پر ذہنی طور پر اتنے متاثر تھے کہ اسے سامنے ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکے۔ جسے دوسرے الفاظ میں نفسیاتی فریب نظر بھی کہا جا سکتا ہے..... اس مختصر سی گفتگو کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔

دوسرے دن کام تقریباً بند رہا۔ یامین، رشید، زیاد..... تینوں ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ رشید اور زیاد تو اس لئے کہ انہوں نے گزشتہ رات ہی طے کر لیا تھا کہ وہ مصلحتاً ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور یامین اس لئے کہ اس کی دانست میں زیورات رشید نے چرائے تھے اور اسے ایک دوست کی حیثیت سے رشید کی اس حرکت پر اتنا افسوس تھا کہ وہ آئندہ کے لئے اس سے تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ دیوی کے فیصلے کی داستان سچی ہو یا نہ ہو وہ کل صبح ہی کیمپ چھوڑ دے گا اور مصری پولیس اور محکمہ آثار قدیمہ سے اس واقعے کی رپورٹ کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلا جائے گا..... پروفیسر عثمان البتہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ پتھر کی ان سلوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو دیوی کے مجسمے کے قریب پائی گئی تھیں اور جن کی تحریر بدخطی کی وجہ سے کہیں کہیں ناقابل فہم ہو گئی تھی۔

نوطی دیوی کے پجاری نے انصاف حاصل کرنے کا جو طریقہ سلوں پر تحریر کیا تھا اس کے مطابق غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے مندر میں پچیس شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ عود، عنبر، لوبان یا جو خوشبو بھی میسر ہو اس سے سلگایا جاتا۔ پھر تمام مشتبہ افراد غسل کر کے کمر سے اوپر تک برہنہ ہو کر ننگے پاؤں مندر میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک کچھ مخصوص الفاظ ادا کرتا اور پھر وہ سب دوزانو ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے دیوی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ پجاری کا دعویٰ تھا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص چور ہوگا تو غروب آفتاب سے قبل ہی ضرور بالضرور پتھر کا بن جائے گا اور یہی اس کی سزا ہو گی۔ اس کارروائی کے دوران مشتبہ افراد کے سوا کسی کو مندر میں موجود رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ عام لوگ یا مشتبہ افراد کے عزیز و اقارب، دوست احباب غروب آفتاب کے بعد اندر جا کر دیوی کے فیصلے سے مطلع ہو سکتے تھے۔

پروفیسر عثمان نے رسومات شروع ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سب کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے کار..... آخر کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ مندر میں پچیس شمعیں جلائی گئیں۔ لوبان اور عطریات سلگائے گئے۔ یامین، رشید اور زیاد نے غسل کیا اور صرف پتلونیں پہنے ہوئے مندر میں داخل ہوئے۔ اس تقریب کا علم چار افراد کے سوا کسی کو نہ تھا۔ چنانچہ مندر کے دروازے پر پروفیسر عثمان کے سوا کوئی ان کا انتظار کرنے والا نہیں تھا اور وہ بھی یہ سوچ کر غروب آفتاب سے پہلے وہ مندر میں داخل نہیں ہو سکتے، اپنے خیمے میں جا کر سلوں کی تحریر پڑھنے میں مصروف ہو گئے جو اب کافی حد تک ان کی سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

یامین، رشید اور زیاد ایک دوسرے سے بات کئے بغیر مندر میں داخل ہو کر نوطی دیوی کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عثمان صاحب نے اس موقع پر کہے جانے والے مخصوص الفاظ کا ترجمہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا تھا جو ایک کاغذ پر نوٹ کیا ہوا یامین کے پاس تھا۔ وہ سب سے آگے کھڑا تھا..... گھوم کر رشید اور زیاد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے پتلون کی جیب سے وہ کاغذ نکالا..... رشید اور زیاد نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''اے نوطی دیوی!'' یامین نے عبارت پڑھنا شروع کی ''ہم تیرے سامنے اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ تُو ہمارا.....''

ابھی یامین یہیں تک پہنچا تھا کہ زیاد نے پتلون کی جیب میں چھپائی ہوئی لوہے کی سلاخ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے پوری طاقت سے اس کے سر پر دے ماری۔ یامین کوئی آواز نکالے بغیر ہی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ زیاد دوسرا وار کرنا چاہتا تھا مگر رشید نے روک دیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا..... ''مندر کے فرش پر اس کے خون کی ایک بوند بھی گری تو ہمیں جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ اس کے پاؤں، منہ باندھ کر کوٹھڑی میں ڈال دو۔ پوری طرح ٹھکانے لگانے کا کام رات میں مناسب رہے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' زیاد نے سلاخ جیب میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

''لاؤ رسی نکالو۔''

رشید نے ریشم کی باریک ڈوری نکال کر زیاد کو دی اور زیاد نے اپنا رومال یامین کے منہ میں ٹھونستے ہوئے پوری بے رحمی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور پھر دونوں اسے اٹھا کر کوٹھڑی میں ڈال آئے۔ رشید نے پجاری کے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور نامعلوم کیوں اس کے منہ سے اطمینان کی گہری سانس نکل گئی۔ اس کے بعد انہوں نے 23 مجسموں میں سے یامین کا بُت اٹھا کر دیوی کے سامنے رکھ دیا۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں یامین کھڑا تھا۔

''ابھی ہمیں کم از کم چالیس منٹ تک یہاں رہنا پڑے گا۔'' زیاد اپنی ریسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا..... ''بہرحال ہمارے منصوبے کا معمہ کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ پروفیسر عثمان یامین کے بُت کو دیکھ کر کیا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، بیسویں صدی کی دنیا کے لئے ایک انسان کے پتھر بن جانے کی داستان دنوں اور ہفتوں تک اخبارات کا موضوع بنی رہے گی۔ کوئی اس حیرت انگیز کہانی پر یقین کرے نہ کرے مگر یہ طے ہے کہ اس ہنگامے میں کسی کو بھول کر بھی کسی جرم کی بُو محسوس نہیں ہو گی۔''

''بشرطیکہ ہم یامین کی لاش اس طرح ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جائیں کہ کبھی اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔'' رشید نے جواب دیا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس وسیع صحرا میں آبادی سے میلوں دُور.....''

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی نظریں نوطی دیوی کے مجسمے کے قریب چبوترے سے نیچے گرے ہوئے ایک کاغذ پر جمی تھیں۔ اپنا فقرہ نامکمل چھوڑتے ہوئے زیاد نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو یامین کے ہاتھ میں تھا اور جب اس پر وار کیا گیا تو چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ لکھی ہوئی مخصوص عبارت پر ایک نگاہ ڈالتے ہی زیاد کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھری۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا'' وہ مضحکہ اُڑانے والے لہجے میں بولا..... ''ابھی ہم نے انصاف کی ساری رسمیں پوری نہیں کیں۔''

اس نے شوخ نظروں سے نوطی دیوی کے بُت کی طرف دیکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اے نئے زمانے میں تراشی ہوئی قدیم دیوی! تیرے احترام کا تقاضا ہے کہ ہم یہ آخری رسوم بھی ادا کریں۔"..... اور یہ کہتے ہوئے زیاد نے کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا شروع کردی۔

"اے نوطی دیوی ہم تیرے سامنے اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ تُو ہمارا انصاف کرے۔ ہم میں سے جو چور ہے وہ اپنی سزا کو پہنچے اور اس طرح تیری یہ قربانیاں دیوی آئی سس کے عذاب کو ٹھنڈا کردیں۔"

آخری الفاظ ابھی زیاد کے منہ سے ادا ہی ہوئے تھے کہ دیوی کا مجسمہ حرکت میں آیا۔ حسین و متناسب جسم پر لگا ہوا خوفناک چہرہ آہستہ آہستہ زیاد اور رشید کی جانب جھک گیا۔ باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں دو قندیلوں کی طرح روشن ہوئیں اور پھر ان میں سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والی شعاعیں بجلی کی طرح کوند کر ان دونوں پر پڑیں۔ زیاد پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ رشید نے گھبرا کر بھاگنے کا ارادہ کیا مگر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے ہوں۔ اس کا منہ شاید چیخنے کے لئے کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے دیوی کے سامنے ایک نہیں تین مجسمے رکھے تھے۔

غروب آفتاب کے فوراً بعد پروفیسر عثمان نے مندر میں قدم رکھا تو یامین، رشید اور زیاد کے بجائے پتھر کے تین بُت دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک لمحے کے شدید تاثر کے بعد پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا کہ شاید تینوں ہی زیورات کی چوری میں ملوث تھے لیکن فوراً ہی ان کے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ چونک اٹھا۔ آواز کوٹھڑی کی جانب سے آرہی تھی۔ وہ اس طرف لپکا۔

بندھے ہوئے یامین کو دیکھ کر اس کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا اور اب آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ عثمان نے جلدی سے اس کے منہ سے رومال نکالا، ہاتھ پیر کھولے۔ عجیب بات یہ تھی کہ انہیں کوٹھڑی میں پجاری کا ڈھانچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے یامین؟" انہوں نے پوچھا "تم یہاں پڑے ہو تو وہ پتھر کا بُت کس کا ہے؟"

یامین نے اپنے سر کو ٹٹول کر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بڑے اور گھنے بالوں نے سر کی ہڈی کو سلاخ کی ضرب سے زیادہ نقصان نہیں پہنچنے دیا تھا۔ پھر بھی سر کے پچھلے حصے میں ایک گومڑ سا ابھر آیا تھا اور درد کی تیز لہریں سر سے اُٹھ کر پورے جسم میں اُترتی محسوس ہورہی تھیں۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

"میں کیا جواب دوں عثمان صاحب" یامین کمزور آواز میں بولا "مجھے خود نہیں معلوم کہ آپ کس بُت کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں دیوی کے سامنے کھڑا ہوا وہ مخصوص عبارت پڑھ رہا تھا کہ زیاد یا رشید نے کوئی چیز بڑے زور سے میرے سر پر دے ماری جس کے بعد میں بیہوش ہوگیا۔ پھر مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ ہوش آیا تو اس کوٹھڑی میں پڑا تھا۔"

عثمان صاحب نے اسے دیوی کے سامنے رکھے ہوئے مجسموں کے بارے میں بتایا پھر سہارا دیتے ہوئے کوٹھڑی سے باہر لائے۔ ابھی وہ دالان تک ہی پہنچے تھے کہ ایک عجیب منظر نے ان کے قدم روک دیئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور قوی ہیکل شخص قدیم مصری سرداروں کا لباس پہنے نوطی دیوی کے سامنے آنکھیں بند کئے

کھڑا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں پھیلے ہوئے ہیں۔

"خدائے نور..... تیرے فرمان کے مطابق پچیس چوروں کی قربانی پیش کی جا چکی ہے کیا تو اب بھی نوطی کے گناہ معاف کر کے اس کا حسن و جمال واپس نہیں کرے گا؟"

الفاظ اس کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ عثمان اور یامین کی حیران نظروں نے دیکھا کہ اب چبوترے پر دیوی کے مجسمہ کی جگہ ایک انتہائی حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی مسکرا رہی ہے۔ پھر وہ اپنی مرمریں بانہیں کھولے نیچے اُتری۔ اس نوجوان کا ہاتھ پکڑا اور دونوں آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

یامین نے چونک کر عثمان صاحب کی طرف دیکھا اور پھر اس چبوترے کی جانب جو اب خالی ہو چکا تھا مگر ایک اور بات جو اس نے نہیں عثمان صاحب نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ دیوی کا مجسمہ ہی نہیں بلکہ فرش پر رکھا ہوا یامین کا بُت بھی غائب ہو چکا تھا۔

"یہ کون لوگ تھے عثمان صاحب؟" آخر یامین سے رہا نہ گیا "اور دیوی کا مجسمہ کہاں غائب ہو گیا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں اب پوری داستان سمجھنے لگا ہوں۔" عثمان صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج میں پتھر کی ان سلوں کو پڑھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"داستان سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" یامین نے حیرت سے پوچھا۔

"اب سے ہزاروں سال پہلے جب مصر میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی تو منجملہ دوسرے دیوتاؤں کے مصری خدائے نور اور اوسیریز دیوی آئی سس کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔ آئی سس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اوسیریز کی بیوی بھی تھی۔ اس زمانے میں دیوی آئی سس کے مندر کی ایک پجارن جس کا نام نوطی تھا..... نوطی بے حد حسین تھی، اتنی حسین کہ اس کی خوبصورتی کا چرچا مندر کی چار دیواری سے نکل کر شہر میں گونجنے لگا۔ ایک مصری سردار کے بیٹے ہرماس نے اس کے حسن کی تعریف سنی تو مندر میں آیا اور پہلی نظر میں ہی نوطی کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ نوطی بھی اس سے متاثر ہوگئی۔ پھر ایک رات جبکہ ہرماس نے اس سے مندر کے باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا..... نوطی نے اپنے آپ کو اپنے محبوب کی نظروں میں اور زیادہ پسندیدہ بنانے کے لئے ایک ایسی حرکت کی جو اس کے لئے ایک مسلسل عذاب بن گئی۔ دیوی آئی سس کا مجسمہ..... اپنے عبادت گزاروں کے نذر کئے گئے زیورات سے مزین رہتا تھا..... نوطی نے ہرماس کو لبھانے کے لئے اس رات وہ زیور خود پہن لئے اور آئی سس کے عذاب میں آگئی..... دیوی آئی سس نے اسے پتھر کا بنا دیا اور اس کے حسین خدوخال کو ایک خوفناک بلا کے چہرے میں تبدیل کردیا۔

آئی سس پہلے ہی نوطی کے حسن سے جلتی تھی اور اس نے اس واقعہ کو بہانہ بناتے ہوئے اپنے دل کا غبار نکالا تھا۔ بہرحال نوطی کے پتھر بن جانے سے ہرماس کی دنیا تاریک ہوگئی۔ اس نے اپنی محبوبہ کا گناہ معاف کرانے کے لئے پہلے آئی سس کی پوجا کی لیکن جب وہ نہ پسیجی تو اوسیریز کے مندر میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ اتنی پوجا اور آہ و زاری کی کہ آخرکار اوسیریز کو اس پر رحم آ ہی گیا لیکن معاملہ آئی سس کا تھا۔ اوسیریز اپنی بیوی کی ناراضگی مول لے کر نوطی کو اس کا حسن و جمال واپس نہیں کرسکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ پھر بھی اس نے آئی سس پر زور دیا کہ وہ نوٹی کا گناہ معاف کر دے۔ بہت کہنے سننے سے آئی سس اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ اگر نوٹی اس کے مندر سے چلی جائے اور اپنی عمر کے ہر سال کے لئے ایک چور کی قربانی پیش کرے تو وہ اصلی حالت میں واپس آجائے گی۔ ہرماس نے پھر التجا کی کہ نوٹی تو پتھر کی بنی ہوئی ہے وہ قربانی کس طرح پیش کر سکتی ہے۔ اس پر آئی سس نے ہرماس کو اس کی جانب سے قربانی دینے کا اختیار دے دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر چور نوٹی کے بُت کے سامنے لائے جائیں گے تو وہ خود بخود پتھر کے ہو جائیں گے اور اس کو نوٹی کی جانب سے قربانی سمجھا جائے گا۔ چوروں کی قربانی غالباً اس لئے رکھی گئی تھی کہ خود نوٹی چوری کے جرم میں ہی پتھر بنی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہرماس کے لئے چوروں کو تلاش کرنا اور انہیں نوٹی کے مجسمے کے سامنے لانا آسان بات نہیں تھی چنانچہ اس کے لئے اس نے ایک بہترین ترکیب سوچی..... اس نے یہ مندر تعمیر کیا اور آس پاس کی آبادیوں میں پتھر کی ان سلوں کے ذریعے اعلان کر دیا کہ یہ مندر نوٹی دیوی کا ہے جو چوری کے مجرموں کو سزا دیتی ہے۔ اس کی یہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی اور چند برس کے اندر ہی وہ 23 چوروں کی قربانی دینے میں کامیاب ہوگیا لیکن اس سے قبل کہ دو مزید چوروں کی قربانی دے کر ہرماس نوٹی کو اس کی خوبصورتی واپس دلا سکتا، ایک خوفناک زلزلہ آ گیا اور پوری بستی زمین میں دھنس گئی۔ ہرماس بھی مندر کے اندر قید ہو کر رہ گیا۔ بدقسمتی سے مندر کا دروازہ ایک بھاری چٹان نے بند کر دیا تھا۔ ہرماس کوشش کے باوجود اس چٹان کو نہ ہٹا سکا۔ بھوک پیاس اور دم گھٹنے سے اس کی موت واقع ہوگئی مگر مرنے سے پہلے اس نے یہ تمام واقعہ پتھر کی ان سلوں پر لکھ دیا جو اس کے ڈھانچے کے قریب پڑی ہوئی ملی تھیں..... میرا خیال ہے کہ مرتبان میں جو زیورات ملے تھے وہ وہی تھے جنہیں نوٹی نے آئی سس کے مندر سے چرایا تھا۔"

عثمان صاحب رُکے اور کچھ سوچتے ہوئے بولے..... "اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نوٹی کو بارگناہ سے آزاد کرانے کے لئے ہرماس کا عزم اتنا پختہ تھا کہ ہزاروں سال بعد جب قدرت نے دوبارہ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کا موقع دیا تو ہرماس کی روح نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ زیورات یقیناً زیاد اور رشید نے ہی چرائے تھے اور جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں..... مگر مجھے حیرت ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارا مجسمہ بھی یہاں رکھے دیکھا تھا اس کا راز کیا تھا اور اب وہ کہاں غائب ہوگیا۔ مزید یہ کہ زیاد اور رشید نے زیورات چرائے تھے تو کہاں رکھے تھے جبکہ میں خفیہ طور پر ان کے سامان کی تلاشی لے چکا ہوں اور مجھے وہ کہیں نہیں ملے۔"

"تو کیا آپ کو پہلے ہی ان پر شبہ تھا؟" یامین نے پوچھا۔

"ایمانداری کی بات ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے مجرم سمجھوں اور کسے بے گناہ۔ میں نے ان دونوں کے ساتھ تمہاری چیزوں کی بھی تلاشی لی تھی۔" عثمان صاحب نے حقیقت بیان کی۔

لیکن اگر عثمان صاحب کو..... اس پوشیدہ جگہ کا علم ہوتا جہاں زیاد نے وہ قیمتی خزانہ چھپایا تھا تب بھی وہ اب انہیں وہاں نہیں پا سکتے تھے۔ نوٹی کے مجسمے اور ہرماس کے ڈھانچے کے ساتھ ہی دیوی آئی سس کے زیورات بھی ہمیشہ کے لئے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔